"پیر پگارا خاندان کی دینی خدمات"

(تحقیقی جائزہ)

(برائے پی ایچ ڈی)

نگراں

محترم پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں

ایم اے، ایل ایل بی، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ

سابق صدر شعبۂ اردو، سندھ یونی ورسٹی

مقالہ نگار

خدیجہ میمن

۲۰۰۳ء

سندھ یونی ورسٹی جامشورو


بسم الله الرحمن الرحيم

فہرست

باب اوّل

باب دوّم

باب سوّم

باب چہارم

Streategy g The Reseech - Page No 1

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

مقدمہ

یہ بات تو واضح ہے کہ برِصغیر میں اسلام کی تشہیر و تبلیغ صوفیاء اکرام اور علماء اکرام کی محنتوں کا ثمر ہے، انھوں نے اس عمل کو ایک جہاد سمجھ کر ادا کیا۔ یوں تو دنیا بھر میں ان علماء اکرام نے اسلام کی تبلیغ کی خاطر ہجرت اختیار کی، دور دراز علاقے آباد کیے اور یہ فریضہ ادا کیا، لیکن بالخصوص برِصغیر میں صوفیاء اکرام اور بزرگانِ دین کی خدمات و توجہات مثالی ہیں۔

ان کے مزارات، خانقاہیں اور مدارس آج بھی راہ نمائی اور رہبری کے لیے ایک تاریخی حیثیت رکھتے ہیں اور ان گنت لوگوں میں دینی رجحانات، اسلامی نظریات اور قرآنِ فکر کو اجاگر کرتے ہوئے ایک طرف تو ان لوگوں کی اخلاقی قدروں کو بلند کیا اور دوسری طرف دینی خدمات کا فریضہ انجام دیا۔ یہ بزرگ اور سلسلے ایک مکتبۂ فکر کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں اور ان سے وابستہ لوگ اس فکر کو پروان چڑھانے اور فروغ دینے میں معاون و مددگار ثابت ہوئے ہیں۔

ایسے ہی مکتبۂ فکر میں سے ایک ''پگارا خاندان'' بھی ہے جس کے جدامجد حضرت شاہ علی مکی لکیاریؒ وہ پہلے بزرگ ہیں جو یہاں آباد ہوئے اور اس خاندان کو فروغ حاصل ہوا، ان کی اولاد میں شاہ صدرالدینؒ (گیارہویں صدی ہجری میں) تھے، ان کا مقبرہ، ۱۱۵۵ھ مطابق ۱۷۴۲ء میں تعمیر ہوا جیسا کہ قطعۂ تاریخ میں ہے۔ آپ کے نواسوں میں سید محمد شجاع نقشبندیؒ تھے، ان کی نرینہ اولاد میں سید محمد بقاؒ (بن محمد امامؒ، بن فتح محمدؒ) رسول پور (ضلع خیر پور) میں ۱۱۳۵ھ / ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے

آپ کو ظالموں نے ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۸۴ء میں شہید کر دیا، خیر پور میں تدفین ہوئی انھوں نے نقشبندیہ سلسلے کے علاوہ چشتیہ اور قادریہ سلسلوں سے بھی فیض حاصل کیا اور روحانی تعلیم میں اپنے مرشدین سے فارغ التحصیل قرار پائے، جس کے بعد انھوں نے عوام الناس کے قلوب واذہان کو منور کرنے، تصوف کی تعلیم عام کرنے، دینی رجحانات کو پروان چڑھانے کا کام کیا اور یہ کام انھوں نے اپنے گھر سے شروع کیا، ان کے بیٹوں میں سید محمد راشدؒ کا نام قابلِ ذکر ہے یہ ۱۷۵۶ء مطابق ۱۱۷۰ھ میں پیدا ہوئے انھوں نے حضرت شاہ فقیر اللہ علویؒ (م، ۱۱۹۵ھ/ ۱۱۸۱ء) نیز مخدوم احمدیؒ (م، ۱۲۰۳ھ/ ۱۷۸۹ء) سے تعلیم حاصل کی، سید محمد راشدؒ اپنے وقت کے جید عالم، باعمل پیر، مبلغ، شریعت وطریقت کا تتبع کرنے والے، تصوف کی تعلیم پر دسترس رکھنے والے اور شستہ ذوقِ سخن رکھنے والے بزرگ تھے۔ انھوں نے اپنے مکتوبات وملفوظات سے مریدین کے علاوہ معتقدین اور متاثرین کی رجحان سازی اور کردار سازی کا کام انجام دیا۔

ان کی اولاد میں پیر صبغت اللہ شاہؒ پگارا (اوّل) (م، ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) تھے، یہ اس خاندان کے پہلے پیر تھے، جو ''پگارا'' کہلائے تھے، انھوں نے حر جماعت قائم کی جس نے سید احمد شہیدؒ (م، ۱۲۴۶ھ/ ۱۸۳۱ء) کی بڑی مدد کی اس جماعت نے انگریزوں کے خلاف بھی منظم جہاد کیا اور سکھوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کیا۔ بلکہ یہ تنظیم بجائے خود ایک تاریخی اہمیت کی حامل ہے جس کا کردار قیامِ پاکستان میں بھی نمایاں ہے۔ سید محمد راشدؒ سے ایک سلسلہ ''راشدی'' بھی چلتا ہے، جس نے سندھ میں بڑے عالم و فاضل شخصیات کو متعارف کیا ہے۔ پیر صبغت اللہ شاہؒ (م، ۱۲۴۶ھ) کے جانشیں سید علی گوہرؒ (م، ۱۲۶۳ھ/ ۱۸۴۷ء) تھے۔ انھوں نے بھی دینی خدمات میں نمایاں قردار ادا کیا۔

اس پورے سلسلے کی دینی اور علمی خدمات کو اس مقالے میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اس ضمن میں یہ کوشش بھی کی گئی ہے کہ مقالے میں تحقیق سے صحیح کوائف اور معلومات کو ضبطِ تحریر میں لایا جائے، کیوں کہ اس خاندان سے متعلق متاثرین، مصنفین نے بعض حکایات زیبِ داستاں

کے لیے بھی لکھ دیں ہیں۔ ان کی صحیح تحقیق کے لیے قدیم کتابیں ہی راہنما ثابت ہوسکتی تھیں۔ جدید دور کی تالیفات وتصنیفات میں تبسم چودھری کا تذکرہ ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' قابلِ ذکر ہے، جو ایک متوازن کتاب ہے۔

اس موضوع پر میں نے برسوں پہلے کام شروع کیا تھا، لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا اس موضوع کا حق قدیم کتابوں اور قلمی مخطوطات کے مطالعے سے ادا ہوسکتا تھا، چناں چہ مطلوبہ کتابوں کے حصول میں متعدد مرتبہ اندرونِ سندھ سفر اختیار کیا، مختلف کتب خانوں میں ان کتابوں کو تلاش کیا مگر اس سلسلے کے اسلاف سے متعلق مکمل معلومات اور مصدقہ مطبوعات کو حاصل کرنے میں اس لیے ناکامی رہی کہ متعدد محققین اس موضوع پر یا تو خاموش ہیں یا پھر وہی مختصر معلومات فراہم کرتے ہیں جو سینہ بہ سینہ چلی آرہی ہیں، یا پھر زیبِ داستاں کے لیے جنوں نے قصہ دراز کیا ہوا ہے۔

پھر کچھ میری ذاتی ونجی مصروفیات ومعمولات کو دخل رہا کہ اس موضوع پر کام ''ٹوٹ ٹوٹ جاتا ہے سلسلہ تکلم کا'' کے مصداق کام میں تسلسل نہ رہا لیکن میں ہمت نہ ہاری اور اس تمام سفر میں مجھے متحرک رکھنے والے، میرے حوصلے بڑھانے والے، میرے مشفق ومحترم قابلِ صد احترام قبلہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہٗ العالی ہیں، جنھوں نے مجھے کتابیں بھی فراہم کیں، مشورے بھی دیے، ہر طرح سے میری حوصلہ افزائی وہمت افزائی فرماتے ہوئے مجھے اس کام کو مکمل کرنے پر مسلسل آمادہ کیے رکھا۔

اس مقالے کو چار ابواب میں منقسم کیا گیا ہے، پہلے باب میں سرزمینِ سندھ کا مختصر تعارف بیان کرنا اس لیے ضروری تھا کہ اس خطے کی علمی ودینی حیثیت کو اجاگر کیا جائے۔ جس میں مسلمانوں کی سندھ میں آمد کے ابتدائی دور سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اور یہاں کے بزرگوں کا ضمنی تذکرہ کیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں پگارا خاندان کے علاقۂ خاص ''پیر جو گوٹھ'' کا مختصر تعارف، پیر پگارا کی وجہ تسمیہ، حروں کی خدمات اور ان کا پس منظر بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے ساتھ ہی مختصراً انداز میں پگارا خاندان کا شجرۂ نسب مرتب کیا گیا ہے۔ باب سوم میں تصوف کے نظریات اور پگارا خاندان کی

تصوف سے نسبت کو پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس کے علاوہ سلسلۂ قادریہ، نقشبندیہ میں اس خاندان کے بزرگوں کا شجرہ بھی ظاہر کیا گیا ہے۔ باب آخری یعنی چہارم میں جدِ امجد کی سندھ میں آمد اور پھر ان کی اولاد کا مکمل تذکرہ و خدمات کو ضبطِ تحریر و تحقیق میں لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ آخر میں ایک ضمیمہ بھی شامل کیا گیا ہے جو پیر محمد راشدیؒ ہی سے چلنے والا سلسلہ ''راشدی'' سے متعلق صاحبانِ علم کی خدمات کو پیش کرتا ہے۔

میرے مقالے کے پہلے نگراں پروفیسر ڈاکٹر ابوالفتح صغیر صدیقیؒ (م،۱۹۹۶ء) تھے، (۱) جنھوں نے بڑی شفقت سے تحقیق کے رموز و اسرار سمجھائے لیکن رضائے الٰہی سے جب وہ یکم جون ۱۹۹۶ء کو انتقال فرما گئے تو میں نے یہ کام اُسی دن لپیٹ کر رکھ دیا کہ اب راہ میں شجرِ سایہ دار ہی نہیں تو سفر کا ارادہ ترک کر دینا ہی بہتر ہے، لیکن حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے مجھے پھر اس دفترِ پریشاں کو منظم کرنے کی تحریک دلائی اور اپنی نگرانی میں مقالہ مکمل کرانے کا وعدہ فرمایا تو خیال آیا:

''سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے''

اس لیے اگر آپ میرے اس کام میں کوئی حرفِ دادو تحسین پائیں تو اس کے مستحق میرے مقالے کے نگراں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ہیں اور جہاں حرفِ تشنہ دیکھیں تو اُس پر تنقید کے لیے میرا دامن کشا ہے۔ کیوں کہ شاگرد استاد سے ہزار ہا گنا درجے کم تر ہے۔ اس کے علاوہ میں اپنے شوہر ڈاکٹر قادر بخش صاحب کی بھی ممنون ہوں جو مجھے متعدد بار اندرونِ سندھ کے کتب خانوں اور خانقاہوں تک لے کر گئے۔

دعاؤں کی طالب

خدیجہ میمن

---

(۱) پروفیسر ڈاکٹر ابوالفتح صغیر صدیقی کی وفات پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے سات اشعار کا قطعۂ تاریخِ وفات کہا ہے (مشمولہ: نفائسِ تاریخی ۱۴۲۲ھ) تاریخی مصرعے یہ ہیں۔

''لک فتحا مبینا رمز ابوالفتح'' ——— ۱۴۱۷ھ ———

''صغیر الدین محمد بالیقین شادؔ'' ——— ۱۹۹۶ء ———

باب اوّل

''سرزمینِ سندھ کا مختصر تعارف''

پگارا خاندان کا تعلق اندرونِ سندھ سے ہے، چناں چہ ان بزرگوں کے حالات و واقعات کا جائزہ لینے، یہاں کے سیاسی و معاشی حالات کو دیکھنے اور ان کی دینی خدمات کو اجاگر کرنے سے پہلے مناسب ہے کہ اس سرزمین کا تعارف مختصراً پیش کر دیا جائے، جہاں ان بزرگوں نے عالمانہ، فاضلانہ اور بزرگانہ کردار زندگی ادا کیا۔ کیوں کہ جب تک خطے کی صحیح تصویر اور سرزمین کا تعارف ہمارے سامنے نہیں ہوگا ہماری تحریر و تحقیق کو تشنہ تصور کیا جائے گا۔ اس لیے کہ ماہرینِ لسانیات اس بات پر متفق ہیں کہ خطے کی آب و ہوا، اُس کے رہن سہن اور معاشرت کا وہاں کے مکینوں کی زبان و بیاں اور کردار ہائے زندگی پر براہِ راست اثر پڑتا ہے لہٰذا ہم اس خطے کے مختصر تعارف کے تناظر میں دیکھ سکیں گے کہ یہاں پگارا خاندان نے کس قسم کی معاشرت کو اپنایا اور کس ماحول میں دینی خدمات انجام دیں۔

میں ذاتی طور پر سارا انصاری کی اس رائے سے اتفاق نہیں کرتی کہ ''برصغیر میں تاریخی اعتبار سے سندھ کی حیثیت کافی غیر اہم رہی ہے۔'' (مشمولہ سندھی پیر اور برطانوی راج: صفحہ ۲۵) بلکہ میں سمجھتی ہوں کہ برصغیر میں تاریخی، تہذیبی، سیاسی اور دینی اعتبار سے سندھ کو ہمیشہ سے اہمیت حاصل رہی ہے، ۷۱۲ھ میں محمد بن قاسم اس خطے سے برصغیر میں داخل ہوتا ہے اور اسلام کا ہمہ گیر پیغام بھی عام ہوتا ہے۔ اور یہاں کی زبان پر براہِ راست عربی کا اثر ظاہر ہوتا ہے، جس کے بعد دراوڑی زبانوں کے اشتراک اور فارسی عمل دخل سے اردو جیسی زبان کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنی تصنیف ''سندھ میں نقشبندی اولیاً'' میں اس خطے کی دینی اہمیت واضح کی ہے، جس کا اقتباس ہمارے موضوع کے اعتبار سے قابلِ مطالعہ ہے جس کے آخری پیراگراف میں ''سید علی مکیؒ'' (چوتھی صدی ہجری) کا نام بھی آتا ہے، سید علی مکی علیہ الرحمہ پیر پگارا خاندان کے وہ پہلے بزرگ ہیں جو سعودی عرب سے سندھ آکر آباد

ہوئے تھے، جہاں خاندانِ پیر پگارا پھلا پھولا متذکرہ تصنیف کی ابتدائی سطریں اس طرح ہیں:

اسلام کی آمد سے سندھ کا موجودہ صوبہ، اسلامی تعلیمات کا گہوارہ بن گیا ہے اس کے علماء اور اولیأ سب سے پہلے مبلغین ہیں جو برصغیر پاک و ہند کے لیے دینی برکات لے آئے۔

مسلمانوں کی آمد کا قدیم ترین ثبوت ۱۰۹ھ / ۷۲۷ء سے ملتا ہے، بھنبور میں کھدائی کرنے سے ایک جامع مسجد دریافت ہوئی، اس کے ایک کتبے میں یہی سن درج ہے، تقریباً اسی زمانے میں حضرت ابوتراب یہاں تشریف لائے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بھکر کا قلعہ فتح کیا تھا، ٹھٹھ سے قریب ۱۰، میل مغرب کی طرف تعلقہ میرپور ساکرو میں گجو کے مقام پر آپ کا مزار ہے جس کی لوح پر ۱۷۱ھ (۷۸۸ء) درج ہے پھر تو بکثرت فضلاء اس صوبے کے مختلف مقامات پر اقامت گزیں ہوئے، اور انہوں نے دینی علوم کے مختلف شعبوں میں بیش بہا خدمات انجام دیں، اس طرح انہوں نے کفر و جہالت کو دور کرنے کے لیے دنیا والوں کی سرپرستی کے بغیر نہایت مخلصانہ کارنامے انجام دیے ایسے چند فضلأ کے اسمائے گرامی یہ ہیں:

۱- ابو معشر نجیح بن عبدالرحمٰن سندھیؒ (م، ۱۷۰ھ - ۷۸۷ء) جامع ترمذی میں ان کی ایک روایت ملتی ہے۔

۲- شیخ مسعود بن شیبہ سندھیؒ، طبقات الحنفیہ اور کتاب التعلیم کے مصنف ہیں۔

۳- شیخ رحمۃ اللہ سندھیؒ (م، ۹۹۳ھ - ۱۵۸۵ء) ملا علی قادریؒ نے آپ کی المنسک المتوسط کی شرح لکھی ہے۔

۴- شیخ ابوالحسن محمد بن عبدالہادیؒ (م، ۱۱۳۲ھ - ۱۷۲۳ء) آپ مدینہ منورہ سے ٹھٹھ تشریف لائے، مسند امام احمدؒ کی شرح لکھی، شرح نخبۃ الفکر کی تعلیقات بھی لکھی۔

۵- شیخ محمد حیات بن ابراہیمؒ (م، ۱۱۶۳ھ - ۱۷۵۰ء) آپ بھی مدینہ منورہ سے تشریف لائے، لوذی کی اربعین کی شرح لکھی اور ملا علی قادریؒ کی بھی۔

۶- مخدوم جعفر بوبکائیؒ جو المتانہ اور حل العقود فی طلاق السنود کے مصنف ہیں۔

۷۔ ابوالحسن محمد صادقؒ (م،۱۱۸۷ھ/۱۷۷۳ء) آپ مدینہ طیبہ سے تشریف لائے، آپ نے ابن حجر کی تحت الفکر کی شرح لکھی۔

۸۔ مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوریؒ (م،۱۱۷۴ھ/۱۷۶۰ء) آپ کا شمار عظیم ترین علماً میں ہوتا ہے، آپ نے مختلف دینی موضوعات پر تین سو کتابیں لکھیں اور بکثرت تلامذہ تیار کیے۔

۹۔ شیخ ابوالحسنؒ آپ پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے سندھی رسم الخط کو دیونگری سے عربی میں منتقل کیا، آپ نے مقدمہ الصلوٰۃ سندھی میں لکھی، اور اس میں متعدد مقامات پر مخدوم محمد ہاشم ٹھٹوریؒ کا حوالہ دیا ہے۔

ان علماً کے علاوہ حسب ذیل نامور صوفیہ ضرور قابلِ ذکر اور قابلِ احترام ہیں۔

سید علی مکیؒ (چوتھی صدی ہجری) مخدوم نوحؒ بھکری (ساتویں صدی ہجری) لعل شہباز قلندرؒ (م،۶۷۳ھ/۱۲۷۴ء) شیخ چھوکو (م،۶۶۶ھ/۱۲۶۷ء) شیخ مرادؒ (م،۵۹۳ھ/۱۴۸۸ء) شیخ عیسیٰ لنگوٹیاؒ (م،۹۳۱ھ/۱۵۲۵ء) شیخ خضر سیوستانیؒ (م،۹۹۴ھ/۱۵۸۶ء) اسمٰعیل سومروؒ (م،۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) مخدوم نوح ہالائیؒ (م،۹۹۸ھ/۱۵۹۰ء) عبداللہ حسینیؒ (م، ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۳ء) عبدالکریم بلوی والےؒ (م، ۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء) شاہ عنایت اللہ جھوک والےؒ (م،۱۱۳۰ھ/۱۷۱۷ء) عبدالرحمٰن کھوڑاؒ (م،۱۱۴۵ھ/ ۱۷۳۲ء) عبداللطیف بھٹ شاہ والےؒ (م، ۱۱۶۵ھ/۱۷۵۲ء) وغیرہ یہاں کے مشہور و معروف صوفیہ تھے، جب کہ حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد فاروقی قدس سرہٗ (م،۱۰۳۴ھ/۱۶۲۴ء) اپنے غیر معمولی فیوضات و برکات لے کر برصغیر پاک و ہند میں جلوہ فرما ہوئے۔(۱)

اس پیراگراف سے سندھ کی دینی اہمیت واضح ہو جاتی ہے، یہاں کی سیاسی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں ہے۔ جس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ انگریز حکومت نے سندھ کو صوبۂ بمبئی میں شامل رکھا اور قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنے چودہ نکات میں اس مطالبے کو شامل کیا کہ سندھ کو بمبئی سے علاحدہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ اس خطے کی ادبی اہمیت کو دیکھنے کے لیے پگارا خاندان کی ایک شاخ سے تعلق رکھنے ''پیر حسام الدین راشدی'' کی تالیف ''تکملۂ مقامات الشعراء'' قابلِ مطالعہ ہے۔ جس

کے صفحہ نمبر ۷۹ پر پگارا خاندان کے بزرگوں کی شاعری اور تفصیلی حالات درج ہیں اس کے علاوہ اس خطے کی ادبی اہمیت کا اندازہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کی تصنیف ''سندھ میں اردو شاعری'' بھی اہم ہے، سندھ کے مختصر تعارف میں ہم نے یہ بھی عرض کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس خطے کی برِصغیر میں اہمیت ادبی، علمی، فکری، سیاسی، مذہبی، اور دینی اپنی جگہ مسلمہ رہی ہے۔

جغرافیائی اعتبار سے یہ خطہ ۲۳ یا ۲۹ عرض بلند شمال اور ۶۷ تا ۷۱ طول بلد مشرق میں واقع ہے، یہ شمالی ہند کے دریائی اور صحرائی علاقہ اور مغرب میں کوہستانی سلسلے کے درمیان ایک رکاوٹ کی حیثیت رکھتا ہے، وادی سندھ کے مشرق میں ریگستانی سلسلہ ''تھر'' واقع ہے اور مغرب میں سلسلہ کوہستان جو بلوچستان سے جاملتا ہے۔

موسم کے اعتبار سے یہ خطہ موسمِ سرما میں انتہائی سرد اور موسمِ گرما میں شدید گرم خطہ ہے، دریا کے کناروں میں طغیانی کی وجہ سے زرخیز مٹی بچھتی ہے یہ طغیانی یہاں کی آب پاشی کا اہم ذریعہ ہے اس کے برعکس صحرائی اور کوہستانی علاقوں میں آب پاشی کا انحصار بارش اور کنوؤں پر ہے، لوگوں کا ممتاز پیشہ مویشی پالنا اور کھیتی باڑی کرنا ہے۔

انیسویں صدی تک سندھ میں مسلمانوں کی تعداد ہندوؤں کے مقابلے میں تین گناہ ہوگئی تھی، اگر چہ کاروبار تجارت وغیرہ ہندوؤں کے زیرِ اثر تھا مسلمانوں کی کثیر تعداد دیہاتوں میں مقیم تھی، اور ان کا انحصار زراعت پر تھا۔ خواندگی کی شرح نہ ہونے کے برابر تھی، لیکن مذہبی لگاؤ اور دینی اثر ان میں زیادہ تھا، مختلف پیروں مرشدوں کا عمل دخل انتظامی معاملات سے لے کر عوامی مسائل تک حل کرنا ان کی ذمہ داری تھی، یہاں بے پیر رہنا یعنی کسی سے بیعت نہ کرنا نہایت معیوب سمجھا جاتا تھا، تقریباً تمام سندھی مسلمانوں کا کوئی نہ کوئی مرشد ضرور ہوتا تھا، اس خطے میں اسلام علماۓ اکرام وغیرہ کی کوششوں سے کم پیروں اور درگاہوں کے ذریعے زیادہ پھیلا جس کا اثر آج بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ان پیروں اور مرشدوں میں سے بعض بہت فاضل شخصیت کے حامل اور پائے کے عالم کہے جانے کے قابل تھے۔ انہی میں پیر پگارا خاندان کے اسلاف کا بھی شمار ہوتا ہے، جنھوں نے اپنے مکتوبات، ملفوظات اور مطبوعات سے اس خطے میں اسلامی رجحان پیدا کرنے اور دینی ماحول کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

(II) مسلمانوں کی سندھ میں آمد کا ابتدائی دور:

پگارا خاندان سندھ میں کب آباد ہوا، اس سے بحث ہم اپنے مقام پر کریں گے لیکن یہاں سندھ میں مسلمانوں کی آمد کے ابتدائی دور کا تعین کرنا ضروری ہو جاتا ہے، تا کہ پگارا خاندان کی خدمات کو اس تناظر میں بھی دیکھنا آسان ہو جائے، نیز اس بحث سے خطے کی دینی اہمیت اور یہاں مذہبی رجحان کی قدامت کا بھی ہمیں علم حاصل ہوگا، اس کے لیے مناسب ہے کہ ہم ''سارا انصاری'' کی تصنیف ''سندھی پیر اور برطانوی راج'' سے رجوع کریں جو خود بہت سی تصانیف کے مستند حوالے لیے ہوئے ہے، لہٰذا ہم یہاں متذکرہ کتاب سے ایک طویل اقتباس پیش کرتے ہیں۔

''سندھ میں اسلام راتوں رات نہیں پھیلا۔ بلکہ یہ تقریباً ایک ہزار برس کا عمل تھا، جس میں اسلام کے علم بردار مقامی حالات سے دوچار رہے، سابقہ عقائد اور بدلتے سیاسی و معاشی حالات اسلام کی مقبولیت اور مقبول ہونے پر اثر انداز ہوئے۔ سندھ میں اسلام پھیلنے کا ابتدائی عرصہ دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، اوّل جب آٹھویں سے دسویں صدی میں عربوں کا غلبہ تھا اور سنی علماً نے اسلام کا پرچار کیا، دوم دسویں سے چودھویں صدی کا عرصہ جب اسماعیلی مبلغ یہاں سرگرم تھے۔

عرب تسلط کا زمانہ ۱۲-۷۱۱ھ میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ سے شروع ہوتا ہے۔ یہ اس علاقہ (خطہ) میں مسلمانوں کی حکمرانی کا آغاز تھا، جسے اب گیارہ سو برس ہو گئے ہیں۔ برصغیر کا کوئی حصہ اتنا طویل عرصہ کسی اور کے زیر اثر نہیں رہا۔

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ عرب حکمران متشدد یا متعصب مبلغ نہ تھے، جن کا مقصد اسلام کو بزور شمشیر پھیلانا تھا۔ بلکہ ان کی فتوحات کے محرکات اقتصادی تھے، یہاں کی زرخیز زمین اور ساحلی اڈے حکمرانوں کے لیے نہایت کشش رکھتے تھے۔ خلیج فارس سے نکلتے ہی عرب تاجر دیبل کا رخ کرتے تھے، جہاں سے وہ خطہ سندھ کا بیش بہا اور منافع بخش ساز و سامان جہاز میں لاد لیتے تھے، ساتھ ساتھ عرب فوجی چھاؤنیوں کی صورت میں آباد ہو گئے۔ یہ ممکن نہ تھا کہ ایک قلیل تعداد اکثریت پر اپنے طور طریقے ٹھونس دیتی، لہٰذا سندھ کے حکمرانوں نے یہ حل نکالا کہ یہاں سے ہندوؤں اور بدھوؤں کو، اہل کتاب، کا درجہ دیا اور دوسرے مسلمان ممالک کے پارسیوں، یہودیوں اور عیسائیوں کی طرح ان سے جزیہ وصول کر کے انہیں ذمی بنا دیا، ان کے مذہبی اور ذاتی معاملات میں کسی قسم کا دخل نہیں دیا۔

سندھ کی مذہبی ارتقاء کی تاریخ میں عرب تسلط ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے، تجارتی محرکات پہلے سندھ کی فتح کی باعث بنا جو بعد میں حاکموں اور رعایا کے درمیان رابطہ کی شکل اختیار کر گئے، گو چند دیسی راجے اپنے اقتدار کو محفوظ کرنے کی خاطر مسلمان ہو گئے۔

عوام میں اسلام تاجروں کے آمد روفت کے نتیجہ میں پھیلا۔ تجارت کے فروغ سے سندھ اور باقی دنیا میں رابطہ کو بھی فروغ ملا، اور اس خطہ میں دوسرے مسلم علاقوں کے خیالات اور عقائد و تعلیم کی دین اسلام نے جڑیں پکڑیں، یہ ماحول پیشہ ور دینی شخصیات کے لیے بھی بہت پر کشش ثابت ہوا، اور بہت سے علماء نے ادھر کا رخ کیا، اور دیسی عورتوں سے نکاح کر لیا، اور اس طرح صوفیوں کے سلسلوں کی بنیاد پڑی۔

بھکر، روہڑی، ٹھیاری، اور ٹھٹھہ ان خاندانوں اور سیدوں کی کثیر تعداد کی وجہ سے مشہور ہو گئے، سندھ میں عربوں کے اس دور کے مذہبی اشتراک کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اس سے قبل لوگوں کے عقائد ہندو اور بدھ مت سے متاثر تھے، ذات پات کی تفریق نہ تھی، لوگ خود کو آزاد تصور کرتے تھے، البتہ بدھ ''شامانوں'' کے زیر اثر تھے، مسلمان دور میں بھی یہ عقائد کمزور نہ پڑے، نیا مرکز بھی اتنا ہی دور تھا جتنا کہ پرانا، پہلے بھی یہ خطہ سرحدی تھا اب بھی سرحدی رہا، عربوں نے ملتان میں شیو پوجا کے نامی گرامی ''راوی مندر'' کو گرانے کی بجائے اس کے قریب ایک مسجد قائم کر دی، علاقائی عقائد و روایات رفتہ رفتہ اسلامی رسومات میں شامل ہو گے، مثلاً خواجہ خضر مسافروں اور سمندروں اور دریاؤں کے ولی مختلف اشکال میں نمایاں پائے جاتے تھے، یہ شمالی ہند کے دریائی علاقوں میں بحثیت یکے از پنج پیراں مانے جاتے تھے، ان کا بکھر میں مزار بطور ''زندہ پیر'' واقع ہے، جو ہندوؤں کے لیے بھی قابلِ تعظیم مانا جاتا ہے، پلہ مچھلیوں کے صرف بکھر تک سفر کو سالانہ ''زیارت'' کا درجہ دیا جاتا ہے، خواجہ خضر دونوں ہندوؤں اور مسلمانوں کے لیے یکساں قابلِ احترام مانے جانے لگے۔

اگر چہ عربوں کی آمد سے سندھ میں اسلام پھیلنے لگا، مگر انیسویں صدی میں اسماعیلی مبلغوں کی آمد کے بعد ہی لوگ جوق در جوق اس میں آئے، یہ حالات اگلی تین صدیوں تک اسی طرح رہے، سابقہ سنی نوواردان کی طرح یہ لوگ خاص طور پر اسلام کی تبلیغ کی غرض سے نہیں آئے، دراصل ان کا ورود سیاسی تھا، اور یہ عباسیوں اور فاطمیوں کی سیاسی تگ و دو کا نتیجہ تھا، عباسیوں کا اثر اقتدار کم کرنے کی غرض سے فاطمیوں نے انہیں ادھر بھیجا رفتہ رفتہ وہ شمالی سندھ میں سومرہ خاندان کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب رہے، حتیٰ کہ ۱۰۲۵ء تک وہ منصورہ پر جو جنوبی سندھ میں واقع تھا قابض ہو گئے، سندھ

اب اسماعیلیوں کے زیر اثر آ گیا، اسماعیلی مبلغوں کی کوششوں کو تاریخ اسلام میں ''مذہبی اور سیاسی تبلیغ کا نہایت پر اسرار اور موثر ذریعہ'' خیال کیا جاتا ہے، اس عمل کا اہم ترین اور موثر کردار خود داعی تھا، امام کے مامور کردہ نمائندہ کی حیثیت سے وہ تبلیغ و تدریس کا ذمہ دار اور بیعت لینے کا حق دار تھا۔ اسماعیلیوں نے لوگوں کو بزور شمشیر یا زبردستی مسلمان نہیں کیا بلکہ مختلف مذاہب میں رشتے اور روابط قائم کرنے کی حکمت عملی اختیار کی، تبدیلی مذہب کو ایک آرام دہ سفر کا درجہ دیا، اس سفر کے دوران پرانے مذہب کے عقائد کو بتدریج ترک کر دیا جاتا تھا، اپنی آمد کے شروع میں اسماعیلیوں نے ملتان کے قریب ''راوی مندر'' کو منہدم کرنے کی کوشش کی، لیکن جلد ہی ان کی ہٹ دھرمی اور تنگ نظری مفاہمت میں تبدیل ہو گئی، اور انہوں نے دیسی اور مقامی رسومات اور عقائد کو اپنانا شروع کر دیا، یہاں تک کہ انہوں نے مقامی کلچر کی حوصلہ افزائی کی اور اسے مزید تقویت بخشی، ۱۰۲۵ء میں محمود غزنوی کی فتح کے نتیجہ میں وہ اپنا سیاسی اقتدار کھو بیٹھے اور اس کے بعد نئے حکمرانوں کے ظلم کے نتیجہ میں وہ تقیہ پر انحصار کرنے لگے، (یعنی احتیاطاً زمانہ سازی سے کام لینے لگے) لہٰذا اسماعیلی مبلغین اپنے عقائد اور نظریات مخفی طریقہ سے اشارات اور علامات کے ذریعہ اس طرح پیش کرنے لگے کہ جلد ہی وہ عقائد ہندی اسلامی معاشرہ میں سرایت کر کے چھپ گئے۔ اب چوں کہ اسماعیلی مبلغین سر عام نہ تبلیغ کر سکتے تھے، نہ دعوت دے سکتے تھے، چنانچہ وہ اپنے نظریات میں تبدیلی لانے لگے، خیالات کو ماحول کے مطابق بنایا تاکہ نو مسلموں کو اپنانے میں مشکل نہ ہو، پھر پندرھویں صدی اور اس کے بعد اسماعیلی نظریات ہندوانہ ہوتے چلے گئے، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ لوگوں کو صوفیاء کے بڑھتے ہوئے اثر سے بچایا جا سکے، اس عمل کا نقطۂ عروج پیر صدر الدین کے زمانہ میں آیا، پیر صدر الدین پندرھویں صدی کے اوائل میں سند کے بودھوں کو مسلمان کرنے کے ذمہ دار سمجھے جاتے تھے، بعد میں یہ قبیلہ ''خواجہ'' کہلانے لگے، ایک کتاب ''درس امتار'' ان سے منسوب ہے اس میں بیان کیا گیا ہے کہ کئی ہندو شخصیات مثلاً برہما، وشنو، وغیرہ اپنی اس موجودہ روپ مانتے تھے۔

سولہویں صدی تک اسماعیلیت کی توسیع رک گئی، پیر صدر الدین کی اولاد اور خلف گجرات جا کر آباد ہو گئے، یہ اس وقت کے صوفیاء کا عمل تھا، کہ انہوں نے اسماعیلیوں کو ناکام کر کے انہیں ہجرت پر مجبور کر دیا۔ ''مبلغین'' اور لوگوں میں در اصل بہت قریب کا رشتہ تھا، اس کے بالکل برعکس جو اس (صوفیاء کی) دیت دارای سے ظاہر ہے مثلاً اسماعیلی گنان اور صوفی خیالات اور ہندوؤں کی ''بھگتی'' روایات میں بہت مشابہت نظر آتی ہے سب کا موضوع اور تصور ایک جیسا نظر آتا ہے، گویا یہ ایک دوسرے کے خیالات کا استعمال تو نہیں ظاہر کرتے لیکن لگتا ہے کہ ایک دوسرے سے متاثر ضرور تھے، علاوہ ازیں کئی

ایک ''داعی'' صفوی زمانہ کے نظاری اسماعیلی اماموں کے رائج کردہ صوفیانہ نظریات پر کاربند رہتے ہوئے یہاں اور برصغیر میں اپنے نظریات پھیلانے میں سرگرم رہے، یہ اسماعیلی ''تصوف'' تھا لیکن دوسرے صوفی حضرات کے خیالات میں قدرے بگڑا ہوا۔

صوفیاء کی تعظیم کی ایک اور وجہ بھی تھی، اسماعیلی مبلغین نے لوگوں کی نظروں میں آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بلند مقام پر دکھایا اور جاتے ہوئے یہ صوفیاء کے لیے میراث چھوڑ گئے۔

دسویں صدی میں جب حلاج نے ادھر کا رخ کیا تھا تو سندھ عالم اسلام میں علم وفضیلت کے لیے بہت مشہور تھا، مختلف علوم سے آشنائی کے لیے دنیا یہاں کے لوگوں کی احسان مند ہے، مغرب نے ریاضی اور علم نجوم وفلکیات یہاں سے سیکھا، بارھویں صدی کا عمل ہے کہ سندھ تصوف کا گہوار بنا گو صوفیانہ خیالات اور فلسفہ اتنے پرانے ہیں جتنا اسلام، اس وقت کچھ غیر معمولی تبدیلی ہوئی۔ اور تصوف ایک فرد کے خاصے کی بجائے ایک ادارے کی شکل اختیار کر گیا، اور ''سلسلوں'' کا آغاز ہو گیا، اس کے بعد صوفیاء کی سندھ میں آمد ایک تحریک کی صورت اختیار کر گئی جس کی وجہ سے اسے ایک باقاعدہ تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔

اسماعیلیوں کا زور توڑنے میں سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء نے پہل کی، برصغیر کے دیگر علاقوں میں پھیلے ہوئے سلسلہ چشتیہ کے صوفیاء کے برعکس سہروردی صوفیاء مقامی اکابرین اور فرماں رواؤں سے بنا کر رکھتے تھے، جس کے باعث ان کے مال ودولت اور وقار دونوں میں خوب اضافہ ہوا، یہاں اس سلسلے کے بانی شیخ بہاؤالدین زکریہ (تاریخ وفات ۱۲۶۶) تھے، انہوں نے اپنے دیس ملتان کو جو سندھ کے شمال میں ہے سلسلے کا ایک کامیاب مرکز بنادیا، بعد میں اوچھ کے مقام پر مخدوم جہانیاں (تاریخ وفات ۱۳۸۳ء) کی زیرنگرانی سلسلہ کا دوسرا اہم مرکز قائم ہوا، جس کی وجہ سے سلسلہ کا اس علاقہ میں اثرورسوخ بڑھ گیا، رفتہ رفتہ سلسلے کے صوفیاء تمام سندھ میں پھیل گئے، شروع کے آنے والوں میں شیخ نوح مشہور ہیں، جو بکھر (سکھر) میں مدفون ہیں، سید عثمان شاہ مروندی المعروف لال شہباز قلندر (تاریخ وفات ۱۲۷۳ء تقریباً) نے سہون کے قدیم شہر میں سکونت اختیار کی، سید عثمان شاہ مروندی، شیخ بہاؤالدین زکریہ کے ہم عصر تھے، البتہ یہ ثابت کرنا مشکل ہے کہ ان کے خلیفہ مقرر ہوئے تھے، یا نہیں، دونوں حضرات کی سوانح بہت مشترک ہیں، دونوں صاحبان اور پاک پتن کے شیخ فریدالدین گنج شکر اور اوچھ کے سید جلال الدین سرخ پوش ''چہار یار'' کے نام سے جانے جاتے ہیں، اور یہ

چاروں صوفیاء عالم ہند اور عالم اسلام میں مشہور ہیں جہاں وہ جگہ جگہ تشریف لے گئے، اس وقت کے دوسرے اہم سہروردی صوفیاء میں پیر پاتھو (تاریخ ۱۳۰۰ء) کا نام ہے، جو ٹھٹھہ سے چند میل جنوب میں مدفون ہیں اسی طرح سید ساجن سروائی جن کا مزار تلہار میں ہے، اور پیر حاجی منگو ہیں جن کی درگاہ کراچی سے ذرا باہر شمالی میں ہے۔

جہاں جہاں یہ صوفیاء مقیم تھے، یا مدفون ہیں قبل از اسلام اہم ہندو مقامات تھے، اور اس طرح یہ حضرات ہندوؤں میں بھی قبول ہو گئے۔ مثلاً حضرت لال شہباز قلندر کو ان کے ہندو معتقدین راجہ بھرتری کے نام سے پکارتے تھے، پیر پاتھو کو راجہ گوپی چند اور پیر حاجی منگو کو لالہ سراج، پیر پاتھو اور منگو پیر صدیوں پرانی ہندو یاترائیں بھی تھیں، منگو پیر کے مگرمچھ اور گرم چشمہ ان کے پرانے مرکز سے منسلک تھے، اور بعد میں بھی جب ہندوانہ تہذیب کا یہاں سے تعلق ختم ہوا، معتقدین کا ان سے رشتہ قائم رہا، صوفیاء کے نظریہ وحدت الوجود کی وجہ سے اس پر کوئی اعتراض بھی نہیں ہوا۔

چودھویں صدی عیسوی میں سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء کی آمد میں مزید اضافہ ہوا، گو سندھ کے ارغون حکمرانوں کی مخالفت نے اکثر صوفیاء کو گجرات اور برہان پور میں سکونت اختیار کرنے پر مجبور کر دیا تھا، ہالہ کنڈی کے مخدوم اسحاق ٹلٹی میں ان کے صاحب زادے مخدوم بلال (تاریخ وفات ۱۵۲۲ء) اور ہالہ کے مخدوم نوح کو سندھ میں بہت بلند مقام حاصل ہوا، ہالہ سلسلہ سہروردیہ کے صوفیاء کا اہم ترین مقام بھی تھا، اس کے علاوہ بکیرہ، ٹیاری، پلڑی، اور سن کو بھی اہمیت حاصل تھی، گو ثانوی درجہ پر۔

دریں اثناء سلسلہ قادریہ کے صوفیاء نے بھی ادھر کا رخ کیا، بارہویں اور تیرہویں صدی عیسوی میں اسماعیلیوں کا مقابلہ کرنے یہ جوق در جوق آئے، کہا جاتا ہے کہ شیخ احمد بغدادی اور ان کے بھائی شیخ محمد چالیس شاگردوں کے ہمراہ اس مقصد کے لیے آئے۔

پندرہویں صدی تک ان کی جڑیں یہاں مضبوط ہو گئیں، شیخ یوسف الدین ۱۴۳۰ء اور شیخ محمد غوث (۱۴۸۲ء) کی تبلیغ پیر صدرالدین کے مقابلہ میں بہت موثر ثابت ہوئی، اور چھ سلسلہ قادریہ کا ایک اہم مقام بن گیا، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسماعیلی پیر اور درگاہیں قادریوں کے زیر اثر آ گئیں۔

نتیجتاً بھکر، نصرپور، ٹھٹھہ اور بدین بھی سلسلہ قادریہ کے اہم مقام بن گئے، شیخ خضر سہوستانی کے شاگرد حضرت میاں میر سہون سے لاہور چلے گئے، جہاں ان کے شاگردوں نے شاہ جہان اور دارالشکوہ سے اچھے تعلقات قائم کیے، اکثر سید

خاندان جن مین لکھیاری، روہڑی، اور بھکر کے سادات مشہور ہیں اس سلسلہ میں شامل ہو گئے، کہا جاتا ہے کہ سلسلہ کی مقبولیت عام کی ایک وجہ شیخ عبدالقادر جیلانی کا سالانہ عرس اور تقریبات بھی تھیں، جن کے نام پر یہ سلسلہ قائم کیا گیا تھا، اس طرح سلسلہ نقشبندیہ کے صوفیاء نے پندرہویں صدی میں سندھ کا رخ کیا، اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ سندھ کے حکمران سہروردی صوفیاء کے خلاف ہو گئے تھے، اور اس کے علاوہ اسماعیلی تعلیمات کی بھی بدعت سمجھنے لگے تھے، ابتداء کی مشہور شخصیات میں پیر مراد (تاریخ وفات ۱۴۸۷ء) اور ان کے بھائی سید میاں علی شیرازی کے نام شامل تھے، لیکن سلسلہ کو عروج سترہویں صدی میں ہند کے دوسرے علاقوں کی طرح شیخ احمد سرہندی (حضرتِ مجدد الف ثانی ؒ م ۱۰۳۴ھ) کی کوششوں کے نتیجہ میں حاصل ہوا، نظریات کا اختلاف اب بہت واضح ہو چکا تھا۔

نقشبندی صوفیاء نظریہ "وحدت الوجود" کے سخت مخالف تھے، ان کے مطابق یہ نظریہ مسلمہ نہ تھا، لیکن اٹھارویں صدی میں شاہ عبداللطیف بھٹائی (تاریخ وفات ۱۷۵۲ء) کے کلام نے نظریہ "ہمہ اوست" اور "وحدت الوجود" کو عروج پر پہنچا دیا تصوف میں شاہ عبداللطیف اور حافظ کو ایک ہی مقام پر دکھایا گیا ہے، ان کے "رسالو" کی وجہ سے نقشبندیوں کو ان کے برپا کردہ جوش و خروش کے خلاف جوابی کاروائی اور مزاحمت کرنا پڑی۔

سلسلہ نقشبندیہ کے نئے صوفیاء نے مخدوم آدم ٹھٹھوی کی سربراہی میں ٹھٹھہ اور روہڑی میں سکونت اختیار کی، ان کے ہمراہ میاں کبیر، مخدوم محمد صدیق، خواجہ معصوم اور مخدوم ابراہیم تھے، انہوں نے ایک ایسی فضا پیدا کی جس کے بعد لواری کے مخدوم محمد زمان (تاریخ وفات ۱۷۷۲ء) اور شیخ عبدالرحیم گروڑی (تاریخ وفات ۱۷۷۸ء) جیسے نامور صوفیاء پیدا ہوئے، لیکن یہ دونوں حضرات اس وقت کے مذہبی اور ماحول سے متاثر ہو کر نقشبندی عقائد سے دور ہو گئے، مخدوم محمد زمان کے خیالات وحدانیت کی طرف مائل اور ٹھٹھہ کے اپنے ہم عصروں سے مختلف ہیں، جبکہ شیخ عبدالرحیم گروڑی کا کلام مقامی لوگوں کے قصوں سے آراستہ ہے۔

اٹھارویں صدی عیسوی کے آخر تک سندھ میں جگہ جگہ مزار اور درگاہیں نظر آنے لگیں، مختلف سلسلے آپس میں خلط ملط ہوتے دکھائی دے رہے تھے، روہڑی، سہون، نصرپور، ٹھٹھہ وغیرہ ایک سے زیادہ سلسلوں کا مرکز بن گئے تھے، اور ہر مرکز سوا لاکھ صوفیاء کے مرقد ہونا کا دعویٰ کرنے لگا، صوفیاء اب صرف اسلام کے مبلغ اور علم بردار نہ تھے، بلکہ اسلام کا نمونہ بن گئے۔ اور مقامی مسلمان معاشرہ اور روایتی اسلام کے درمیان ایک رابطہ یا رشتہ، مقامی باشندوں یا حکومت سے دوری کا

احساس مذہبی معاملات میں بھی رونما ہوا، پیر اور مزار کو بھی اس نظر سے دیکھتے ہوئے وہ انہیں اپنے خدا کے درمیان ذریعہ شفاعت ماننے لگے۔'' (۲)

جیسا کہ اوپر شاہ صدرالدین کا ذکر آیا ہے، ان کے بارے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنی تصنیف ''سندھ کے نقش بندی اولیاء'' (مطبوعہ: ۲۰۰۲ء۔ص ۱۹) میں بتایا ہے کہ ''یہ حضرت موسیٰ الکاظمؓ کی اولاد میں سے تھے، آپ کے دادا سید علی مکیؒ تھے''۔

سید علی مکیؒ پہلے سید ہیں جو دادو کے قریب آباد ہوئے، اور وہاں کے راجہ اردر کی نو مسلم بیٹی سے شادی کی ان کی اولاد میں شاہ صدرالدین ثانیؒ گیارہویں صدی ہجری میں تھے، ان کا مقبرہ ۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں تعمیر ہوا جیسا کہ قطعۂ تاریخ میں ہے۔ سالِ تاریخش بجستم از خرد ہاتم گفتا ''بہشت اہلِ بیت'' آپ کے نواسوں میں سید محمد شجاع نقشبندیؒ تھے، ان کی نرینہ اولاد میں سید محمد بقاؒ (بن محمد امامؒ بن فتح محمدؒ) رسول پور (ضلع خیر پور) میں ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۹۴ء میں ظالموں نے ان کو شہید کر دیا دیہہ طیب (خیر پور) میں تدفین ہوئی۔ انھوں نے چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بھی فیض حاصل کیا۔ پھر مخدوم محمد اسماعیل پریاں لوئیؒ (روہڑی) سے نقشبندی سلسلے میں فیضیاب ہوئے۔ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء میں وفات پائی۔

سید محمد بقاؒ کے صاحب زادے سید محمد راشدؒ ۱۱۷۰ھ /۱۷۵۶ء میں پیدا ہوئے، انھوں نے حضرت شاہ فقیر اللہ علوی شکارپوریؒ (م ۱۱۹۵ھ/ ۱۷۸۱ء) نیز مخدوم احمدیؒ (م ۱۲۰۳ھ/۱۷۸۹ء) اور مؤخرالذکر کے صاحب زادے محمد عاقلؒ (م ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء) سے تعلیم حاصل کی۔ سید محمد راشدؒ نے ۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء میں وفات پائی۔ اُن کے بعد اُن کے صاحب زادے صبغت اللہؒ (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) سجادہ نشین ہوئے یہ پہلے پگارا تھے، انھوں نے حُر جماعت قائم کی جو سید احمد بریلویؒ (م ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء) کی جماعت کی طرح تھی، سید صاحب خود بھی ان کے پاس تشریف لائے تھے۔

حضرت صبغت اللہؒ کے جانشین ان کے صاحب زادے سید علی گوہرؒ (م ۱۲۶۳ھ/۱۸۴۷ء) ہوئے۔ پھر اُن کے صاحب زادے حزب اللہؒ (م ۱۳۰۸ھ/۱۸۰۹ء) ہوئے، پھر اُن کے صاحب زادے صبغت اللہ ثانیؒ (م ۱۳۶۲ھ / ۱۹۴۳ء) کے خلاف انگریزوں کے بڑی سازشیں کیں اور الزامات لگا کر دار ورسن تک پہنچا دیا اُن کے متعلق مولانا دین محمد عزیز لکھتے ہیں:

پئے جنگِ انگریز سرکش نمود
دوم صبغتہ اللہ نشوونما !
فرنگی یگر دید زدر منتقم
زدارش رسانده به دارالبقا
زمیں دور حسنِ حسنیش نمود
ربودنده مالش به جوروجفا
چو آیا د اجداد فیاض بود
شده دائمنا پیرِ مصطفیٰؒ
میاں مخالف بُریده بگو
ادیاسنِ او رضی بالقضا
۱-۱۹۴۴=۱۹۴۳ء(۳)

حضرت سید محمد راشدؒ (م،۱۲۳۳ھ/۱۸۱۸ء) کے کئی خلفاء تھے،

(۱) محمد حسین مہیسرؒ

(۲) خلیفہ سوئی (جن کے سلسلے میں بھرچونڈی اور پھرامروٹ والے بزرگ ہوئے۔)

(۳) خلیفہ محمودؒ (قریہ گنور خاں)

(۴) میرپور ماتھیلو کے خلیفہ (ان سے اس علاقے میں بڑا فیض پہنچا)

(۵) نبی بخش لغاریؒ مٹھی والے (جن کے سلسلے میں کچھ اور کاٹھیاواروالے بزرگ ہوئے)

(۶) گل محمد ہالائی (مصنف دیوان گل) (قدوسی صفحہ ۲۷۱-۲۷۲ پر تفصیلی حالات درج ہیں)

سید محمد راشدؒ نے اپنے مکتوبات کا ایک مجموعہ یادگار چھوڑا ہے، یہ مکتوبات اُن کے اٹھارہ شاگردوں اور دوستوں کے نام ہیں، ان کے ملفوظات خلیفہ محمودؒ اور خلیفہ محمود رضا نے جمع کیے تھے، مولانا مشوری صاحب نے سندھی زبان میں ترجمہ کر کے اُن ملفوظات کو شایع کیا ہے۔ اور ان کی تعلیمات خلیفہ محمود نے المحبوبیہ المحمودیہ کے نام سے جمع کی تھیں، اسی کے

آخر میں خلیفہ صاحب نے ان کے حالات بھی شامل کر دیے ہیں۔(۴)

المحبوبیہ المحمودیہ میں ایک مقدمہ ہے، اس کے بعد چھ اشغال کا ذکر ہے یعنی:

(۱) لَا اِلٰہَ اِلا اللّٰہُ

(۲) یَا رَسُوْلَ اللّٰہ

(۳) اللّٰہ ھو

(۴) لطائفِ ستہ

(۵) سلطان الاذکار

(۶) نفی اثبات۔

پھر بیس ابواب ہیں جن کے ذیل میں معرفت پر بحث ہے، ان ابواب کو حضور کہا گیا ہے، شغلِ چہارم کے ذیل میں فرماتے ہیں در تکمیلِ ہر یک لطیفہ، مریدان و مستفیضانِ اوشاں را سالہائے کثیری گذر دو مشکلہائے خطیر بلکہ اکثر را در ضبطِ اوّل دوم وسوم تمامی رسد و بعضے را کہ مستعدان با ستعدادِ قوی و ہمت عالی اند در انجذ اب جذبات علیہ و کمالات کلیہ بر ہمہ لطائف قربِ زماں حاصل می شود بیت، صوفی نہ شود صافی تا در کشد جامے، بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے۔(۵)

پھر خلیفہ محمودؒ کے ملفوظات کو محمد ملوک چانڈیوؒ نے سراج العاشقین کے نام سے ۱۲۴۴ھ/ ۱۸۰۷ء میں مرتب کیا، اس میں پہلے شجرہ قادریہ اس طرح ہے:

سید عبدالقادر جیلانیؒ

سید عبدالوہابؒ

سید نصر اللہؒ

سید صوفیؒ

سید احمدؒ

سید مسعودؒ

سید علیؒ

سید شاہ میرؒ
سید شمس الدینؒ
سید محمد غوثؒ
سید عبدالقادرؒ
سید عبدالرزاقؒ
سید حامدؒ
سید عبدالقادرؒ
سید شمس الدین محمدؒ
سید عبدالقادرؒ
سید شمس الدینؒ
سید حامدؒ (شاہ گنج بخشؒ)
سید شمس الدینؒ
سید محمد صالحؒ
سید عبدالقادر حسنیؒ
سید محمد بقا حسینیؒ
سید محمد راشدیؒ
شیخ محمودؒ

پھر سلسلۂ نقشبندیہ اس طرح درج ہے:

حضرت مجدد الف ثانیؒ
سید آدم بنوریؒ
شیخ سعدی لاہوریؒ

حاجی ایوب جمال اللہؒ

اسمٰعیل پریاں لوئیؒ

سید محمد بقاؒ

شیخ محمودؒ

اس کتاب میں ایک سو اکیس اوراق ہیں ہر صفحے میں تیرہ سطریں ہیں اور ہر سطر میں عموماً تیرہ الفاظ ہیں ورق ۸۳ (الف) میں آپ نے وحدۃ الوجود الشہود کو ترجیح دی ہے، اور یہی تعلیم انھوں نے اپنے شیخ سے پائی تھی، ورق ۴۳-۴۴ کی ایک عبارت اس اس طرح ہے:

می فرمودند کہ حقیقتِ نماز جذبہ بصیرتِ دل میسر نمی شود وہائے ہائے می کردند و گریستند و می فرمودند کہ ہیہات، ہیہات بر حالِ ماست ہمہ عمر بر حرفہائے کاغذ صرف ساختم بلکہ آنہم بدست نیامدہ و اگر بیامد تا ہم چہ سود دارد و این ہم فرمودند کہ از قلم و سیاسی، کاغذ سیاہ می شود و دلہائے سیاہ ما راچہ طور روشنائی دہد و این بیت می فرمودند:

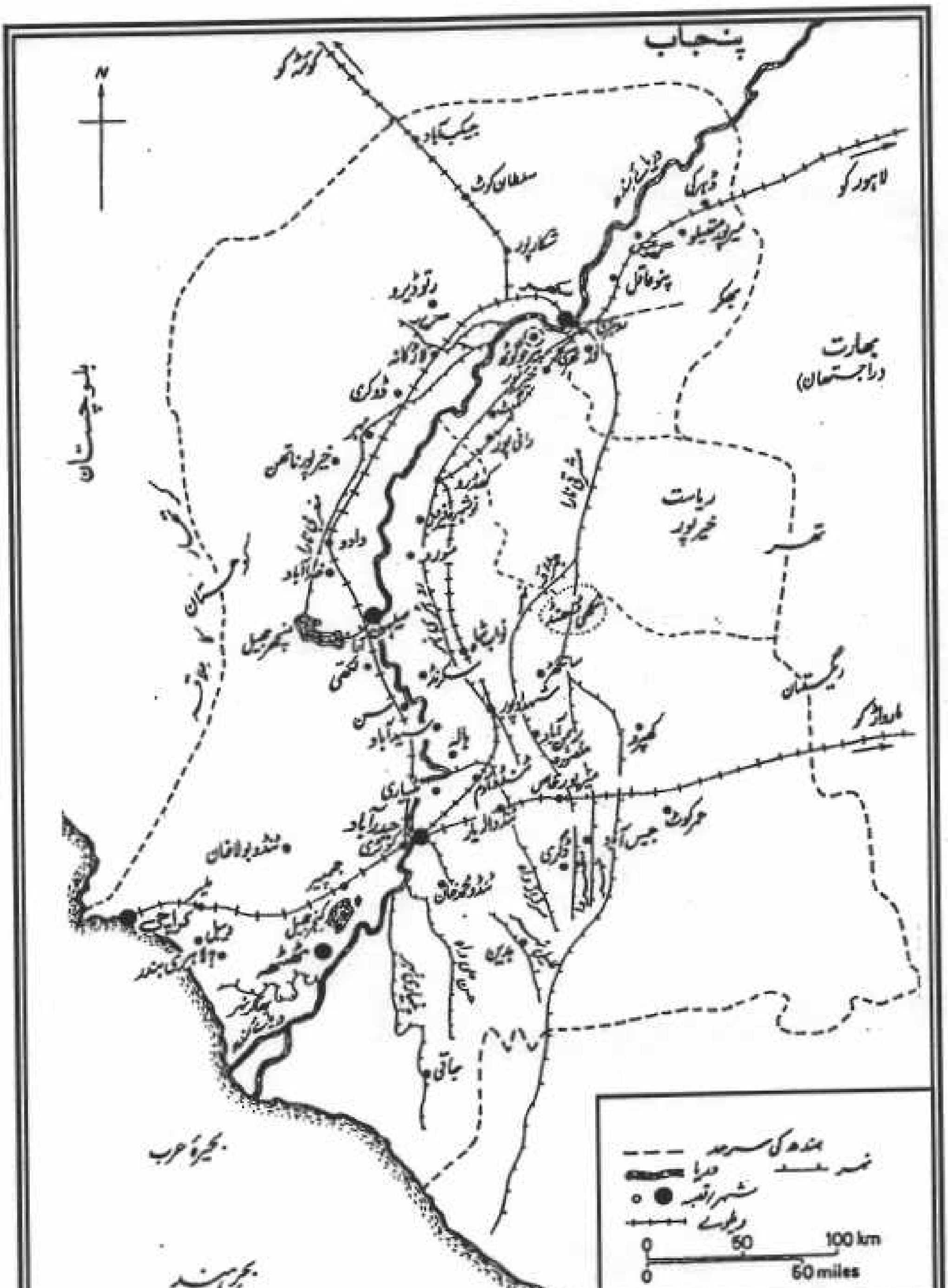
حرف کو کاغذ سیاہ کند

کہ دلِ تیرہ راچو ماہ کند

اے عزیز حضرتِ شیخ ما ادام اللہ تعالیٰ برکاتہ علینا را بدونِ گریہ و بجز آہ ہیچ سرمایہ نبود و در آن زمان اکثر از لسانِ گوہر نشانِ خود ایں الفاظ تکراری فرمودند کہ اے یاران والے برادران بگریز سوئے صاحبدلے کہ از صحبتِ اوحلاوتِ ایمان بدست آید می فرمودند کہ امروز احوالِ خلق و قوتِ ایشان خرج در خفتن و خوردن و آشامیدن و پوشیدن است، بیچارہ در آن حیران و پریشان می ماند تا ہم سرانجامِ این کار میسر نمی شود چرا کہ این امدادِ خالق است از دستِ مخلوق راست نیاید و ایشان را باید کہ ازیں معاملہ روے مسغود بگردانند و رجوع بسوئے خالق آرند تا نظرِ ایشان از اسباب گذشتہ بر سبب افتد راست من لہٗ المولیٰ فلہ المکل برسند و ہم در قرآن کریم نگرند کہ "نحن نرزقکم وایاہم" برائے چہ آمدہ است و این کہ سبب را گذشتہ دل بہ اسبابِ مغیشت می بندند این کار از خردمندی دور است و این بیتہا را نیز می خوانند:

ہر چہ با تو بر نیاید زیرِ خاک این ہمہ دنیا بود، نہ دین پاک

ہر چہ جز حق بسوز و غمارت کن ہر چہ جز دین، از و طہارت کن (۷)


N
پنجاب
لاہور کو
بھارت
(راجستھان)
ریاست
خیرپور
تھر
ریگستان
بلوچستان
کوہستان
سلطان کوٹ
شکارپور
دادو
حیدرآباد
کراچی
جاتی
بحیرۂ عرب
بحیرۂ ہند
سندھ کی سرحد
نہر
دریا
شہر/قصبہ
ریلوے
0
50
100 km
0
60 miles

سندھ کا نقشہ

حواشی

(۱) غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر۔ ''سندھ میں نقشبندی اولیاً'' غلام مصطفیٰ اکیڈمی پاکستان، حیدرآباد۔ کراچی، ۲۰۰۲ء (صفحہ نمبر: ۹ تا ۱۰)

(۲) سارا انصاری ''سندھی پیر اور برطانوی راج''، فکشن ہاؤس۔ ۱۸، مزنگ روڈ، لاہور۔ مطبوعہ: ۱۹۹۶ء (صفحہ نمبر: ۲۶ تا ۳۱)

(۳) کلیاتِ ادیب، (حیدرآباد ۱۹۶۵ء صفحہ۔ ۷۷)

(۴) ان کے متعلق دیکھیں رسالہ ''صحیفہ'' (لاہور جنوری، ۱۹۷۳ء)

(۵) حضرت سید محمد راشد روضے دھنیؒ کے مکمل حالاتِ زندگی اس مقالے میں اپنے مقام پر ملاحظہ فرمائیں۔

(۷) غلام مصطفیٰ خاں، ڈاکٹر۔ ''سندھ میں نقشبندی اولیاً'' غلام مصطفیٰ اکیڈمی پاکستان، حیدرآباد۔ کراچی، ۲۰۰۲ء (صفحہ نمبر: ۲۱ تا ۲۲)

باب دوم

''پیر جو گوٹھ'' کا مختصر تعارف

سندھ میں آباد قدیم خاندان میں سے تاریخی ،تہذیبی ،دینی ،روحانی ،سیاسی اور ادبی تاریخ کا ایک سنہری باب ''پیر پگارو'' خاندان ہے۔ جس میں ایسے جید علماءٗ ،فضلاء پیدا ہوئے ،جن کی حیات اور علمی کارناموں کے صرفِ نظر ممکن نہیں ،اس طرح اس خاندان میں بہادر و شجیع سپہ سالار بھی پیدا ہوئے۔ جو اسلامی فکر کے پاسبان اور دینی تعلیم کے ترجمان کہے جاسکتے ہیں ،انھوں نے سکوں کے خلاف ایک منظم تحریک چلائی جو تاریخ کا روشن حوالہ اور اس خاندان کا تابناک پہلو ہے،اور پاکستان کی سیاسی تاریخ میں اس خاندان کا نمایاں حصہ ہے۔ یہ خاندان ایک طرف تو سندھ کی روایتی تہذیب کا پاسبان بھی ہے اور دوسری طرف مسلم طرزِ فکر کا علم بردار بھی رہا ہے جس کی تاریخ بہت قدیم ہے اور اس کے گہرے نقش آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ اگر چہ بدلتی ہوئی دنیا اور تیز رفتار زمانے نے اس گوٹھ اور خاندان پر بھی نمایاں اثر ڈالا ہے لیکن ان کے اجداد کی تہذیبی زندگی اسلامی فکر اور دینی خدمات ایسی رہی ہیں جو ایک تبلیغ اور رجحان بن کر دور دراز علاقوں تک پھیل گئی ہیں اور آج بھی کم وبیش اسی تحریک اور طریق پر دینی اور علمی کام ان علاقوں میں جاری ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے پیر جو گوٹھ میں پگارا خاندان نے دینی اور علمی خدمات کی جو داغ بیل ڈالی تھی وہ آج بھی ثمر بار اور برگ آور ہے۔

اس خاندان کے نمایاں افراد آج جہاں آباد ہیں وہ ''پیر پگارو جو گوٹھ'' ہے۔ (اردو میں ''پگارا'' اور سندھی میں ''پگارو'' کہا جاتا ہے لہٰذا ہم اس مقالے میں ان دونوں الفاظ کا استعمال کریں گے۔) ضلع خیر پور کے مغرب میں دس میل دور آباد ہے، یہ علاقہ پیر علی گوہر شاہ اوّل (م ۲۸، اپریل، ۱۸۴۷ء) بنگلہ دھنی کے عہد میں آباد ہوا تھا۔ اس علاقے کو ابتداً میں ''بادشاہ پور'' کے نام سے پکارا جاتا تھا، بعد میں کنگری اور اس کے بعد ''پیر جو گوٹھ'' کے نام سے مشہور ہوا، اب بعض لوگ صرف ''پیر گوٹھ'' سے بھی پکارتے ہیں۔ تبسم چودھری نے اپنی تصنیف تذکرہ ''پیر پگارا'' کے صفحہ '۹۹' پر لکھا ہے ''پیر گوٹھ میں پہلے پیر حزب اللہ شاہؒ آکر آباد ہوئے تھے، ان کے آباد ہونے کے بعد یہ پیر گوٹھ کے نام سے مشہور ہوا۔''

اس سے پہلے پگارو خاندان رحیم ڈنو کلہوڑا، دیھ فرید پور میں آباد تھا، جس کو پرانی درگاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ چوں کہ اس خطے کو عموماً سیلاب کا خطرہ لاحق رہتا تھا، اس خطرے کے پیش نظر پیر علی گوہر شاہؒ پیر پگارو (م، ۱۸۴۷ء) نے اس نئی درگاہ کو آباد کیا، اس کا مختصر ذکر ''خان خداداد خاں'' کے یہاں اس طرح ہے۔

> ''علی گوہر شاہؒ، ۶ ربیع الاوّل، ۱۲۵۰ھ میں اس نئی درگاہ کو آباد کیا اور یہیں اپنے دادا پیر (روضہ دھنی) جن کے نام سے راشدی خاندان مشہور ہے کو دفن کیا، جب کہ اس سے پہلے رحیم ڈنو کلہوڑا میں مدفون تھے،

> پیر محمد راشد، ۱۱۷۰ھ میں کوٹ رحیم ڈنو کلہوڑا میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد حضرت محمد بقاء شہید اپنے آبائی گاؤں رسول پور (چھوٹی سائیڈی) سے ہجرت کر کے رحیم ڈنو کلہوڑا میں آباد ہوئے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش، ۱۱۳۵ھ ہے۔ آپ نے پنجاب کی دیہہ سوڈھانی ضلع جھنگ میں پیر عبدالقادر حسینی جیلانی سے بیعت کی تھی۔ آپ کی تاریخ شہادت، ۱۱۹۸ھ ہے آپ کا مزار خیر پور کے مشہور قبرستان شیخ طیب میں ہے۔ ایک روایت کے مطابق سید محمد بقاؒ شہید کے چار صاحب زادے تھے۔ سید محمد راشد شاہ، سید عبدالرسول شاہ، سید محمد وسیم شاہ، اور علی مرتضیٰ شاہ (لیکن) دوسری روایت کے مطابق آپ کے اٹھارہ فرزند تھے۔ آپ کے چھوٹے فرزند محمد راشد تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش، ۱۱۷۰ھ ہے۔ آپ ''روضہ دھنی'' کے لقب سے مشہور ہیں (۱)

روضہ دھنی سے مراد ہے روضے والا یا جس کا روضہ ہے۔ پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ نے شکار پور (سندھ) اور کوٹڑی کبیر میں تعلیم حاصل کی۔ آپ کے ہم درس ساتھیوں میں سید عاقل شاہ گیسوئے دراز اور مخدوم محمد راؤد بہت مشہور بزرگ اور اکابرین تھے۔

(۱۱) لکعلوی ولکیاری:

ان بزرگوں میں سے ابتدائی بزرگوں کے نام کے ساتھ لکیاری یا لکعلوی بھی پکارا جاتا ہے دراصل سندھی زبان میں ''لک'' اس خوبصورت و دل کشا وادی کو کہتے ہیں جو دو پہاڑوں کے درمیان آباد ہو، چوں کہ سید علی مکیؒ یہاں ہجرت کر کے تشریف لائے تھے اور یہاں تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا تو آپ نے پرگنہ سیوستان ضلع دادو میں ''بھگے ٹوڑھے'' نامی

پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے ایک پر فضا مقام پر رہائش اختیار کی، اسی لیے یہ گاؤں آگے چل کر آپ کے نام سے ''لک علوی'' کے نام سے مشہور ہوگیا۔ بعد میں استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ لفظ ''لکیاری'' بن گیا اور محمد بقا صاحب مرحوم کی اولاد ''لکیاری سادات'' کے نام سے معروف اور مشہور ہوگئی۔ (۲)

(III) ''پیر پگارو'' کی وجہ تسمیہ

تاریخی اہمیت کا حامل یہ خاندان جو آج ''پیر پگارو'' کہلاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ اس طرح ہے کہ حضرت پیر محمد راشدؒ المقلب بہ روضے دھنی (م ۴ جون، ۱۸۱۸ء مطابق یکم شعبان، ۱۲۳۳ھ) کے وصال کے بعد ان کے صاحب زادے پیر صبغت اللہ شاہ اوّل (م ۸ فروری، ۱۸۳۱ء) مسند نشیں ہوئے۔ اور دستار سجادگی ان کے سر باندھی گئی۔ یہ اس خاندان کے پہلے پیر ہیں جو پگارو کہلائے۔ پگارو، یعنی ''پگڑی والا'' (پگ والا) اس لیے آپ کو ''پگارو'' کہا گیا، اس بعد سجادگی کے منتقل کرنے کی یہی روایت قائم ہوگئی، اور ہر دور میں یہ روایت برقرار رہی، باقاعدہ لفظ ''پگارو'' کے رائج ہونے کے بعد سے اس وقت ساتویں نسل اس لقب سے پہچانی جاتی ہے۔ اور ساتویں ''پیر پگارو'' سید سکندر علی شاہ المقلب بہ شاہ مردان شاہ ثانی ہیں، عام طور پر آپ کو ''پیر پگارو'' ہی کہتے ہیں، اس خاندان کا شجرہ نسب تو آگے بیان کیا جائے گا لیکن یہاں اجمالاً ''پیر پگارو'' حضرات کے اسمائ بیان کیے جاتے ہیں، تاکہ اس خاندان کا تسلسل ظاہر کیا جا سکے۔

''پہلے پیر پگارو''	سید صبغت اللہ شاہ المعروف بہ پیر پگاروؒ (م ۵ رمضان المبارک ۱۲۴۶ھ مطابق ۸، فروری، ۱۸۳۱ء)
''دوسرے پیر پگارو''	سید علی گوہر شاہ اوّلؒ المقلب بہ بنگلے دھنی (م ۱۱ جمادی الاوّل ۱۲۶۳ء مطابق ۲۸، اپریل، ۱۸۴۷ء)
''تیسرے پیر پگارو''	سید حزب اللہ شاہؒ المقلب بہ دھنی (م ۲ محرم، ۱۳۰۸ھ مطابق ۲۱، اگست، ۱۸۹۰ء)
''چوتھے پیر پگارو''	سید علی گوہر شاہ ثانیؒ المقلب بہ تخت دھنی (م ۰ محرم، ۱۳۱۴ھ مطابق ۶، ۱۸۹۶ء)

''پانچویں پیر پگارو''   سید علی گوہر شاہ مردان شاہ اوّل المقلب بہ کوٹ دھنی (م ۷ ربیع الاوّل

۱۳۴۰ھ مطابق ۹ نومبر ۱۹۲۱ء)

''چھٹے پیر پگارو''   سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ المقلب بہ پگ دھنی (م ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء)

(یہ موجودہ پیر پگارو، سید سکندر علی شاہ المقلب بہ شاہ مردان شاہ ثانی کے والد تھے۔)

اب جیسا کہ پیر پگارو بزرگوں کے اسمأ کے ساتھ بنگلہ دھنی، تخت دھنی، یامحھ دھنی دیکھا گیا ہے، تو بے محل نہ ہوگا اگر یہاں ان لاحقوں کے معنی یا مراد بیان کردی جائے۔

''روضے دھنی''	یعنی روضے والا
''پاگارو''	پگڑی والا
''بنگلے دھنی''	بنگلے والا
''تخت دھنی''	تخت والا
''محھ دھنی''	پالکی والا
''کوٹ دھنی''	فصیل والا
''پگ دھنی''	صاحب دستار

یہ بزرگ آج بھی ان القابات سے یاد کیے جاتے ہیں لیکن اب ''پیر پگارو'' لفظ اس خاندان کی اصل پہچان ہے۔ اوران کے مریدین ''حُر'' کے نام سے یاد سے کیے جاتے ہیں ۲ پیر صبغت اللہ شاہؒ نے انگریزوں کے خلاف بالعموم اور سکھوں کے خلاف بالخصوص مجاہدین تیار کیے تھے۔ اس کام کی تفصیل سید صبغت اللہ شاہ المعروف بہ پیر پگارا (م ۱۸۳۱ء) کے باب میں بیان کی جائے گی مختصر عرض ہے کہ شاہ صاحب مرحوم نے ان مجاہدین کو جہاد کے لیے تیار کیا تھا اور انھیں ''حُر'' کہا گیا تھا۔ ان کا نام حضرت حرؓ کی رعایت سے رکھا گیا۔ جنھوں نے میدانِ کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کی جانب سے یزید کی فوجوں سے لڑتے ہوئے جامِ شہادت نوش کیا تھا۔ اس طرح یہ مریدین آج بھی حُر کہلاتے ہیں۔ ان مریدین میں ایک نعرہ ''بھیج پگارو'' بہت مقبول ہے۔ جس کی وجہ تسمیہ، خداداد خاں اس طرح بیان کرتے ہیں۔

''حر مجاہدین کا خاص نعرہ جو دو الفاظ بھیج پگارو'' سے بنا ہے۔ بھیج کے معنی ہیں ''بھیجئے'' حر جماعت کے یہاں اس نعرہ کا مطلب ہے کہ اے پروردگار حضرت پیر سائیں پگارو کو ہمارے پاس بھیجئے۔ سندھ میں یہ لفظ بھیج اس وقت عموماً استعمال کیا جاتا ہے جب مطلع ابر آلود ہو اور بارش مطلوب ہو اس وقت بھی بھیج کا نعرہ لگایا جاتا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ اے پروردگار بارانِ رحمت کو ہمارے پاس بھیجئے (۳)

پگارو خاندان کے حر مریدین، مجاہدین نے بھی اسلام کی تبلیغ اور اس کی حفاظت میں نا قابلِ فراموش کردار ادا کیا ہے۔ اس لیے یہاں ان مریدین کی جاں بازی سرفروشی اور اسلام کے لیے ان کی خدمات کا سرسری جائزہ پیش کرنا ضروری ہے۔

(IV) حروں کی خدمات اور حروں کا پس منظر:۔

پہلے تو حروں کا پس منظر یہاں بیان کرنا ضروری ہے لیکن اس سے پہلے یہ بتانا لازمی ہے کہ تحقیق کا مطلب ہی ''تلاش'' کے ہیں، بعض مورخین نے بلا تحقیق چند ایسی باتیں محض قیاس کی بنیاد پر لکھ دیں کہ اس سے اصل بات اور حقیقت یا تو پس منظر میں چلی گئی یا پھر اس میں کسی قدر تبدیلی پیدا کر دی گئی ہے۔ یہی صورتِ حال حروں کی تاریخ یا اس کے پس منظر سے متعلق بھی کہی جاسکتی ہے۔ اس میں بھی بعض جگہ محض قیاس سے کام لیا گیا ہے، ہم یہاں چند ناقدین اور مورخین کی آراٗ پیش کرتے ہیں اس کے نتیجہ برآمد کرنے میں آسانی رہے سب سے پہلے خان خداداد خاں کی تصنیف ''لب تاریخ سندھ'' سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں۔

> حُر (جو عربی بل کہ ترکی لفظ ہے) سے مراد دراصل وہ پہلوان صادق ہے جو کربلا کے میدان میں حضرت حسینؓ کی طرف سے لایا ہوا شہید ہو گیا تھا''۔(۴)

سندھ کے معروف ادیب دانش ور اور محقق مرزا قلیچ بیگ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

> ''پیر محمد راشد کی وفات کے وقت دستار خلافت پر جھگڑا ہوا، لیکن انھوں نے اپنے لیے صبغت اللہ کو وارث بنایا، جنھوں نے دریائے نارہ (مہران اصغر) کے آس پاس بہت سے مرید کیے۔

دوسرے بھائیوں نے ان کو (پیر صاحب) کو مارنے کی کوشش کی لیکن ان کے مریدوں نے باہم اتفاق کر کے یہ طے کرلیا کہ اپنے پیر صاحب کے علاوہ ان کے کسی رشتہ دار یا بھائی کی یعنی کسی کی بھی فرماں برداری نہیں کریں گے۔ اس نمک حلالی اور جاں نثاری کی وجہ سے پیر صبغت اللہ نے ان کو حر کا نام دیا، یہ مناسبت اس حضرت حُرؓ سے تھی جنھوں نے حضرت امام حسینؓ کی خاطر کربلا میں قربان کیا تھا"۔ (۵)

ان دونوں خیالات یا رجحانات سے قدرے مختلف بات ڈاکٹر نبی بخش بلوچ صاحب نے کی ہے، اور فارسی میں ''لُبِ تاریخ سندھ'' کے صفحہ نمبر ۲۵۵، پر حواشی میں درج کی ہے۔ جسے تبسم چودھری نے اپنی تصنیف ''تذکرۂ پیرانِ پاگارا'' کے صفحہ ۱۲۲، پر اردو میں اس طرح بیان کیا ہے۔

''حروں کا آغاز سندھ میں اس طرح ہوا کہ اٹھارویں صدی میلادی میں جب مغلوں کی حکومت کو زوال آیا، اور مسلمانوں کی قوت کا شیرازہ بکھر گیا تو غیر مسلموں میں سے مہاراشٹر کے مرہٹے اور پنجاب میں کام یاب ہو گئے۔ انیسویں صدی میلادی میں سکھوں نے سارے پنجاب پر قبضہ کرلیا اور شمال مغربی علاقوں پر لشکر کشی شروع کردی حتیٰ کہ پشاور کو تخت وتاراج کردیا، اور اس بات کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا کہ پختون اور افغان قبائل جو سارے ہندستان کے مسلمانوں میں اپنی بہادری کی وجہ سے ضرب المثل تھے، ان سے مغلوب ہو جائیں۔

یہ صورت دیکھ کر مجاہد اعظم حضرت سید احمد شہیدؒ کو جوش آیا اور انھوں نے غیرت دینی و حمیت ملی کے جذبات سے سرشار ہو کر سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا، اور اپنے رفقا اور غازیوں کی جمعیت کے ساتھ پشاور کی طرف عزم سفر کیا، چوں کہ اس وقت پنجاب سکھوں کے قبضے میں تھا۔ اس لیے سید احمد شہیدؒ راجپوتانہ کی راہ سے سندھ میں وارد ہوئے، حیدرآباد شہر میں تالپور حکمرانوں نے ان کی خاطر مدارات کی اور ان کے شایان شان مہمان نوازی کا ثبوت دیا لیکن سکھوں کے خلاف جہاد میں معاونت کرنے سے معذوری ظاہر کی، مبادا رنجیت سنگھ حاکم پنجاب نے اس سے ناراض ہو کر سندھ پر حملہ کردے۔

سید احمد شہیدؒ حیدرآباد سے رخصت ہو کر شمالی سندھ میں حضرت پیر پاگارو (صاحب دستار

وکلاء) سید صبغت اللہ بن مرشد امام حضرت پیر محمد راشدؒ کے پاس پہنچے اور ان سے ملاقات کی حضرت پیر صبغت اللہ شاہ حریت پسند مومن تھے۔ اس لیے انھوں نے دینی حمیت کے تقاضوں کا احساس کرتے ہوئے حضرت سید شہیدؒ سے جہاد کے معاملے پر کاملاً اتفاق کیا اور دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ جہاد کر کے شمالی ہند کے مسلمانوں کو سکھوں کی غلامی سے نجات دلائی جائے، چناں چہ سندھ میں بھی ایک عظیم مہم کا آغاز کیا گیا اور مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی جانے لگی۔ درزیوں کے ایک طائفہ کو بلا کر حکم دیا کہ مجاہدین کے لیے جنگی لباس تیار کریں اور اپنے مریدوں اور جاں نثاروں کی ایک جماعت کو حضرت سید شہیدؒ کے ہم رکاب کر دیا، یہ پہلی جماعت تھی جو حروں یعنی احرار کے نام سے موسوم ہوئی۔'' (۶)

اس جماعت کو منظم کرنے میں بھی پیر صبغت اللہ شاہؒ پگارو کا بڑا دخل رہا کیوں کہ آپ کی شخصیت کی کشش اور خدمات کا اثر ان کے اخلاص کی وجہ اور نیک نیتی کا اثر تھا کہ اس جماعت میں اضافہ روز بروز بڑھتا چلا گیا آپ نے حروں کی ایک جماعت سید احمد شہیدؒ کے ہمراہ بھی روانہ کی اس عمل سے دیگر افراد میں بھی جذبہ جہاد اور جوشِ شہادت پیدا ہوا، ادھر شاہ صاحبؒ کی اپیل تھی جس سے پروانہ وار لوگ اس جہاد میں شرکت کرنے شامل ہوتے چلے گئے، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ مزید لکھتے ہیں:

''قاضی عثمان السندھی جو شعر کانیؒ کے شاگردوں میں سے تھے اور محمد بن عبدالوہاب کی تعلیمات سے متاثر تھے واپس اپنے وطن آ گئے اور حروں کے ایک طائفہ میں مجاہدانہ طور پر شرکت کی اس عالم حق کے اسلحہ جنگ میں سے اور ایک خنجر ابھی تک ان کی اولاد کے پاس محفوظ ہے اور ان کی کتابوں میں ایک قلمی نسخہ جو امام ابن سمیہؒ کے رسائل پر مشتمل ہے۔ (جن میں سے بعض ابھی طبع نہیں ہوئے) سندھ یونیورسٹی جامشورو کی لائبریری میں موجود ہے۔ (۷)

تاریخ گواہ ہے کہ اوّل اوّل سید احمد شہید کو اپنے مقصد میں نمایاں کامیابی اور کامرانیوں میں جہاں برصغیر کے دیگر علاقوں کے لوگوں کی قربانیاں شامل ہیں۔ وہاں حروں کے جذبہ جہاد کو بھی بڑا دخل ہے، جس نے مردانہ وار اس محاذ پر دشمنانِ اسلام کا مقابلہ کیا بالآخر ذی قعدہ، ۶ ۱۲۴۶ھ میں سید احمدؒ نے جام شہادت نوش کیا (۸)

مناسب ہے کہ ہم یہاں سارا انصاری کی اس تحقیق سے بھی استفادہ کریں جو انھوں نے حروں سے متعلق اپنی

تصنیف میں پیش کی ہے، اس موقع پر بے محل نہ ہوگا کہ ہم مذکورہ کتاب سے ایک طویل اقتباس پیش کریں:

''سندھ میں انگریزی نظام تسلط میں مقامی معاونین کا اہم کردار دو واقعات سے واضح ہوتا ہے، دونوں میں پیر صاحبان ملوث تھے، اول ۱۸۹۰ء میں حروں کی بغاوت اور دوم ۲۳-۱۹۱۹ء کی تحریر خلافت دونوں دفعہ تسلط کے نظام کی بدولت سرکار کو آزمائش میں سے گزرنا پڑا۔ اور دونوں دفعہ سرکار سرخ روح ہو کر امن وامان قائم کرنے میں کامیاب ہوئی، یہ دونوں بحران ان پیچیدہ تعلقات کو بھی منظرِ عام پر لاتے ہیں جو ایک طرف پیروں اور ان کے مریدوں اور دوسری طرف حکومت کے درمیان تھے، پیر صاحب سرکار اور عوام میں رابطہ کی حیثیت رکھتے تھے لیکن وہ کلی طور پر آزاد نہ تھے انھیں دونوں جانب سے دباؤ برداشت کرنا پڑتا تھا... حر، پیر پگارا کے نہایت وفادار مرید تھے ان کی جاں نثاری کا مقابلہ نہ تو گدی کے دسرے مرید اور نہ ہی دوسرے پیروں کے مرید کر سکتے تھے۔ ۱۸۹۰ء کے عشرے کے دوران جب حالات بگڑے تو پیر صاحب کو یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگیا کہ کس کا ساتھ دیں، ایک طرف حروں کی وفاداری اور جاں نثاری تھی اور دوسری طرف سرکار کا دباؤ۔

۱۸۸۰ء کے دھائی کے آخر میں چند حر گروہ کی وجہ سے ۱۸۹۰ء کی دھائی تک انگریزوں کی نظر میں حر جرائم پیشہ دکھائی دینے لگے، شروع میں تو یہ گروہ خاموش تھا لیکن ۱۸۹۴ء کے شروع میں دوبارہ سرگرم ہوگیا، اس دفعہ اس کو ہاریوں سے لے کر زمینداروں تک حر برادری کی کم وبیش حمایت حاصل تھی... حالات سے نمٹنے کے لیے انگریزوں نے مسلح اور گھڑسوار پولیس کی تعداد میں اضافہ کر دیا، اور ان گاؤں میں پولیس چوکیاں قائم کردیں جہاں حر اور ان کے معاونین کے رہنے کا شبہ تھا۔ ان چوکیوں کا خرچ بھی وہاں کے باشندوں پر ڈال دیا گیا، ضلع تھر پارکر میں حر آبادی کو پچاس ہزار روپے دینے پڑے اور ضلع حیدرآباد، ڈھائی لاکھ روپیہ حر ایک حر زمیندار کو معاملہ کے برابر 'خرچہ' ادا کرنا پڑا۔ بڑے بڑے حر زمینداروں کو ہزار روپیہ سالانہ سے زائد ادا کرنا پڑا، جب انگریز نے دیکھا کہ مزید پولیس سے بھی حالات قابو میں نہیں آئے تو سرکار نے فوج کی مدد طلب کی اور تین پیادہ اور ایک گھڑسوار دستے کو متعین کر دیا۔ لیکن چوں کہ یہ فوجی اس علاقہ سے ناواقف تھے، حکومت کو ان پر بالا

دستی حاصل نہ ہوئی۔

انگریز کو اپنی دشواری اور کمزوری کا بخوبی احساس تھا، ان کی نظر میں یہ شورش عام چوروں اور ڈاکوؤں کے حملے نہ تھے، بلکہ مذہبی جذبہ سے سرشار باغیوں کا کاروائی تھی، جس میں قتل اور بدلہ کولوٹ مار فوقیت حاصل تھی، ویسے تو ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے مقابلے میں سندھ میں پیشہ ورانہ جرائم کم تھے، لیکن حروں کے سلسلہ میں مذہبی جوش و جذبہ اور پیر کے ساتھ روحانی رابطہ کارگر تھا۔ البتہ حروں کے معاملہ میں کچھ فرق تھا جیسا کہ بیان کیا گی اہے، حروں کی سرکشی کی بناء پیر سے انتہائی درجہ کی وفاداری تھی، وہ سرکار کے کسی اخلاقی یا مادی دباؤ میں آنے والے نہ تھے، لہٰذا افسران نے امن وامان قائم رکھنے کی خاطر پیر پگارو کے اثر ورسوخ پر انحصار کرنے کا ارادہ کیا، انہیں یقین تھا کہ وہ (پیر صاحب) اپنے مریدوں کو پرامن زندگی گزارنے کی تلقین ضرور کرسکتے ہیں، اس یقین کی بناء پر ایک طرف پیر صاحب کے تعلقات اور دوسری جانب پیر صاحب اور انگریز سرکار کے پچھلے پچاس سالہ تعلقات تھے۔

حالات سے نمٹنے کے لیے انگریز افسران نے حروں کے متعلق جائزے اور فہرستیں مرتب کیں، تاکہ حکومت معاملے کو بخوبی سمجھ سکے اور جان لے کہ وہ کن کن حالات سے نبردآزما ہے، ایسا کرنے سے بہت جلد واضح ہوگیا کہ حر جماعت دراصل پیر پگارا کے تمام مریدوں کی تعداد کا نہایت اہم حصہ تھے، ۱۸۹۰ء میں پیر پگارا کے کل مرید دولاکھ سے زائد تھے، حر فرق جمعیت کے نام سے بھی منسوب تھے، اکثر مسلم جمعیت یا سلیمی کہلاتے تھے، سلیمی گدی نشین کی تعظیم تو کرتے ہی تھے کیوں کہ ان کے نزدیک وہ سابقہ پیروں کی اولاد ہونے کی حیثیت سے قابلِ تعظیم تھے، حر فرق جمعیت یا فرق والے صرف پیر پگارا کی تعظیم کرتے تھے، ان کے نزدیک پیر پگارا کو خدا کا قرب حاصل تھا۔

شہادتوں سے واضح ہوا کہ باہمی اتفاق اور تعاون سے حر ایک مضبوط برادری کی شکل اختیار کرگئے، ان کے کھانے پینے اور میل ملاپ، رہن سہن کے خاص ضوابط تھے، جن کا وہ بہت خیال رکھتے تھے۔ مثلاً غیر حروں کے ساتھ کھانے پینے سے گریز، سبز رنگ کا لباس پہنا، پگڑی خاص طرز سے

باندھنا، صرف پیر صاحب سے مصافحہ کرنے کے لیے دایاں ہاتھ بڑھانا اور انہیں با آواز بلند سلام کرنا۔ ان کی وفاداری کی شدت اس وقت محسوس ہوتی جب وہ پیر صاحب کی زیارت کے لیے حاضر ہوتے۔

سندھ کے علاقے میں جہاد پیروں اور صوفیاء کی معمول سے زیادہ تعظیم کی جاتی تھی ایسی پر زور وفاداری انگریزوں کی نظر میں غیر معمولی تھی، ان کے حروں کا موازنہ یا مقابلہ آغا خان اور ان کے پیروکار سے کیا جانے لگا۔ ایک رائے کے مطابق حروں کی ابتداء اس وقت ہوئی جب ۱۸۱۸ء مین پیر محمد (راشدؒ) کی وفات پر گدی کی وراثت کا مسئلہ اٹھا اور ایک گروہ نے ان کے وارث کی بھرپور حمایت کی وہ حر کہلائے اور موجودہ خاص تعلق کی بنیاد بھی اس وقت پڑی۔ دوسری روایت کے مطابق حر اُن مریدوں کی ایک چھوٹی جماعت تھی جن کو پیر صبغت اللہ نے ۱۸۲۰ء اور ۱۸۳۰ء کی دھائی میں سید احمد بریلوی کی کمک کے لیے چنا تھا۔ اس جماعت یا دستے کو حر کا خطاب دیا گیا تھا، اس وقت سے اب تک وہ نسل در نسل پیر صاحب کے احکامات پر کاربند ہیں۔

گدی نشین سے غیر معمولی وفاداری اور وابستگی نے حروں کو باقی ماندہ مریدوں سے علاحدہ ایک نمایاں مقام دیا، اسی طرح پیر پگارا کا ہمیشہ خیال رکھنے سے برادری میں توسیع بھی ہوئی، اور ان کی وجہ سے گدی کی وقار میں اضافہ بھی ہوا۔ یہاں تک کے چوتھے سجادہ نشیں پیر حزب اللہ شاہ کے طویل دور میں جو ۱۸۵۰ء کے عشرہ سے ۱۸۹۰ء کے عشرہ تک تھا، مریدوں کی تعداد بہت بڑھ گئی اور ساتھ ساتھ گدی کا وقار بھی۔ نتیجتاً مریدوں کی اہمیت میں بھی اضافہ ہوا، وقت کے ساتھ ساتھ نارا کا مشرقی حصہ اور تھرپارکر کے مغربی علاقے میں لوگوں کو خوش حالی نصیب ہوئی، یہاں حروں کی اکثریت آباد تھی، شروع شروع میں یہاں لوگوں کا ذریعہ معاش گلہ بانی اور نام کی کھیتی باڑی تھا، حالات غیر یقینی تھے انہیں حالات نے لوگوں کو گدی سے وابستہ کیا تھا، نہروں کا نظام اپنے ساتھ خوش حالی لایا اور رفتہ رفتہ یہ لوگ چھوٹے زمیندار بن گئے، خاص طور پر ۶۹-۱۸۶۸ء میں جب تھر کے علاقے میں قحط پڑ گیا تھا آباد ہونے والے رفتہ رفتہ مریدوں میں شامل ہو گئے، [اس دور میں پیر پگارا نے] ایک عالی شان مزار تعمیر کیا، دو بڑی مسجدیں ''آبائی گاؤں'' پیر جو گوٹھ میں، کئی قلعہ نما رہائش گاہیں تعمیر کرائیں۔''(۹)

(۷) پگارا خاندان کا شجرہ نسب

حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ

حضرت امام حسینؓ

حضرت امام زین العابدینؓ

حضرت امام باقرؒ

حضرت امام جعفر صادقؒ

حضرت امام موسیٰ کاظمؒ

حضرت شاہین رحمۃ اللہ علیہ

شاہ عبداللہ شاہؒ

شاہ ہارونؒ

شاہ حمزہؒ

شاہ عمرؒ

شاہ اسداللہ شاہؒ

شاہ زید شاہؒ

شاہ عباس شاہؒ

شاہ علی مکی لکیاریؒ (۱۰)

شاہ چھکن شاہؒ

شاہ حسین شاہؒ

شاہ محمودؒ

شاہ بہاول الدین (۱۱)

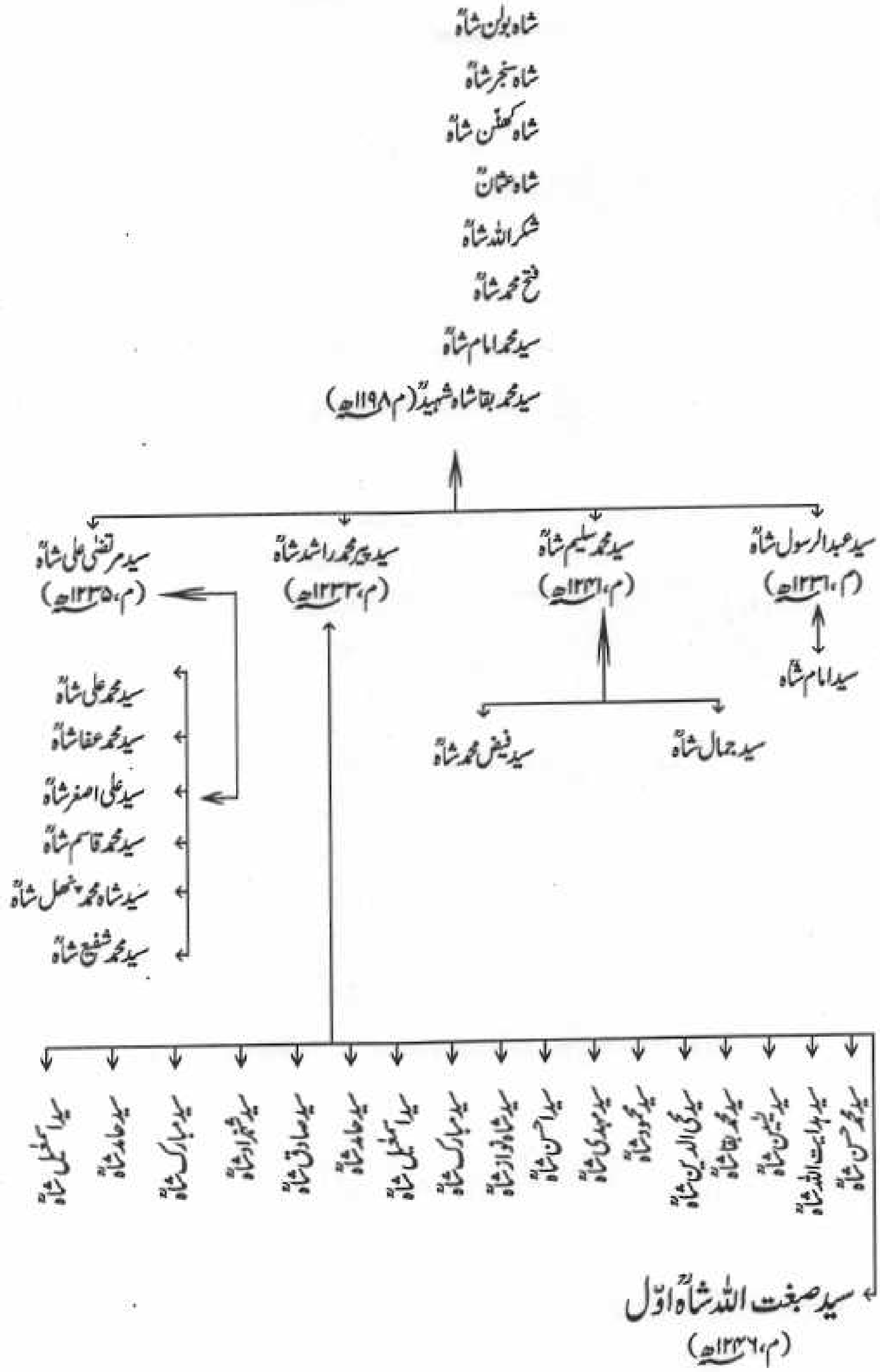
شاہ شہاب الدینؒ

شاہ فضل اللہ شاہؒ

شاہ ناصر الدینؒ

شاہ میر علیؒ

شاہ حسینؒ


شاہ بولن شاہؒ
شاہ سنجر شاہؒ
شاہ کھٹن شاہؒ
شاہ عثمانؒ
شکر اللہ شاہؒ
فتح محمد شاہؒ
سید محمد امام شاہؒ
سید محمد بقا شاہ شہیدؒ (م ۱۱۹۸ھ)
سید عبدالرسول شاہؒ (م ۱۲۳۱ھ)
سید امام شاہ
سید محمد سلیم شاہؒ (م ۱۲۴۱ھ)
سید جمال شاہؒ
سید فیض محمد شاہؒ
سید پیر محمد راشد شاہؒ (م ۱۲۳۳ھ)
سید مرتضیٰ علی شاہؒ (م ۱۲۳۵ھ)
سید محمد علی شاہؒ
سید محمد عقا شاہؒ
سید علی اصغر شاہؒ
سید محمد قاسم شاہؒ
سید شاہ محمد پنھل شاہؒ
سید محمد شفیع شاہؒ
سید محمد حسن شاہؒ
سید ہدایت اللہ شاہؒ
سید شمس شاہؒ
سید محمد بقا شاہؒ
سید محی الدین شاہؒ
سید محمود شاہؒ
سید مہدی شاہؒ
سید احسن شاہؒ
سید شاہ نواز شاہؒ
سید مبارک شاہؒ
سید اسمٰعیل شاہؒ
سید حامد شاہؒ
سید صادق شاہؒ
سید شہزاد شاہؒ
سید مبارک شاہؒ
سید حامد شاہؒ
سید اسمٰعیل شاہؒ
سید صبغت اللہ شاہؒ اوّل (م ۱۲۴۶ھ)

سید پیر صبغت اللہ شاہ اوّل (پہلے پیر پگارا)

پیدائش ۱۱۹۳ھ

وفات ۱۲۴۶ھ/۱۸۳۱ء

سید پیر علی شاہ پگارا

پیدائش ۱۲۳۱ھ

وفات ۱۲۶۳ھ

سید پیر حزب اللہ شاہ

پیدائش ۱۲۵۸ھ

وفات ۱۳۰۸ھ

سید علی گوہر شاہ ثانی

سنہ پیدائش ندارد

وفات ۱۳۱۴ھ

پیر مردان شاہ اوّل

پیدائش ۱۲۷۹ھ

وفات ۱۳۴۰ھ

سید پیر صبغت اللہ شاہ ثانی شہید

شہادت ۱۹۴۳ء

سید سکندر علی شاہ عرف شاہ مردان شاہ

موجودہ سجادہ نشین پیر پگارو

پیدائش ۲۲ نومبر ۱۹۲۸ء

حواشی

(۱) خداداخاں برکی ''پیکرِ حریت'' مطبوعہ ۱۹۸۸ء (ص ۳۲)

(۲) صاحب زادہ ابوالخیر محمد زبیر، ڈاکٹر ''سندھ کے صوفیائے نقشبند'' رکن اسلام پبلی کیشنز، حیدر آباد، ۱۹۹۷ء

(۳) خداداخاں برکی ''پیکرِ حریت'' مطبوعہ ۱۹۸۸ء (ص ۳۵)

(۴) ''لبِ تاریخِ سندھ'' ۱۳۱۸ھ مقدمہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد مطبوعہ ۱۹۸۹ء

(۵) مرزا قلیچ بیگ ''قدیم سندھ'' سندھی ادبی بورڈ حیدر آباد سالِ اشاعت ندارد

(۶) تبسم چودھری ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' جولائی ۱۹۷۵ء (ص ۱۲۱-۱۲۴)

(۷) ایضاً

(۸) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے بالاکوٹ میں سید احمد شہید بریلوی کے مزارِ مبارک پر نصب کتبے سے یہ تاریخی قطعہ اپنی ڈائری پر نوٹ کیا تھا۔ جس سے سید احمد شہید کا سالِ شہادت برآمد ہوتا ہے۔ یہ قطعہ ڈاکٹر صاحب کی تصنیف ''ابواب متفرقہ'' کے صفحہ ۱۰۱، پر درج ہے۔ چھ اشعار پر مشتمل قطعے کے تاریخی مصرے یہ ہیں۔

کاف وجا کشیدہ یوسف ''رحمت رب بود بایں مرقد''

۲۳ ۱۲ ــــ ۷۹

۲۳

۱۲۴۶ھ

(۹) سارا انصاری ''سندھی پیر اور برطانوی راج'' فکشن ہاؤس، لاہور، مطبوعہ ۱۹۹۶ء (صفحہ: ۸۳ تا ۸۶)

(۱۰) سندھ میں تشریف لانے والے اس خاندان کے یہ پہلے بزرگ تھے۔ ان کے چار بیٹے تھے، سید محمد، سید مراد، سید حاجی عرف بھرکیو اور سید جنگو اس سے چار قبیلے بن گئے یقیناً سید چھکن شاہ بھی آپ کے فرزند تھے، جن یہ سلسلہ آگے چلا، ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے اپنی تصنیف سندھ کے نقشبندی اولیاء مطبوعہ: ۲۰۰۲ء صفحہ ۱۹، پر شاہ صدر الدین کے دادا کا نام سید علی مکی بتایا ہے وہ کہتے ہیں:

> سید علی مکیؒ پہلے سید ہیں جو دادو کے قریب آباد ہوئے، اور وہاں کے راجہ اردر کی نومسلم بیٹی سے شادی کی ان کی اولاد میں شاہ صدر الدین ثانیؒ گیارہویں صدی ہجری میں تھے، ان کا مقبرہ

۱۱۵۵ھ/ ۱۷۴۲ء میں تعمیر ہوا جیسا کہ قطعۂ تاریخ میں ہے۔سالِ تاریخش بجستم از خرد ہاتفم گفتا''بہشت اہلِ بیت'' آپ کے نواسوں میں سید محمد شجاع نقشبندیؒ تھے،ان کی نرینہ اولاد میں سید محمد بقاؒ (بن محمد امامؒ بن فتح محمدؒ) رسول پور (ضلع خیر پور) میں ۱۱۳۵ھ/ ۱۷۲۳ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۱۹۸ھ/ ۱۷۹۴ء میں ظالموں نے ان کو شہید کر دیا دیہر طیب (خیر پور) میں تدفین ہوئی۔انھوں نے چشتیہ اور قادریہ سلسلوں میں بھی فیض حاصل کیا۔ پھر مخدوم محمد اسماعیل پریاں لوئیؒ (روہڑی) سے نقشبندی سلسلے میں فیضیاب ہوئے۔ ۱۱۷۴ھ/ ۱۷۶۰ء میں وفات پائی۔

(۱۱) اس شجرے میں سید فیض الدین راشدی کا مرتبہ ''راشدی خاندان جو شجرو'' (سالِ اشاعت: ندارد) سے استفادہ کیا گیا ہے جو نہایت تفصیلی شجرہ ہے۔

باب سوم

سلسلۂ تصوّف سے پگارا خاندان کی نسبت:-

پگارا خاندان کے بزرگوں کا تصوف سے گہرا تعلق رہا ہے اور ان کی تعلیمات پر تصوف کا اثر نمایاں طور پر محسوس کیا جاسکتا ہے لہٰذا ان صاحبان کی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے اور ان کی تربیت کا پس منظر دیکھنے کے لیے ضروری ہے کہ تصوف سے متعلق بھی مختصر ہی سہی گفت گو کر لی جائے۔ اور اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ تصوف کے کن سلسلوں سے ان بزرگوں کا تعلق رہا ہے۔ چناں چہ پہلے ہم یہ دیکھیں گے کہ علماً کے نزدیک تصوف کیا ہے۔

تصّوف کیا ہے:-

مختلف بزرگوں اور عالمِ دین نے تصوّف کی تعریف مختلف انداز سے کی ہے۔ اس میں امام ابوبکر بن اسحٰقؒ چوتھی صدی ہجری کے بزرگ تھے جنھوں نے صوفیہ سے عقائد اور احوال کے تعارف پر کتاب لکھی تھی اور وہ اس موضوع پر قدیم ترین کتاب سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے باب ۳۴ میں لکھا ہے:

> جنید بغدادیؒ (م، ۲۹۸ھ) فرماتے ہیں تصوّف، اوقات کی محافظت کرنے کا نام ہے اور حفظِ اوقات یہ ہے کہ بندہ اپنے حدود کے سوا کسی اور چیز کی طرف نگاہ نہ رکھے اور اپنے رب کے سوا کسی اور کے ساتھ موافقت نہ کرے اور اپنے وقت کے سوا کسی اور کا ساتھ نہ دے۔
>
> ابنِ عطارؒ (م، ۳۰۹ھ) فرماتے ہیں: حق تعالیٰ کا مطیع اور فرمابردار رہنے کا نام تصوّف ہے۔
>
> ابو یعقوبؒ (یہ ابو یعقوب نہر جوری۔ م، ۳۰۳ھ کے استاد تھے۔) فرماتے ہیں: صوفی وہ ہے جو کسی چیز کے چھن جانے سے بے قرار نہ ہو اور نہ کسی چیز کی تلاش میں اپنے آپ کو تھکائے۔
>
> کسی نے جنیدؒ سے پوچھا: تصوف کیا ہے؟ فرمایا: باطن کا حق تعالیٰ کے ساتھ پیوست ہو جانا اور یہ کیفیت صرف اس وقت حال ہوتی ہے جب نفس، روح کی قوت اور حق کے ساتھ قائم رہنے کی وجہ سے اسباب سے بے تعلق ہو چکا ہو۔

کسی نے شبلیؒ (م، ۳۳۴ھ) سے دریافت کیا: صوفیوں کو صوفی کیوں کہا گیا؟ فرمایا: اس لیے کہ انھوں نے کو موجودہ طریقوں کو اپنایا اور اپنا خاص وصف ثابت کیا۔ اگر وہ پہلے طریقوں کو مٹانے کی رسم ڈالتے تو صوفی کو رسم ڈالنے والا کہا جاتا۔ ان کو ان کے وصف کے ثابت کرنے والے نے ان رسموں سے اتارا ہے۔ شبلیؒ نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ محقق صوفی کی کوئی رسم ہوتی ہے یا کوئی وصف ہوتا ہے۔

ابو یزید طیفورؒ (م، ۲۶۱ھ) فرماتے ہیں: صوفی خدا کی گود میں بچے کی طرح ہوتے ہیں۔ (تعریف مترجم۔ لاہور، ۱۳۹۱ھ، صفحہ ۱۳۸)

امام ابوبکر بن اسحٰق نے اسی طرح دوسرے بزرگوں کے اقوال نقل کیے ہیں۔ بعض کتابوں میں یہ اقوال بھی آتے ہیں:

(الف) ابن السماکؒ (م، ۱۸۳ھ) فرماتے ہیں: التصوّف ترک التکلف (یعنی بناوٹ ترک کر کے خلوص اختیار کرنا)۔

(ب) معروف کرخیؒ (م، ۲۰۰ھ) کے نزدیک تصوف، حق کو لے لینے اور ماسوا کو ترک کر دینے سے عبارت ہے۔

(ج) حضرت جنیدؒ (م، ۲۹۸ھ) سے کسی نے تصوف کی تعریف پوچھی، فرمایا: التصوف ھو تصحیح الخیال (تصوف، خیال کی درستی کا نام ہے)۔

(د) ابو سہل صعلوکیؒ (م، ۳۶۹ھ) کا قول ہے: التصوف الاعراض عن الاعتراض۔ (تصوف، اعتراض سے روگردانی کا نام ہے)۔

ابو احسن نوریؒ (معاصر جنیدؒ) فرماتے ہیں: ھو تعمیر الظاھر و الباطن بہرحال امام ابوبکر بن اسحٰق لکھتے ہیں:

"دنیا سے خالی ہونے، اس سے علیحدگی اختیار کرنے، وطن ترک کرنے، اور سفر اختیار کرنے، نفس کو باز رکھنے، پاکی معاملات پاکیزہ باطن، انشراح صدر ادرصفِ اوّل کے لوگوں کی صفات رکھنے کا نام تصوف ہے۔ (صفحہ ۴۲۔۴۳)

پھر انھوں نے جن اوصاف وفضائل پر بحث کی ہے وہ یہ ہیں:

زہد، صبر، فقر، تواضع، خوف، تقویٰ، اخلاص، شکر، توکل، رضا، یقین، ذکر، انس، قرب، اتصال، محبت، تجرید و تفرید، وجد، غلبہ سکر، غیبت و شہود، جمع وتفرقہ، تجلی و استتار، فنا و بقا، حقایق و معرفت، توحید، مرید مراد، مجاہدات ومعاملات، وعظ ونصیحت، اور صوفیہ پر مختلف انعامات وغیرہ کا ذکر ہے۔

اسلام کے اندر اخلاص واحسان، صبر وتوکل کی تعلیم موجود ہے۔ اور حضور ﷺ اور صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی اس تعلیم کی عملی تفسیر ہے۔ "بخاری شریف" میں حضرت ابو ہریرہؓ سے وہ مشہور مروی ہے جو حدیثِ جبریلؑ کہلاتی ہے۔ یعنی حضرت جبریلؑ ایک انسان کے بھیس میں آپؐ کے پاس تشریف لائے، اور منجملہ دوسرے سوالات کے یہ بھی دریافت کیا کہ احسان سے کیا مراد ہے؟ ارشاد ہوتا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، اور اگر ایسا نہیں ہو سکے تو وہ تم کو دیکھتا ہی ہے۔ یہی احسان یا اخلاص ہے جو آگے چل کر تصوف کے نام سے مشہور ہوا اور سلف صالحین کی زندگیاں اسی قسم کے اخلاص یا احسان سے عبارت ہیں۔

یوں تو تصوف کا سلسلہ خاص حضور انورؐ اور آپ کے صحابہ کرام تک پہنچتا ہے لیکن پہلے شخص جو صوفی کے لقب سے ملقب ہوئے وہ ابو ہاشم کوفی ہیں۔ جو سفیان ثوریؒ کے معاصر تھے۔ بعض کے نزدیک اس لقب سے مشہور ہونے والے جابر بن حیان تھے یہ دونوں بزرگ دوسری صدی ہجری میں گزرے ہیں۔

بزرگوں کے نزدیک تصوف سے متعلق دو فلسفے ہیں۔ ایک وحدۃ الوجود اور دوسرا وحدۃ الشہود۔

وحدۃ الوجود کا مسئلہ سب سے پہلے حضرت بایزید بسطامیؒ اور شیخ جنید بغدادیؒ ہی نے چھیڑا، جس کے بعد شیخ محی الدین ابن العربیؒ نے اس مسئلے کو ایک فلسفے کی حیثیت سے استدلالی طور پر پیش کیا۔ ان کی کتاب "فصوص الحکم" اس مسئلہ کی سب سے بڑی مبلغ ہے لیکن امام غزالیؒ کا احسان ہے کہ انھوں نے مجتہدانہ تصانیف سے اسلامی عقائد کو ان کی اصلی صورت میں پیش کیا اور تصوف کو فلسفے کی غلامی سے بچالیا۔ دوسرا نظریہ وحدۃ الشہود کا ہے۔ جس کے مبلغ حضرت مجدد الف ثانی قدس

سرہٗ (م ۱۰۳۴ھ) تھے۔ حضرت مجددؒ نے فرمایا: ''شریعت کے تین جزو ہیں (۱) علم (۲) عمل اور (۳) اخلاص۔ جب تک یہ تینوں جزو متحقق نہ ہوں شریعت متحقق نہیں ہوتی اور جب شریعت حاصل ہوگئی تو گویا حق تعالیٰ کی رضامندی حاصل ہوگئی جو دنیا و آخرت کی تمام سعادتوں کی ضامن ہے اور کوئی ایسا مطلب پھر باقی نہیں رہتا جس کے حاصل کرنے کے سوا کسی اور چیز کی ضرورت پڑے۔ طریقت اور حقیقت جن کے ساتھ صوفیاے کرامؒ ممتاز ہیں اخلاص کے کامل کرنے میں شریعت کے خادم ہیں۔ پس ان دونوں حاصل کرنے سے مقصود شریعت کی تکمیل ہے، نہ کہ شریعت کے سوا اور کوئی امر۔ احوال و مواجد اور علوم و معارف جو صوفیاے کرامؒ کو اثناے راہ میں حاصل ہوتے ہیں وہ اصلی مقصد سے نہیں ہیں بل کہ اوہام و خیال ہیں جن سے طریقت کے اطفال کی تربیت کی جاتی ہے۔ ان سب سے گزر کر مقامِ رضا تک پہنچنا چاہیے جو مقامِ جذبہ وسلوک کی نہایت ہے، کیوں کہ طریقت و حقیقت کی منزلیں طے کرنے سے مقصود یہ ہے کہ اخلاص حاصل ہو جائے جو مقامِ رضا حاصل ہونے کے لیے لازمی و ضروری ہے۔''

اسی طرح ایک جگہ اور فرماتے ہیں کہ:

''اس سیر وسلوک سے مقصود، مقامِ اخلاص کا حاصل کرنا ہے جو آفاقی و نفسی معبودوں کی فنا پر منحصر ہے اور یہ اخلاص ،شریعت کے اجزا میں سے ایک جزو ہے، کیوں کہ شریعت کے تین جزو ہیں۔ علم، عمل، اخلاص۔ پس طریقت و حقیقت دونوں، شریعت کے تیسرے جزو یعنی اخلاص کی تکمیل کے لیے شریعت کے خادم ہیں۔'' (۱)

تصوف کی بابت ان بہت سے نظریات و تشریحات دیکھ لینے کے بعد حضرت داتا گنج بخشؒ کی معرکہ آراء کتاب ''کشف المحجوب'' سے یہ سطریں بھی دیکھ لینا مناسب ہے:

''ہر کسی کے نزدیک تصوف کے معنی کی تحقیق میں بہت سے لطائف ہیں۔ لیکن لغت کے اعتبار سے اس کا مفہوم ان معنی سے دور ہو جاتا ہے، پس صفا تمام چیزوں میں قابلِ تعریف ہے اور اس کا ضد کدورت ہے، چناں چہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: 'ذَهَبَ صَفْوُ الدُّنْيَا وَ بَقِيَ كَدَرُهَا' (دنیا کے صفائی چلی گئی اور اس کی کدورت باقی رہ گئی) اور کسی چیز کی لطائف اور خوبی کا نام اُس کی صفائی اور پاکیزگی ہے، پس چوں کہ اس قصہ (تصوف) والوں نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذب (درست) کرلیا ہے، اور اپنی طبیعت کا آفات سے چھٹکارا حاصل کرلیا ہے اس لیے ان کو صوفی کہتے ہیں اور یہ نام ان لوگوں کا 'اسم علم' ہے اس لیے ان کا حق اس سے زیادہ و بزرگ ہے کہ ان کے معاملات کو مخفی رکھا جا سکے

یہاں تک کہ (وصفی معنی پر دلالت کے لیے) اُن کے اسم کے لیے بھی کسی ایسے مادہ ہی سے مستق ہونا چاہیے جس سے یہ مقصد حاصل ہوجائے) اور اس دور میں اللہ تعالٰی نے بہت سے لوگوں کو تصوف اور اہلِ تصوف سے حجاب میں رکھا ہے اور اس تصوف کی لطافت کو اُن کے دلوں سے پوشیدہ کردیا ہے حتیٰ کہ ایک گروہ کا خیال یہ ہوگیا کہ اس کام میں صرف ظاہری احوال کی اصلاح ہے، باتن کا مشاہدہ موجود نہیں اور ایک گروہ کا خیال یہ ہے کہ صوفی صرف ایک اسم ہے جس کی کوئی اصل اور حقیقت نہیں۔ (۲)

پگارا خاندان اور سلسلہ تصوف:۔

تصوف کی اس تعریف کے بعد پگارا خاندان کے بزرگوں کا تصوف سے تعلق، اور اس کا مطالعہ زیادہ مفید ہوگا ۔کیوں کہ اس خاندان کے بزرگوں اور علمأ نے جس انداز اور انہماک سے دینی خدمات انجام دیں اس کا تفصیلی ذکر آئندہ ابواب میں پیش کیا جائے گا، لیکن اس سے قبل ان بزرگوں کی تصوف کے سلسلوں سے نسبت کا جائزہ لینا یہاں مقصود ہے۔

یوں تو تصوف میں چار سلسلے قابلِ ذکر ہیں۔نقشبندی، سہروردی، قادری اور چشتی، تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ پگارا خاندان کے بزرگوں نے نقشبندی سلسلے اور قادری سلسلے میں بیعت کیا اور خلافت بھی حاصل کی، اور ان سلسلوں کی تبلیغ میں نمایاں خدمات انجام دیں۔

تزکیہ اور تصفیہ تصوف کی بنیاد ہے صوفیأ کرام کے تمام سلسلے تزکیہ نفس کے لیے بزرگوں سے رجوع کرنے یعنی مراقبے کے ذریعے تزکیہ نفس اور حضور انور ﷺ کی چار خصوصیات بیان فرمائی گئی ہیں۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُومِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْ لًا مِّنْ اَنْفُسَهُمْ
اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ج وَاِنْ كَانُوْ امِنْ
قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۳)

بے شک اللہ کا بڑا احسان ہوا مسلمانوں پر کہ ان میں انہی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان پر اس کی آیتیں تلاوت کرتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے۔اور انھیں کتاب و حکمت سکھاتا ہے اور وہ لوگ ضرور اس سے پہلے گمراہی میں تھے۔

یعنی حضور انور ﷺ کی ان خصوصیات میں سے ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ تزکیہ اور تصفیہ بھی فرماتے ہیں، تاکہ لوگوں کی باطنی بیماریاں دور ہو جائیں اور وہ مزکّی ومطہّر ہو جائیں۔

اور جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ حقیقت میں یہی خصوصیت تصوف کی بنیاد ہے، اور آپ نے قریب قریب ایک لاکھ چو بیس ہزار صحابہؓ کو اسی وجہ سے مزکّی ومطہّر بنادیا تھا۔ پگارا بزرگوں کا تعلق نقشبندی اور سلسلۂ قادریہ سے رہا ہے، اس خاندان میں ایسے بزرگ بھی گزرے ہیں جو ان دونوں سلسلوں میں صاحبِ مجاز قرار پائے اور ان سلسلوں کی تعلیمات کو عام کرنے میں کامیاب رہے۔

سلسلہ نقشبندیہ:۔

سلسلۂ نقشبندیہ سے متعلق پروفیسر، ڈاکٹر آفتاب احمد خاں تحریر فرماتے ہیں۔

''طریقہ دراصل حضرت صدیق اکبرؓ کا طریقہ ہے کیوں کہ آپ کا کمال نسبت حُبّی حضرت رسولِ خدا ﷺ کے ساتھ ثابت ہو چکا ہے اور آپ اسی راستے سے فیض حاصل کرتے تھے۔

چناں چہ یہ بات اہلِ تحقیق کے نزدیک مثال ہے، اور صاحب اشحات (شیخ علی بن حسین الواحظ کاشفی) نے ہمارے خواجہ ناصر الدین عبداللہ احرار قدس سرہٗ سے اس مضمون کو تفصیل کے ساتھ نقش کیا ہے۔ اور آپ فرماتے تھے کہ طریقۂ خواجگان قدس اللہ اسرارہم جو حضرت صدیق اکبرؓ سے منسوب ہے وہ اسی نسبتِ حُبّی کے لحاظ سے ہے۔ کیوں کہ اس طریقے میں نسبتِ حُبّی کی نگہداشت ہے۔'' (۴)

سندھ میں سلسلۂ نقشبندیہ کی خدمات میں پگارا خاندان کا نمایاں حصہ رہا ہے اس کا ذکر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں نے ۶، جولائی، ۱۹۹۹ء کی ایک تقریر میں بھی کیا تھا۔

''شیخ محمدؒ اور پھر لواری شریف والے مخدوم محمد زمانؒ اور جتنے بھی یہ بزرگ ہیں: جن میں صدرؒ اور پھر پیر پگارا صاحب کے اسلاف اور مختلف بزرگ ماشاء اللہ یہ سب نقشبندی سلسلے کے یہاں تشریف لائے آپ کو تو معلوم ہی ہے کہ سید احمد بریلویؒ کی پیر پگارا صاحب کے اسلاف نے کتنی مدد

کی تھی، وہ یہاں سے تشریف لے گئے اور پھر بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ پھر جھنڈا والا یہ سب حضرت مجدد الف ثانیؒ کے سلسلے (نقشبندیہ) کے فیض یافتہ ہیں۔"

سلسلہء قادریہ:۔

تصوف اور روحانیت کے اس سلسلے کے امام یا سرخیل، حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ہیں۔ اور اس کا آپ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے جا ملتا ہے۔ اور یوں حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا ہے۔ سلسلہ کوئی بھی ہو توجہات آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہوتی ہیں۔

اس سلسلے میں بھی بڑے صاحب کمال اور صاحب علم شخصیات پیدا ہوئیں ہیں جن کی تعلیمات کا تسلسل اب تک قائم ہے،

ان تمام سلسلوں میں بالعموم اور سلسلہء نقشبندیہ میں بالخصوص قلب کا جاری کرنا ضروری ہوتا ہے، یعنی فرصت کے اوقات میں یہ تصور کرنا اور مکمل ارتکاز کے ساتھ تصور کرنا کہ میرا دل اللہ اللہ کر رہا ہے، اور میں اللہ کے سامنے حاضر ہوں، جوں جوں اس میں ارتکاز ہوتا رہے گا۔ اس عمل میں سرور اور کیف پیدا ہوتا رہے گا، ابتداء میں خیالات منتشر ہوتے ہیں بعض لوگوں کو ایک عرصہ اس عمل میں گزر جاتا ہے مگر قلب جاری نہیں ہوتا۔ کسی صاحب کے اس طرح کے سوال کا ایک جواب دیتے ہوئے خواجہ شمس الدین عظیمی صاحب نے کہا تھا کہ میٹرک کی کوئی حقیقت اور اہمیت نہیں ہے لیکن میٹرک کرنے میں بھی دس سال کا عرصہ چاہیے ہوتا ہے۔

یعنی معمولی علم کو حاصل کرنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے یہ تو روحانیت کا ایک بڑا علم بل کہ تمام دروازوں کی کلید ہے اسے حاصل کرنے میں سالک کی نیت، اس کا ارادہ، خلوص، ریاضت، قلب کی پاکیزگی نفس پر قابو رکھنے کی صلاحیت کے ساتھ اس کے مرشد کی توجہات، اور اسباق پر نظر رکھنے کا تسلسل ضروری ہے، ان تمام مراحل بلکہ بعض جگہ مسائل سے گزرتے ہوئے ایک سالک کو فضیلت کا درجہ اور روحانیت میں حقائق کو تلاش کرنے کی سعی میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ اب اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ یہ سفر کتنا مشکل دقت طلب اور کتنا وقت چاہتا ہے۔ پگارا خاندان کے بزرگوں کی حیات کا مطالعہ کرتے ہوئے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بزرگوں نے بھی بحیثیت سالک بہت محنت کی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کا

مرتبہ روحانیت میں بلند نظر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تصوف پر بھی نہایت وقیع اور اہم کام کیا ہے، نیز دینی خدمات کرتے ہوئے نہایت بلند پایہ کتب تصنیف فرمائی ہیں۔

ضروری معلوم دیتا ہے کہ یہاں ہم پگارا خاندان کے بزرگوں کا تصوف میں سلسلہء نقشبندیہ اور قادریہ کا شجرہ پیش کردیں تا کہ اس سفر میں ان بزرگوں سے حاصل فیض کا تسلسل بھی واضح ہو سکے اور ان بزرگوں کو اپنے اسلاف سے جو فیض حاصل رہا اس کا تسلسل بھی دیکھا جا سکے، بہ ظاہر تو یہ شجرہ ہے، لیکن اس کے پیچھے تعلیمات، توجہات، تفکرات، عبادات کے ساتھ تشریح حیات، اور تفہیم کائنات کا ایک سلسلہ بھی قائم ہے، لیکن اسے دیکھنے کے لیے بصارت سے زیادہ بصیرت کی ضرورت ہے۔

شجرۂ سلسلہء عالیہ نقشبندیہ

(۱) محبوبِ خدا، خیرالبشر سالارِ انبیاء حضرت محمد مصطفیٰ احمدِ مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم

(۲) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

(۳) حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

(۴) حضرت قاسم رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

(۵) حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ

(۶) حضرت شیخ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ

(۷) حضرت ابوالحسن خرقانی رحمۃ اللہ علیہ

(۸) حضرت خواجہ ابوعلی فارمدی رحمۃ اللہ علیہ

(۹) حضرت خواجہ ابو یوسف ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۰) حضرت خواجہ عبدالخالق غجدوانی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۱) حضرت خواجہ عارف رحمۃ اللہ علیہ

(۱۲) حضرت خواجہ محمود رحمۃ اللہ علیہ

(۱۳) حضرت شیخ علی رامیتنی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۴) حضرت خواجہ محمد بابا سماسی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۵) حضرت سید امیر کلال رحمۃ اللہ علیہ

(۱۶) حضرت خواجہ بہاء الدین نقشبند رحمۃ اللہ علیہ

(۱۷) حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۸) حضرت خواجہ عبداللہ احرار رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹) حضرت خواجہ محمد زاہد رحمۃ اللہ علیہ

(۲۰) حضرت خواجہ درویش محمد رحمۃ اللہ علیہ

(۲۱) حضرت خواجہ خواجگی امکنگی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۲) حضرت خواجہ محمد باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ

(۲۳) حضرت شیخ احمد فاروقی سرہندی (مجدد الف ثانی) قدس سرۃ (م ۱۰۳۴ھ) (۵)

(۲۴) حضرت خواجہ سید آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ

(۲۵) حضرت خواجہ سعدی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ

(۲۶) حضرت خواجہ ایوب رحمۃ اللہ علیہ

(۲۷) حضرت خواجہ جمال اللہ رحمۃ اللہ علیہ (۶)

(۲۸) حضرت مخدوم اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ

(۲۹) حضرت خواجہ سید محمد بقا رحمۃ اللہ علیہ

(۳۰) حضرت سید محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ (۷)

اس شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد راشدؒ (م ۱۲۳۳ھ) نے اپنے والد حضرت خواجہ سید محمد بقاؒ (م ۱۱۹۸ھ) کے ہاتھ پر سلسلہ نقشبندیہ میں بیعت کی تھی، سید محمد راشدؒ پگارا خاندان کے آخری بزرگ تھے جو سلسلہ نقشبندیہ

سے وابستہ تھے، بعد میں ان کے والد سید محمد بقانے سلسلہ قادریہ میں سید عبدالقادرؒ کے بیعت کی جس کی اتباع کرتے ہوئے سید محمد بقانے بھی قادریہ سلسلہ میں مجاہد کیا اور اپنے والد ہی ہاتھ پر بیعت کی جس کے بعد یہ سلسلہ قائم ہے اور جس کا تسلسل اس طرح قائم ہوتا ہے:

شجرۂ سلسلہءقادریہ

(۱) حضور اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم
(۲) حضرت سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
(۳) حضرت خواجہ حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
(۴) حضرت خواجہ حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ
(۵) حضرت خواجہ داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ
(۶) حضرت خواجہ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ
(۷) حضرت خواجہ سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ
(۸) حضرت خواجہ جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ
(۹) حضرت خواجہ ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۰) حضرت خواجہ عبدالواحد رحمۃ اللہ علیہ
(۱۱) حضرت خواجہ ابوالفرح طرطوسی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۲) حضرت خواجہ علی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۳) حضرت خواجہ ابی سعید المبارک رحمۃ اللہ علیہ
(۱۴) حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ
(۱۵) حضرت خواجہ عبدالوہاب رحمۃ اللہ علیہ
(۱۶) حضرت خواجہ صوفی رحمۃ اللہ علیہ

(۱۷) حضرت خواجہ احمد رحمۃ اللہ علیہ

(۱۸) حضرت خواجہ مسعود رحمۃ اللہ علیہ

(۱۹) حضرت سید علی رحمۃ اللہ علیہ

(۲۰) حضرت خواجہ شاہ میر رحمۃ اللہ علیہ

(۲۱) حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

(۲۲) حضرت خواجہ محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

(۲۳) حضرت خواجہ عبدالقادر ابن محمد غوث رحمۃ اللہ علیہ

(۲۴) حضرت خواجہ عبدالرزّاق رحمۃ اللہ علیہ (۸)

(۲۵) حضرت خواجہ حامد شاہ گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ (م، ۹۷۸ھ)

(۲۶) حضرت خواجہ عبدالقادر ابن حامد بخش رحمۃ اللہ علیہ (۹)

(۲۷) حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

(۲۸) حضرت خواجہ عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

(۲۹) حضرت خواجہ شمس الدین محمد رحمۃ اللہ علیہ

(۳۰) حضرت خواجہ حامد شاہ رحمۃ اللہ علیہ

(۳۱) حضرت خواجہ شمس الدین رحمۃ اللہ علیہ

(۳۲) حضرت خواجہ صالح شاہ رحمۃ اللہ علیہ

(۳۳) حضرت سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ

(۳۴) حضرت سید محمد بقا رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۱۹۸ھ)

(۳۵) حضرت سید محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۲۳۳ھ)

(۳۶) حضرت سید صبغت اللہ شاہ اوّل رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۲۴۶ھ)

(۳۷) حضرت سید علی گوہر شاہ اوّل رحمۃ اللہ علیہ (م، ۱۲۶۳ھ)

(۳۸) حضرت سید حزب اللہ شاہ رحمۃ اللہ علیہ (م،۱۳۰۸ھ)

(۳۹) حضرت سید علی گوہر شاہ ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م،۱۳۱۴ھ)

(۴۰) حضرت شاہ مردان شاہ اوّل (م،۱۳۴۰ھ)

(۴۱) حضرت صبغت اللہ شاہ ثانی رحمۃ اللہ علیہ (م،۱۹۴۳ء)

(۴۲) حضرت پیر سکندر علی عرف مردان شاہ ثانی، موجودہ پیر پگارو (۱۰)

اس شجرے سے معلوم ہوتا ہے کہ پگارا خاندان کے بزرگوں سے سید محمد بقاؒ (م،۱۱۹۸ھ) پہلے نقشبندیہ سلسلے میں حضرت مخدوم اسمٰعیل رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے، حضرت سید محمد راشد نے اپنے والد ہی کے ہاتھ پر بیعت کی گئی تھی، لیکن بعد میں حضرت سید محمد بقا رحمۃ اللہ علیہ نے سلسلہ قادریہ میں حضرت سید عبدالقادر رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ مبارک پر تجدید بیعت کی، اور اسی طرح سید محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے والد کے ساتھ قادریہ سلسلے کی طرف رجوع کیا، بعد میں پگارا خاندان نسل در نسل سلسلہء قادریہ میں بیعت ہوتا رہا ہے۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کا بیٹا اپنے والد کے ہاتھ پر بیعت کرتا ہے، یوں اب تک یہ سلسلہء قائم ہے، اور سلسلہء قادریہ کو فروغ دینے میں اس خاندان کی خدمات نمایاں بھی ہیں اور قابلِ ذکر بھی۔

حواشی

(۱) تصوف کی تعریف کے لیے ڈاکٹر آفتاب احمد خاں کی تصنیف ''خاندانِ نقشبندیہ کی علمی خدمات'' مطبوعہ ۱۹۸۸ء سے مدد لی گئی ہے۔

(۲) حضرت داتا گنج بخشؒ ''کشف المحجوب'' اردو ترجمہ مطبوعہ لاہور ایڈیشن ۱۹۹۴ء

(۳) اسی مفہوم کی اور بھی آیتیں ہیں، مثلاً: البقرہ (۱۵۱) اور الجمعہ (۲)

(۴) نسبتِ جبی کی کیفیات سے متعلق تفصیل دیکھیں مکتوبات شریف حضرت مجدد الف ثانی شیخ سرہندیؒ (۲۹۰/۱)

(۵) آپ کے چار خلیفہ زیادہ معروف تھے، سید آدم بنوریؒ (م ۱۰۵۳ھ) حضرت خواجہ محمد معصوم (م ۱۰۷۸ھ) شیخ محمد سعیدؒ (م ۱۰۷۰ھ) اور شاہ حسینؒ، پگارا خاندان کے بزرگوں کا سلسلہ سید آدم بنوری نقشبندیؒ سے ملتا ہے۔

(۶) پریاں لوئی میں مخدوم اسمٰعیلؒ کے مزار سے جنوب میں آدھے میل پر خواجہ جمال الدینؒ کا مزار ہے۔ لیکن اس پر تاریخ نہیں ہے۔

(۷) تبسم چودھری ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' ص ۷۷/۷۸

(۸) ان کے ایک بھائی زین العابدین تھے۔ دیکھیں، حدیقۃ الالیاء (مفتی غلام سرور لاہوری) ص ۵۵

(۹) ان کے چھوٹے بھائی شیخ موسیٰ تھے۔ دیکھیں، حدیقۃ الالیاء (مفتی غلام سرور لاہوری) ص ۴۱

(۱۰) تبسم چودھری ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' ص ۷۸/۸۰

باب چہارم

جدِّ امجد کی سندھ میں آمد:-

اس خاندان کا سلسلہ حضرت علی کرم اللہ وجہٗ سے ملتا ہے۔اس کی سولہویں پیڑی میں سید علی مکی پیدا ہوئے، ان کا نام سید علی تھا، اور مکہ کی نسبت سے مکی کہلائے۔آپ مکہ معظمہ سے سندھ میں تشریف لانے والے اس خاندان کے پہلے بزرگ تھے۔آپ کی یہاں آمد اور قیام سے متعلق سندھ کی قدیم تاریخوں اور حوالوں میں ذکر ملتا ہے مگر بعض جگہ روایات میں اختلاف بھی ہے، چند حوالوں میں آپ کے نام میں بھی معمولی اختلاف ہے لیکن قیاس یہی ہے کہ یہ ذکر بھی سید علی مکی ہی کا ہے، یہاں ہم چند اہم تاریخوں سے آپ کی آمد سے متعلق چند روایات کا جائزہ لیں گے۔

سندھ کی قدیم تاریخوں میں سے ایک مستند اور معتبر تاریخ ''تحفۃ الکرام'' ہے۔اس تصنیف میں آپ کی آمد سے متعلق ہے۔

> ''سب سے پہلے سید جو یہاں (لکیاری) آئے وہ سید علی بن سید عباس بن شاہ زید (امام موسیٰ کاظم تک) تھے۔کہتے ہیں کہ سید مذکور کی آمد سے کچھ عرصے پہلے دلورائے کے ظلم کی وجہ سے اروڑ اور بہمن آباد (بھانبھرا) کے شہر ویران اور پامال ہو چکے تھے، (واضح ہو کہ بہمن آباد وہ جگہ ہے جو آج دلور کے نام سے پکاری جاتی ہے اور اس کے کھنڈرات اور آثار نہر جمڑاؤ کے کنارے جنوب مشرق کی طرف بھڑایا دڑا کے نام سے کئی میلوں میں بکھرے ہوئے ہیں''۔(۱)

دلورائے مختلف منفی اعمال میں گھرا ہوا تھا، لیکن اپنے بھائی چھٹو آمرانی جو مسلمان ہو گیا تھا، کی نصیحتوں اور ہدایتوں کا اس پر خاص اثر ہوا اسی اثر کے تحت اس نے اپنی تمام بری عادتوں کو ترک کر دیا، اور تائب ہو کر سید صاحب کے حضور حاضر ہوا، بعد میں سید صاحب کی شخصیت کردار، ملن ساری اور اخلاص سے ایسا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی بیٹی سید صاحب کے عقد میں دے دی۔اس خاتون سے سید صاحب کے یہاں چار بیٹے تولد ہوئے۔

(۱) سید محمد (۲) سید مراد (۳) سید حاجی عرف بھر کیو (۴) سید چنگو، ان چاروں بھائیوں کی نسبت سے چار قبیلے وجود میں آئے یہ بھی روایت ہے کہ سید صاحب کے خسر دلورائے، کا بھائی چھٹو آمرانی بعد میں بغداد گیا تھا اور وہاں کے خلیفہ

سے فریاد کی تھی یوں سو عرب باشندے لے کر سندھ آیا تھا، اور اس شہر میں منفی رجحانات کے تدارک کے لیے کوشش کی اور اس امداد یا فریاد کا ذکر متذکرہ کتاب میں اس طرح بیان ہوتا ہے:

''شہر اروڑ کی بربادی کے بعد دلورائے بھابھرا (بہمن آباد) میں آ کر رہنے لگا تھا۔ اس کا بھائی چھٹو آمرانی مسلمان ہو گیا تھا، اس نے عرب میں جا کر اسلام کی شریعت اور قرآن مجید کی تعلیم بھی حاصل کی تھی، اور اس سے فارغ ہو کر وہ بھی بہمن آباد آ گیا تھا۔

اس کے اعزہ نے اسے شادی کر لینے کے لیے بار بار کہا اور بعض عزیزوں نے رشتے بھی پیش کیے لیکن چھٹو آمرانی نے ان رشتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے اس عمل پر طعنہ زنی ہوئی اور یہ بھی کہا گیا کہ یہ کسی عرب شہزادی کا منتظر ہے۔

اس کے بعد چھٹو آمرانی حج کی سعادت حاصل کرنے مکہ معظمہ گیا اور وہاں فاطمہ نامی نیک سیرت، باکردار اور پردہ دار خاتون سے عقد کر لیا اور وطن واپس ہوا۔ دلورائے جو مختلف منفی عادتوں میں ملوث تھا، اس نے جب اپنی بھابی کی خوب صورتی اور سلقہ مندی دیکھی تو اس کے دل میں برائی نے سر اٹھایا لیکن عین اس وقت چھٹو آمرانی آ پہنچا اور اس کے آنے سے فاطمہ کا دامن تار تار ہونے سے محفوظ ہو گیا لیکن اسے چھٹو آمرانی جیسے باکردار، باصفات اور درویش صفت انسان کے دل کی آواز کہیے یا اس عبادت گزار انسان کی دور اندیشی کہ اس نے اعلان کر دیا کہ یہ شہر بہت جلد ختم ہو جائے گا اور خود مع اہلیہ بغداد کو روانہ ہو گیا جہاں اس نے خلیفہ بغداد کے دربار میں جا کر یہاں کی بدکاری، ریا کاری، اور شیطنیت کا تذکرہ کرتے ہوئے مدد چاہی۔ خلیفہ نے فریادی کی فریاد سن کر اس کی دادرسی کی اور سید علی مکی کو ہدایت کی کہ وہ اپنے ہمراہ ایک سو عرب باشندے (مجاہدین) لے کر سندھ کو روانہ ہو جائے، لیکن جب سید علی مکی اپنے مجاہدین کے ہمراہ سندھ کی سرزمین پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ بہمن آباد کے باشندے اپنے کیے کا پھل کاٹ چکے ہیں یعنی یہ شہر اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے، اس لیے غالباً اس شہر کو از سر نو آباد کیا اور یہاں کی عوام کی مشکلات کو دور کرنے کے خاطر سید علی مکی یہیں آباد ہو گئے، اور ان کے ہم راہ آنے والے عرب باشندوں میں سے بھی کثیر تعداد یہیں مقیم ہو گئی''(۲)

سندھ کے معروف مصنف، محقق، دانش ور اور ناقد مرزا قلیچ بیگ اپنی تصنیف ''قدیم سندھ'' میں سید علی مکی کی سندھ میں آمد محمد بن قاسم کے ہم راہ بتاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے:

''سید علی مکی ۷۱۱ھ میں محمد بن قاسم کے ساتھ سندھ میں آئے تھے اور بکی میں آباد ہو گئے تھے'' (۳)

سید علی مکی کی سندھ میں آمد سے متعلق ہمیں کچھ اور روایتیں بھی ملتی ہیں کسی نتیجے پر پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان روایتوں کا سرسری مطالعہ ضرور کر لیں، یعنی اس سے متعلق ایک اور روایت، جی ایم سید کی تصنیف ''جنب گذارین جن سیں'' میں بھی ملتی ہے اگرچہ یہ ضخیم اور اہم کتاب جی ایم سید کی خودنوشت کہی جا سکتی ہے جس میں ان کی سیاسی زندگی، تعلیم و تربیت، اساتذہ، رفیق کار، محبی اعزہ، سیاسی رجحانات اور دیگر شخصیات کا تذکرہ ہے، لیکن اس کتاب کی پہلی جلد کے آغاز میں جہاں انھوں نے سندھ کی تہذیب وتمدن، قدامت اور معاشرتی زندگی کے نمونے پیش کیے ہیں وہاں انھوں نے پگارا خاندان کے اس بزرگ یعنی سید علی مکی کی سندھ میں آمد کا مختصر ذکر اس طرح کیا ہے:

''لکیاری سادات کا سلسلہ نسب سید علی مکی کے سندھ میں آنے کے بعد سے شروع ہوتا ہے، جو مکے سے ۵۲۰ھ یعنی ۱۱۲۷ء میں سندھ میں آئے تھے اور لکی میں سکونت اختیار کر لی تھی۔'' (۴)

یہاں تک ہم نے مختلف بیانات اور روایات کا مطالعہ کیا۔ اس ضمن میں موجودہ پیر پگارہ جناب پیر سکندر شاہ عرف مردان شاہ ثانی کے مطبوعہ انٹرویو کے تعارف میں موجود بیان بھی دیکھ لینا چاہیے جو روزنامہ ''جسارت'' کے نمائندے ظہور احمد نے قلم بند کیا ہے:

''پیر سید سکندر شاہ، جو شاہ مردان شاہ ثانی کے لقب سے پیر پگارو نمبر سات ہیں، پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی کے صاحب زادے ہیں، جنھیں انگریزوں نے آزادی کی جدوجہد کے جرم میں ۲۰ مارچ ۱۹۴۳ء کو حیدرآباد میں پھانسی دی تھی۔ اس خاندان کے مورث اعلیٰ سید علی مکی تھے، جو عباسی دورِ حکومت میں سندھ میں آئے تھے، ان کی بیسویں پشت میں سید محمد بقا نام کے ایک بزرگ پیدا ہوئے، جن کے ایک فرزند سید محمد راشدؒ تھے''۔ (۵)

یہی بات، بیان اور روایت قریب از قیاس معلوم دیتی ہے کہ سید علی مکیؒ عباسی دورِ حکومت میں سندھ میں تشریف لائے۔ یہی بات اور تحقیق کے ساتھ ڈاکٹر اعجاز الحق قدسی نے اپنی تصنیف میں پیش کی ہے کہ سید علی مکی مرحوم و مغفور عباسی

دورِ حکومت میں سندھ میں تشریف لائے تھے، گویا اس سے قبل کے بیانات کو مصدقہ نہیں کہا جا سکتا جو عموماً قیاس کی بنیاد پر رقم کیے گئے ہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اس بات پر تمام محققین اور مصنفین متفق ہیں کہ سید علی مکی کا سندھ میں آنا، اسلام کی اشاعت، تبلیغ اور تفہیم کی تحریک لیے ہوئے تھی، یعنی وہ یہاں خدا اور اس کے رسول کا پیغام لے کر تبلیغ کی نیت سے آئے تھے۔ ممکن ہے ان کے ساتھ اور لوگ بھی ہوں جو یہاں مقیم ہو گئے ہوں۔ جنھوں نے یہاں اپنے کردار، اطوار اور گفتار سے بہت جلد اپنے حلقہء رفیقاں کو اپنے حلقہء ارادت منداں میں تبدیل کر لیا اور پھر خود کو اسلام کی تبلیغ کے لیے وقف کر دیا، کیوں کہ بنو عباس کے وقت سے پہلے ہی مختلف خیالات و رجحانات سندھ میں پروان چڑھنا شروع ہو گئے تھے جسے بے دینی تصورات کہا جا سکتا ہے، اور یہاں کی عوام نے ان رجحانات کو کسی قدر قبول کرنا بھی شروع کر دیا تھا۔ یہی وہ عہد ہے جب راسخ العقیدہ شخصیات اسلام کی تبلیغ و تفہیم کے لیے دور دراز علاقوں میں ہجرت کیا کرتی تھیں، بالخصوص ایسے علاقوں کا جہاں اس تبلیغ کی زیادہ ضرورت محسوس کی جاتی تھی۔ چناں چہ آپ کی مکے سے ہجرت اور سندھ میں آمد کا اصل مقصد یہاں ترویجِ دینِ اسلام تھا۔

سندھی زبان میں ''لک'' جہاں سے گزرنا مشکل ہو۔ سید علی مکیؒ نے ایسی ہی ایک جگہ کو اپنے قیام گاہ کے طور پر منتخب کیا جو ''سیہون'' کے پہاڑوں کے پاس ہے۔ آپ اپنے ساتھیوں کے ہم راہ یہاں قیام پذیر ہوئے، آپ کے نام کی وجہ سے یہاں کے لوگوں میں یہ جگہ ''لک علوی'' کے نام سے مشہور ہو گئی۔ بعد میں یہ لفظ روایتوں، زبانوں اور زمانوں کے ساتھ سفر کرتا ہوا تبدیلی کی کئی صورتوں سے گزرتا ہوا ''لکیاری'' بن گیا، اور وہاں کے سادات ''لکیاری سادات'' کہلائے۔ اس بارے میں تبسم چودھری کا کہنا ہے:

> ''سادات لکیاری میں سب سے زیادہ مشہور سید صدر الدین تھے جن کو شاہ صدر کہتے ہیں۔ ان کا قبہ لکی ریلوے اسٹیشن سے متصل ہے۔ وہ سید محمد کے بیٹے تھے جو بڑے صاحبِ کرامت تھے۔ ان کی اولاد سندھ میں بہت ہے۔ ان کے پوتوں میں سے بھی ایک کا نام سید محمد تھا، جو روزانہ ڈھائی ہزار درود شریف پڑھتے تھے، ان کی تاریخ وفات کا مصرع بھی اس سے بنتا ہے،

''درود خدا بر محمد بود''

۱۱۲۵ھ

ان کا بیٹا سید اوّل شاہ مجذوب تھا۔ یہ سب نیک اور شہرت یافتہ سادات تھے، سید محمد شجاع شاہ صدر کے پوتوں میں سے تھے اور ان کا طریقہء سلوک نقشبندی تھا۔ ان کے خاندان والوں سے دعا کے لیے شہزادہ معزالدین دہلی سے لکی آیا تھا۔

اس خاندان کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ ان کے فیوضات سارے سندھ میں مسلّم ہیں اور آج بھی صدیاں گزر جانے کے باوجود ان کا مرکز سیہون ضلع دادو ہے۔ ان کے روحانی مرکز پورے سندھ میں قائم ہیں، لکی میں شاہ صدر کی درگاہ پیر گوٹھ میں سید محمد راشدؒ کی درگاہ اور پیر جھنڈو نزد نیو سعید آباد کی خانقاہ سے واقف ہیں۔ اس خاندان کے خلفاً کے اپنے اپنے روحانی مرکز سارے سندھ میں موجود ہیں۔ بالائی سندھ میں خلیفہ سوئی کی خانقاہ، خلیفہ دین پور کی خانقاہ، خلیفہ بھر چونڈی کی خانقاہ اور خلیفہ امروٹ کی خانقاہ آج تک موجود ہیں۔ زیریں سندھ میں ان کے خلیفہ کی خانقاہیں قادری اور نقشبندی سلسلوں کے انوار و تجلیات کا مرکز ہیں۔'' (صفحہ۹۳)

گویا آج بھی سندھ بھر کے مختلف علاقوں میں علمی و دینی خدمات کے لیے ان بزرگوں کے لگائے ہوئے پودے سرسبز و شاداب ہیں بل کہ بعض تو ایسے گھنے درخت ہیں جس کی چھاؤں میں تشنگانِ علم اپنی پیاس بجھا رہے ہیں اور سیراب ہو رہے ہیں۔ اس طرح دینی و علمی علوم کی تبلیغ و تفہیم کے لیے کئی مراکز و مدارس اپنا کام سرگرمی سے انجام دیتے ہوئے آنے والی نسلوں کو بھی روشنیِ علم سے منور کر رہے ہیں۔

ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس خاندان کے ابتدائی بزرگوں کا تعلق سلسلہء نقشبندیہ سے رہا۔ بعد کے بزرگوں نے سلسلہء قادریہ میں بیعت کی یوں اس خاندان کے بزرگوں کا تعلق تصوف کے ان دونوں معروف سلسلوں سے رہا اور ان دونوں سلسلوں کو سندھ کے اس علاقے میں خاصی مقبولیت حاصل رہی اور ان بزرگوں کے طفیل ان سلسلوں کو سندھ میں

خاص فروغ حاصل ہوا۔

سید علی مکی کے بارے میں بہت زیادہ معلومات تو حاصل نہیں۔ چناں چہ اس ضمن میں تفصیل بیان کرنا قدرِ مشکل امر ہے لیکن مصنفین کے یہاں اس بات پر اتفاق ہے کہ سید صاحب مرحوم ایک متقی، پرہیز گار عبادت گزار، راسخ العقیدہ بزرگ، دین دار اور صلح جو شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے اپنے کردار سے علاقے کی عوام میں نمایاں تبدیلیاں پیدا کر دیں اور ان کی شخصیت کو قابلِ تقلید بنا دیا۔ اپنے کردار و گفتار سے اطراف میں برسوں پرانی روش کو تبدیل کرنا اور اس قدر تبدیل کر دینا جسے زمین آسمان کا فرق کہنا چاہیے یقیناً بہت مشکل امر ہے۔ یہ کام تو وہی لوگ کرتے ہیں جنھیں اللہ ایسے کاموں کے لیے منتخب کرتا ہے، اور ان کے کردار کو اس قدر منور اور مطہر رکھتا ہے جس کا اثر لوگوں پر دیکھتے ہی پڑتا ہے۔ اسی سے اہلِ اللہ اور نیک صفات لوگوں کی پہچان قائم ہے۔ لہٰذا سید صاحب مرحوم کی سرپرستی میں یہاں اسلامی تعلیمات کو عام کرنے کا کام نہایت احسن طریقے سے شروع ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اطراف میں پھیل گیا۔ ان کے کردار، اقوال اور افعال سے یہاں کی عوام پر خاص اثر ہوا، اور یوں یہاں کی طرزِ زندگی پر گہرے اثرات مرتب ہوئے اور کثیر تعداد میں لوگ شریعت کے مطابق زندگی بسر کرنے میں خاص توجہ دینے لگے۔

سید صاحب مرحوم کی تعلیمات کا اثر ان کے خاندان پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، بالخصوص ان کے بچوں میں ان کی تعلیمات اور تربیت کی وجہ سے ایسے اثرات پیدا ہوئے کہ انھوں نے اپنے والد کے رجحانات، تعلیمات اور ان کے توسط سے حاصل اسلامی نظریات کے فروغ میں نہایت عمدہ اور اعلیٰ کام سرانجام دیے۔ اور آج بھی اس خاندان کا سندھ بھر میں بالعموم اور اندرونِ سندھ میں بالخصوص اثر رسوخ ہے اور لوگ آج بھی ان کے بزرگوں کی دینی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں اس لیے کہ یہ خدمت اس دور میں ہوئی جب وسائل محدود اور مسائل لامحدود تھے۔

متذکرہ رائے کو ڈاکٹر اعجاز الحق قدسی نے بھی اپنی تصنیف ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' میں بیان کیا ہے:

''چوتھی صدی ہجری میں حضرت شاہ صدر کے دادا حضرت سید علی مکی جو اکابرِ شیوخ اور اولیائے کبار میں تھے۔ اپنے سو رفقا اور ہم رائیوں کے ساتھ سامرہ (علاقہ عراق) سے ہجرت کر کے تبلیغ اور اشاعت اسلام کے لیے سندھ میں تشریف لائے اور پرگنہ سیوستان ضلع دادو میں بھگے ٹوڈھے نامی پہاڑ کے دامن میں دریا کے کنارے ایک پرفضا اور خاموش بستی میں سکونت پذیر ہوئے۔ یہ گاؤں آئندہ چل کر حضرت علی مکی کے نام پر لک علوی کے نام سے مشہور ہوا اور ان کی اولاد لکیاری سادات کہلائی۔'' (٦)

حواشی

(۱) ''تحفۃ الکرام'' سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد۔

(۲) متذکرہ کتاب میں یہ روایت بڑی تفصیل سے ملتی ہے اگرچہ ہم یہاں ضرورت کے مطابق مفہوم پیش کرتے ہیں۔

(۳) مرزا قلیچ بیگ ''قدیم سندھ'' سندھی ادبی بورڈ حیدرآباد، مطبوعہ ۱۹۸۱ء

(۴) جی ایم سید ''جب گذاریم جن سیں''

(۵) روزنامہ ''جسارت'' کراچی مورخہ ۱۴، اکتوبر ۱۹۷۲ء

(۶) اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' اردو اکیڈمی کراچی، مطبوعہ ۱۹۵۹ء

☆ ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر نے بھی اپنی تصنیف ''سندھ کے صوفیائے نقشبند'' (ص ۵۰۹) میں اس خاندان کے مورث اعلیٰ اور جدِ امجد کی سندھ میں آمد سے متعلق لکھا ہے:

> ''جو بزرگ سب سے پہلے یہاں سندھ میں تشریف لائے وہ سید علی لکیاری ہیں، آپ کی یہاں سندھ میں آمد کس زمانے میں ہوئی؟ اس میں مورخین کا زبردست اختلاف ہے چناں چہ تحفۃ الکرام اور مرزا قلیچ بیگ کی روایت کے مطابق سید علی مکی لکیاری مشہور اسلامی کمانڈر محمد بن قاسم کے ساتھ ۷۱۱ء میں یا ان کے قریبی زمانے میں سندھ کے اندر تشریف لائے، جناب جی ایم سید کی تصنیف جب گذاریم جن سیں کے مطابق آپ کی سندھ میں آمد ۵۲۰ھ / ۱۱۲۷ء میں ہوئی۔ اعجاز الحق قدوسی کی تصنیف تذکرہ صوفیائے سندھ کی رو سے آپ کی یہاں سندھ میں آمد چوتھی صدی ہجری میں بنو عباس کے دورِ حکومت میں ہوئی۔''

حضرت محمد بقا شاہ شہید علیہ الرحمہ (م، ۱۱۹۸ھ)

سید امام شاہؒ کے یہاں ۱۱۳۵ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کو اس قدر ذہن بنایا گیا ہے کہ بچپن میں ابتدائی دینی تعلیم کے علاوہ صرف نحو سے متعلق بھی اہم معلومات حاصل کرلیں تھیں، آپ کے بارے میں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ بچپن ہی سے عبادت و ریاضت کی طرف مائل تھے۔ نماز روزانہ اور دیگر عبادات میں ہمیشہ مصروف رہتے۔ بزرگوں کا احترام اور اسلاف طریقہ ہائے زندگی کے علم بردار واقع ہوئے تھے۔ قرآن پاک کی تعلیم جو اسی دور میں مکمل کرلی تھی، اور اس کا ورد ان کی زندگی کا خاصہ تھا۔

قصبہ رحیم ڈنہ کلہوڑا سے چار کوس کے فاصلے پر سلسلہ نقشبندیہ کے ایک مشہور معروف متقی اور معتبر بزرگ مخدوم محمد اسمٰعیلؒ (م، ۱۱۷۴ھ) مقیم تھے۔ سید محمد بقا شاہؒ نے جب ہوش سنبھالا تو اس عظیم بزرگ کی شہرت اور افضل و اعلیٰ مقام کے چرچے سنے چناں چہ آپ ان کی خدمت میں پہنچے اور سلسلہ نقشبندیہ مجدّدیہ میں شرف بیعت حاصل کیا، پھر گویا ان کی طبیعت کسی اور کام لگتی نہیں تھی، باطنی پیاس بجھانے اور سلوک کی منازل طے کرنے کے اشتیاق نے انھیں کہیں نہیں جانے دیا اور اپنے پیرو مرشد کا دامن تھام لیا تھا تا کہ اکثر اوقات انھی کے آستانے پر بسر ہوتے۔ مرشد بھی صاحب نظر، صاحب مراتب اور صاحب منصب بزرگ تھے، وہ اپنے مرید کے سینے کی لگن اور روح کی پرواز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ خلوص نیت، نفس پر قابو اور شریعت کی پابندی مرید میں کتنی ہے، لہٰذا مرشد نے بھی آپ پر بھی توجہ دی اور اپنے حصار تربیت میں رکھا، جس سے محمد بقا شاہؒ کو خوب باطنی فوائد حاصل ہوئے، اور کچھ ہی عرصے میں بامراد قرار پائے۔ محمد رمضان علی قادری کہتے ہیں۔

> ''ایک دن حضرت مخدومؒ نے آپ سے فرمایا، آپ کی اصل امانت ایک دوسرے شخص کے پاس ہے جو غوثِ زمانہ سیدنا محی الدین شیخ عبدالقادر جیلانی قدس سرہٗ کی اولاد سے ہیں، عنقریب تمھاری ملاقات ان سے ہوگی اور امانت بھی انھی سے حاصل ہوگی۔'' (۱)

محمد رمضان علی قادری اس روایت کی ضمن میں مزید لکھتے ہیں:

> ''کچھ دن گزرے کہ سید عبدالقادرؒ (م، ۱۱۹۱ھ) سیر و سیاحت کرتے ہوئے سندھ میں وارد

ہوئے، اور حضورؐ کے موئے مبارک کی زیارت کے لیے بہ مقام روہڑی پہنچے۔ اتفاقاً سید محمد بقاؒ بھی وہیں موجود تھے۔ ان کی ملاقات سید عبدالقادرؒ سے ہوئی، آپ کو بزرگانِ دین کے دیدار کا بہت شوق تھا، آپ نے ان کی مہمان نوازی کی اور عرض کی ''قبلہء عالم! یہ فقیر آپ ہی کی تلاش میں تھا۔ براہِ کرم مجھے اپنی غلامی میں قبول فرمائیں۔

حضرت نے بھی نورِ ولایت سے اس گوہرِ یگانہ کو پہلی نظر میں پہچان لیا تھا کہ یہ بیعت کی درخواست کرنے والا ہے۔ انھوں نے فوراً سید محمد بقا شاہؒ کو اپنے سلسلہء قادریہ میں داخل فرمالیا۔ توجہ فرما کر پہلی ہی نظر میں مالامال کر دیا، حضرت بقاؒ نے حضرت سید عبدالقادر آخرین کی صحبت و معیت کو ایک نعت غیر مترقبہ جان کر اپنے گھر کو خیر باد کہا اور پیر مرشد کے ساتھ سیر و سیاحت میں لگ گئے۔

حضرت آخرین جب مقام پیر کوٹ پہنچے تو یہ اشارۂ غیبی وہیں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ کچھ عرصہ بعد سید محمد بقا شاہؒ کے دل میں اپنے گھر جانے خواہش پیدا ہوئی۔ آپ نے مرشد مکرم سے اجازت طلب کی۔ حضرت شیخ نے اجازت دے کر فرمایا، اپنے گھر سے جب تم واپس آنے لگو تو روہڑی سے ہمارے لیے مسواک ضرور لے آنا۔

سید محمد بقا شاہؒ وہاں سے رخصت ہو کر اپنے گھر پہنچے۔ مگر ابھی چند روز ہی گزرے تھے کہ مرشد کی یاد نے بے قرار کر دیا اور آپ حاضری کے لیے پیدل روانہ ہو گئے۔ غلبہ اشتیاق میں مستانہ وار چلے جا رہے تھے، یہاں تک کہ آپ رشید پور جا پہنچے۔ وہاں مسواک یاد آ گئی۔ پشیمان ہو کر الٹے قدم پہنچے تا کہ مرشد کی جانب پیٹھ بھی نہ ہونے پائے۔ چند مسواکیں بنائیں اور دیوانہ وار پیر کوٹ پہنچ کر حضرت شیخ کے قدموں پر جا گرے۔ حضرت نے فرمایا: محمد بقا شاہؒ تم کو ہماری خاطر بہت مشقت اٹھانی پڑی عرض کی: قبلہ! بندہ کے نزدیک تعمیل ارشاد میں راحت ہی راحت ہے حضرت شیخ نے بہ کمال مسرت کو سینے سے لگالیا۔ اور فرمایا اب میں تمھیں اور تمھاری اولاد کو یہاں پہنچنے کے لیے دور دراز کا سفر معاف کرتا ہوں،،۔ (۲)

مناسب ہے کہ یہاں ''سندھ کے صوفیائے نقشبند'' (حصہ دوم) سے بھی استفادہ کر لیا جائے، اس کے صفحہ ۵۱۱، پر

درج ہے:

''آپ نے چھوٹی عمر ہی میں دینی تعلیم مکمل کر لی تھی، علمِ شریعت کی تحصیل سے فارغ ہونے کے بعد علم طریقت کی تحصیل کی طرف آپ متوجہ ہوئے، اور اس کے لیے آپ نے قادری سلسلے میں حضرت پیر عبدالقادر حسینی جیلانی کے ہاتھ پر بیعت کی آپ کے یہ مرشد صوبہ پنجاب میں ضلع جھنگ کے ایک گاؤں سوڑھانی، کے رہنے والے تھے، اور شیخ سید صالح شاہ کے مرید اور خلیفہ تھے، آج کل یہ مقام چنھاں شریف، کی درگاہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اپنی روحانی تشنگی اور پیاس بجھانے کے لیے آپ نے صرف اسی پر قناعت نہیں فرمائی بلکہ سلسلۂ نقشبندیہ کے فیوض و برکات حاصل کرنے کے لیے آپ نے اس وقت سندھ میں ریاست خیر پور کے ایک کامل بزرگ حضرت مخدوم محمد اسمٰعیل پریاں لوئی (جو قصبہ پریاں لو، میں رہتے تھے،) کے ہاتھ پر بیعت کی اور اس نقشبندی سلسلے کے فیض سے اپنے قلب کو منور اور مستنیر کیا... علم شریعت وطریقت کی تکمیل کے بعد آپ مخلوقِ خدا کی فیض رسانی کی طرف متوجہ ہوئے چناں چہ دینی کتب کی تدریس کے ساتھ ساتھ علم باطن اور تصوف کی تعلیم بھی آپ نے دینی شروع کردی اور مخلوق کو علم ظاہری اور باطنی سے خوب سیراب کیا۔'' (۳)

''تذکرہ مخادیم کھڑہ'' کے مطابق محمد اسمٰعیل پریاں لوئی کے انتقال کے بعد حضرت محمد بقا نے اپنی ارادت اور عقیدت کا سلسلہ مخدوم احمدی سے قائم کیا اور ان کے مکتبہ فکر سے فیض یاب ہوئے۔ گویا معلوم ہوا کہ مرحوم و مغفور نے مختلف اوقات میں اپنے وقت کے جید علماً، اکابر مشائخ اور عظیم صوفیا سے کسب فیض کر کے آپ طریقت و حقیقت کے اعلیٰ مقام پر پہنچ گئے اور تصوف کے منزلیں طے کرتے ہوئے اپنے وقت کے عرفاء کہلائے۔ (۴)

یہ اسلام سے محبت، مرشد سے عقیدت اور اسلاف کی سنت جو محمد بقا شاہؒ میں بہ درجہ کمال موجود تھی۔

اس وقت میں چھاپے خانے نہیں تھے، لہٰذا محمد بقا شاہؒ نے کئی کتابیں تصنیف کی تھیں، جو قلمی تھی، اس کے علاوہ جو کتب آپ کے مطالعے میں رہیں، اور آپ کی زندگی پر جن کتابوں کا خاص اثر ہوا، وہ کتابیں (قلمی نسخے) آپ نے اپنے پاس نقل کر لیے یہ متعدد نسخے آپ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتے تھے۔ جب کبھی موری جگہ بغرضِ تبلیغ جایا کرتے تو بھی یہ نسخے ہم راہ ہوتے تھے، روایت یہی عام ہے کہ ایک مرتبہ آپ سفر پر روانہ تھے علاقہ سنسان اور ویران تھا، سر پر قلمی نسخوں کا گٹھا تھا،

رہزنوں نے جانا کہ مسافر مالِ تجارت لے جارہا ہے، آپ پر حملہ کر دیا، اور آپ ۱۰، محرم الحرام ۱۱۹۷ھ، کو شہید ہوئے، شاہ صاحب مرحوم نے ۲۳ برس کی عمر پائی، شیخ طیب ریاست خیر پور میں سپردخاک کیے گئے۔ تحقیق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے قاتلوں کو پہچان لیا تھا مگر حضرت مظہر جانِ جاناں کی طرح انھیں معاف کر دیا تھا۔

آپ کی شہادت کے ذکر کے ساتھ ایک قطعہ تاریخِ وفات بھی ملتا ہے جو ''تذکرہ مشاہیرِ سندھ'' (تالیف مولانا دین محمد وفائی) میں شامل ہے جس سے استفادہ بقا صاحب سے متعلق اس تحریر کے آخر میں کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم مذکورہ کتاب سے استفادہ کرتے ہوئے ایک طویل اقتباس بھی پیش کریں گے جس سے معلوم ہوگا کہ آپ نے دینی خدمت میں کس انداز اور رویے کو کس طرزِ حیات اور اندازِ تربیت وتدریس کو اختیار کیا۔

نیز اس اقتباس میں آپ کے حالاتِ زندگی کے علاوہ چند اقوال (ملفوظات) اور آپ کے معروف خلفاءِ اکرام کے اسماء کو بھی پیش کیا گیا ہے، لیکن اس اقتباس کو پیش کرنے سے پہلے آپ کے بچوں سے متعلق عرض ہے کہ آپ کے بچوں کے بارے میں متضاد بیانات ہیں، ایک صاحب زادے حضرت علی مرتضیٰ شاہ کے بارے میں ہے کہ یہ ایک نو مسلم خاتون کے بطن سے تھے، لیکن محض روایات سے کوئی نتیجہ نکالنا بہت دشوار ہے کہ اس ضمن میں تاریخ خاموش ہے۔ البتہ ایک بات وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ اور وہ ہے آپ کے تین صاحب زادوں کے اسماً، یہ زیادہ مشہور ہوئے، اور یہ اپنے والد کے نقش قدم پر قائم رہے ان کے اسماً یہ ہیں۔ (اگر چہ ہم نے شجرے میں چاروں بیٹوں کے نام درج کیے ہیں)

(۱) حضرت سید محمد راشد شاہ روضے دھنیؒ

(۲) حضرت سید عبدالرسول شاہؒ

(۳) حضرت سید محمد سلیم شاہؒ

اب آتے ہیں ہم ''تذکرہ مشاہیرِ سندھ'' حصہ دوم تالیف مولانا دین محمد وفائی مرحوم کی جانب جس کا ذکر ہم نے متذکرہ تحریر میں کیا۔

"محمد راشد روضي ڌڻي رحمت الله عليه جو والد ۽ راشدي خاندان جو مورث اعليٰ. سندن وڏا لڪعلوي مان لڏي اچي سائدي (ديهه گاگڙي هاٽي تعلقه گمبٽ) ۾ مقيم ٿيا. ان کانپوءِ سيد صاحب پنهنجن عزيزن کان جدا ٿي، رحيم ڏني ڪلهوڙي جي ڳوٺ ديهه فريدآباد ۾ اچي ويٺو.

(رحيم ڏني ڪلهوڙي جي نيائيءَ جي اولاد مان ڳڙهي ياسين تعلقه ۾ وڏيرن جو خاندان آهي، جن جون اڃا تائين راشدي خاندان سان مائٽيون آهن.)

رحيم ڏني ڪلهوڙي جي ڳوٺ ۾ رهڻ وارن ڏينهن ۾ پير صاحب جناب مخدوم اسماعيل پريالوءِ واري سان نقشبندي طريقي ۾ بيعت ڪئي ۽ سندن سلسلو هيٺئين ريت امام رباني مجدد الف ثاني سان وڃي رسي ٿو.

پير سيد محمد بقا لڪياري مريد مخدوم اسماعيل (متوفي——) جو اهو خواجه جمال الله سنڌي جو اهو حافظ حاجي ايوب سنڌي جو اهو مريد شيخ سعدي لاهوري جو اهو سيد آدم بنوري (متوفي ——) اهو حضرت امام رباني شيخ احمد مجدد الف ثاني جو.

هڪ دفعي مخدوم اسماعيل رح ڪيس فرمايو ته تنهنجي بيعت هڪ ٻئي بزرگ سان به ٿيڻ واري آهي هو تو وٽ مسافر ٿي اچي مقيم ٿيندو ان کان توکي فيض ۽ هدايت حاصل ٿيندا. پير صاحب عرض ڪيو ته انجي سڃاڻپ جي ڪهڙي علامت آهي؟ مخدوم صاحب فرمايو ته هنجي سامهون ڪامئل شئي زنده ٿي پوندي. پير محمد بقا وٽ مينهون هيون. جن تي پاڻ به گذران ڪندو هو ۽ مهمانن ۽ مريدن کي ماني کارائيندو هو. هڪ دفعي بغداد جو پير سيد عبدالقادر ثاني (متوفي ١١٩٠) سنڌ جو سفر ڪندو، روهڙي شريف ۾ موءِ مبارڪ جي زيارت لاءِ آيو ۽ ان کانپوءِ پير محمد بقا جو مهمان ٿيو ۽ برده کي زنده

ڪرڻ واري علامت وٽانئس ڏسڻ ۾ آئي. جنهن ڪان پوءِ قادري طريقه ۾ سائنس بيعت ڪيائين .

ڪن ماڻهن جو چوڻ تہ هڪ ٻلي رستي ۾ پيل هئي، سا سيد عبدالقادر بغدادي ثاني جي ڌڪي سان زنده ٿي پئي . گلزار قادري جي مصنف لکيو آهي، بغدادي پير صاحب ڪي مهماني ۾ مڇي تريل ۽ ماني ڏني وئي. جنهن تي بغدادي صاحب فرمايو تہ ميان محمد بقا مڇي تہ جٺري آهي. اها ڪيئن کائڻ لاءِ آندي اٿو. عرض ڪيائين تہ سائين مان تہ ترائي ڪٽي آيو آهيان. پوءِ ڏنو ويو تہ مڇي جون ڪرڙيون ڦٽڪي ٻاهر ٽپڻ لڳيون . ان ڪان پوءِ حضرت محمد بقا صاحب بہ پنهنجي مرشد جي بيعت ۾ هم رڪاب ۽ هم سفر رهيو. آخر بغدادي پير صاحب ضلع جهنگ پنجاب جي ڳوٺ سڏانہ ۾ اچي مقيم ٿيو. ۽ هميشه اتي رهڻ جو ارادو ڪيائين. جنهن ڪان پوءِ جڏهن پير محمد بقا صاحب ڪانئس رخصت وٺي ڳوٺ موٽڻ لڳو، تڏهن مرشد صاحب فرمايس تہ جڏهن واپس اچو تڏهن رامڙ (روهڙي) جا ڏندڻ پاڻ سان آڻجو جناب پير محمد بقا صاحب ڳوٺان ڪم ڪار لاهي دوباره مرشد جي ملاقات لاءِ روانو ٿيو. تڏهن پير ڪوٽ (سڏانہ) جي ٻاهران ٻہ ميلن پهچڻ وقت پنهنجي مرشد جي ڏندڻ آڻڻ وارو ارشاد ياد پيو. جنهن تي ڏاڍو افسوس ٿيس تہ هاڻي مرشدن کي ڪهڙو جواب ڏيندس . آخر پڪو ارادو ڪري وري سنڌ ڏانهن واپس وريو. ۽ هلندي هلندي اچي روهڙي وٽان ڏندڻ هٿ ڪيائين ۽ جنهن ڪان پوءِ منزلون طئہ ڪندي آڻي مرشد جي خدمت ۾ حاضر ڪيائين .

پير عبدالقادر ثاني ميان صاحب کي ڳلي لڳايو ۽ نهايت قرب ۽ محبت سان پيش آيو. ارشاد فرمايائين تہ آئينده اوهان ۽ اوهانجي اولاد تان اسان ڏانهن سفر ڪرڻ معاف آهي. هي بہ ارشاد فرمايائين تہ تنهنجي

اولاد ۾ غوث ۽ قطب پيدا ٿيندا، جيئن تہ ائين ٿيو. ان ڪانپوءِ پير ميان محمد بقا کي ڪجھ تبرڪات ڏئي سنڌ ڏانهن رخصت ڏنائون جنهن صاحب سنڌ ۾ رهي سون ماڻهن کي قادري ۽ نقشبندي طريقن تي فيض پهچايو.

زندگي جو سمورو پويون حصّو فقط مهمان نوازي ۽ ياد خدا ۾ گذاريندو رهيو.

هڪ دفعي شيخ طيب جي قبرستان لڳ هڪ مسجد ۾ پٿر جي وڏن داڻن واري تسبيح ڦيرائي خاموش ذڪر ڪري رهيو هو. داڻن جو ٺهڪو يا ڪڙڪو بلند ٿي رهيو هو. رستو ويندي ڪن چورن ڪڙڪو ٻڌي گمان ڪيو تہ شايد ويران مسجد ۾ ڪو ماڻهو رپيا ڳڻي خزانو پوري رهيو آهي جنهن تي هن بزرگ تي بيخبري ۾ ڪاهي آيا ۽ ڪيس ترارن جا ڌڪ هڻي شهادت جي درجي تي پهچايائونس. مگر پوءِ ڏنائون تہ الله واري وٽ ڇا رکيو هو؟ ڪنهن شاعر سندس شهادت جو قطعہ تاريخ هيئن ريت لکيو آهي:-

چون سيد محمد بقا شد شهيد
حلاوت از رحمت الاهي چشيد
بسي بود نافع بهر خاص و عام
کزو زود طالب فدا شد رشيد
خرد سال تاريخ او در دلم
بگفتا بدرجہ شهادت رسيد

١١٩٨

پنهنجي پويان چار فرزند ڇڏي ويو. (١) سيد عبدالرسول شاهہ (٢) سيد ميان عبدالسليم شاهہ (٣) پير سيد محمد راشد شاهہ صاحب (عرف روضي ڌڻي) (٤) پير سيد عليؑ مرتضيٰ شاهہ صاحب رحہ

حضرت سید محمد بقا شہیدؒ کے پاکیزہ خیالات:-

(۱) اپنے مریدوں کی دینی واخلاقی تربیت کی، اور انھیں ذکرِ الٰہی میں منہمک رہنے کی تلقین فرمائی۔

(۲) سید صاحب مرحوم نے فرمایا: میرے بعد دستار کا مالک وہ ہوگا جو سب سے زیادہ متقی اور پرہیزگار ہوگا۔

(۳) آپ سب ایک دوسرے سے اتفاق کے ساتھ رہیں اور دینِ اسلام کے لیے کام کریں۔

(۴) شریعت پر چلنا، حقوق اللہ اور حقوق العباد کو انجام دینا، لوگوں سے کبھی نذرانہ وصول نہ کرنا، اللہ پاک نے جو رزق دیا ہے وہ ملتا رہے گا۔

(۵) ایمان داری اور انکساری ہمارے مسلک کی بنیاد ہے۔

(۶) نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر جاری رکھنا، یہی علم ہے جو ہم سب کے لیے ضروری ہے۔

(۷) نفس پرور اور شکم سیر طلب حق عارف اور کامل ہونے کے بہ جائے غافل اور کاہل ہو جاتا ہے۔

(۸) اگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے مجھے جنت عطا کی تو بہ خدا اپنے قاتلوں کو ساتھ لیے بہ غیر جنت میں نہ جاؤں گا، اس لیے کہ یہی میری شہادت کا سبب بنے ہیں۔

(۹) نیکی کبھی ضایع نہیں ہوتی، بدی انسان کو ضایع کر دیتی ہے۔(۶)

(۱۰) جس مدرسے میں پر تکلف کھانا موجود رہتا ہو، وہاں تحصیلِ علم محال ہے۔

(۱۱) اچھا کھانا نفس طلب کرتا ہے اور خوب عبادت قلبِ پاکیزہ۔

(۱۲) بندگی کا اصل لطف انکساری میں ہے۔

ان خیالات سے سید محمد بقا شہیدؒ کی زندگی میں استقامت، عبارت نیکوکاری، اور اسلام سے سچی محبت کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ جس میں توکل بنیادی چیز ہے۔

ان پاکیزہ خیالات کی توسیع ان کے فرزندوں کی حیات وخدمات میں دیکھی جا سکتی ہیں، تین فرزندوں میں بالعموم اور سید محمد راشد روضے دھنیؒ کی پاکیزہ، باشریعت اور متحرک زندگی میں بالخصوص نظر آتی ہے۔

حواشی

(۱) مترجم،محمد رمضان علی قادری ''مخزنِ فیضان'' جمعیت علمائے سکندریہ مطبوعہ ۱۹۸۷ء ص ۳۸۸ تا ۳۹۰

(۲) ایضاً ص ۳۹۰

(۳) صاحب زادہ ابوالخیر محمد زبیر، ڈاکٹر ''سندھ کے صوفیائے نقشبند'' رکن اسلام پبلی کیشنز حیدرآباد مطبوعہ ۱۹۹۷ء ص ۵۱۱

(۴) تذکرہ مخادیم اور تذکرہ پیران پاگارا ''تبسم چودھری'' کنگری پرنٹرس حیدرآباد ۱۹۷۵ء

(۵) ''تذکرہ مشاہیر سندھ'' تالیف مولانا دین محمد وفائی مرحوم حصہ دوم سندھی ادبی بورڈ جامشورو حیدرآباد مطبوعہ ۱۹۸۵ء ص ۱۰۴ تا ۱۰۶۔

(۶) یہ نکات مرتب کرنے میں مخزنِ فیضان سے بھی استفادہ کیا گیا ہے۔

حضرت محمد راشد شاہؒ (روضے دھنی) (م،۱۲۳۴ھ)

سید محمد بقا شہیدؒ کے گھر گوٹھ رحیم ڈنہ کلہوڑا میں یکم شعبان، ۱۱۷۰ھ کو سید محمد راشد شاہؒ پیدا ہوئے۔ (گوٹھ رحیم ڈنہ کو اب پرانی درگاہ کہتے ہیں) بعد از انتقال جب آپ کے مزار مبارک کا گنبد بنا تو آپ کی شہرت ''روضے دھنی'' کے لقب سے ہوئی، قیاس یہی ہے کہ درگاہ بہ معنیٰ ''روضہ'' کی رعایت سے آپ کو ''روضے دھنی'' کہا گیا ہوگا۔

آپ کے بچپن سے متعلق ایک اور روایت عام ہے، جو تبسم چودھری نے بھی اپنی تصنیف کے صفحہ ۹۲ پر درج کی ہے۔ اس روایت کا بیان کرنا بھی بے محل نہ ہوگا۔

> ''ابھی آپ کا بچپن تھا کہ سید محمد راشد شاہؒ کے والد سید محمد بقا شہیدؒ کے پیر و مرشد حضرت مخدوم اسمٰعیل نقشبندی مجدّدی آپ کے گوٹھ میں تشریف لائے۔ والد گرامی نے اپنے پسر کو مرشد کے سامنے پیش کیا اور دعا کی درخواست کی، مخدوم اسمٰعیلؒ آپ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ آپ کا نام پوچھا، بتایا گیا کہ سید محمد راشد شاہؒ نام ہے، مخدوم نے خادم سے کہا، بہت اچھے ہوں گے۔ راشد کا مطلب بھی اچھے کے ہیں۔ پھر آپ کو گود میں لے کر دعا دی پیار کیا، ارشاد فرمایا کہ یہ وہ مبارک روح ہے جس سے دنیا کا بہت بڑا حصہ فیض یاب ہوگا''۔

اہلِ اللہ بصیرت و بصارت کی دولت سے مالا مال ہوتے ہیں، اللہ نے اس ارشاد اور دعا کو شرف قبولیت بخشا، اور ساری زندگی تقویٰ اور پرہیز گاری میں گزری۔ آپ ابتداء ہی سے طفلانہ شرارتوں سے دور اور بزرگانہ انداز میں فکر سے قریب تھے۔ ہر بات کی اصل تک پہنچے ہر شے کی حقیقت کو سمجھنے اور ہر حکایت کی تہہ تک پہنچے کی کوشش کرتے، یعنی غور و فکر آپ کی زندگی میں شامل تھا، والد صاحب خود عالم، فاضل، متقی اور پاک باز تھے چناں چہ انھی خطوط پر آپ کی تربیت کی گئی۔ اور آپ کی تعلیم کا اہتمام کیا گیا۔

ابتداء میں آپ کو حضرت حافظ زینؒ کے پاس بٹھایا گیا، اور اس کے بعد حضرت مولانا فقیر اللہ علوی نقشبندی (م،۱۱۹۵ھ) کی خدمات میں شکار پور بھیج دیا گیا۔ ایک عرصے تک آپ اس مکتب میں زیر تعلیم رہے، اور بزرگوں کی صحبت سے فیض یاب ہوتے رہے لیکن جب آپ کے والد صاحب ایک بار مدرسے پہنچے محض خیریت طلب کرنے اور تعلیم سے

متعلق معلومات کرنے ،تو آپ نے دیکھا کہ اس مدرسے میں بالخصوص سید راشد صاحبؒ کے لیے کھانے کا خاص اہتمام ہوتا ہے، ان کی تکریم میں کوئی کمی نہیں لاتا، آپ کے آرام اور ضرورتوں کا بہت زیادہ خیال رکھا جاتا ہے، جب یہ اہتمام والتزام دیکھا تو فرمایا، جہاں طالب علم کے لیے اس کی توقعات سے بڑھ کر آسائش زندگی ملے وہاں علم کم آسائش کی فکر زیادہ رہتی ہے، یعنی آپ نے یہ گوارا نہیں کیا کہ ان کا بچہ حصولِ آسائش زندگی میں لگ جائے۔ لہٰذا آپ نے یہاں سے اپنے بیٹے کو اٹھالیا اور کوٹڑی کبیر میں مخدوم میاں یار محمدؒ کے پاس تحصیلِ علم کے لیے چھوڑ دیا۔ جو خود بہت بڑے عالم، فاضل، مدرس اور پائے کے بزرگ تھے۔ ان کی صحبت میں سید محمد راشد شاہؒ کو خوب روحانی فیض بھی حاصل ہوا۔

تصوف کا مطالعہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ سالک کو عموماً دو کیفیات سے واسطہ رہتا ہے، جس میں سے ایک کیفیت قبض ہے یعنی انقباض اپنے میں سالک کی عام زندگی ساکن معلوم دیتی ہے، ذکر کے علاوہ کسی چیز میں دل نہیں لگتا، ہر چیز رکی ہوئی، اور طبیعت میں ٹھہراؤ آجاتا ہے تصنیف وتحریر، تقریر وتشریح بھی اگر سالک چاہے تو نہیں ہو پاتی، جب اس مدرسے محض ارتکاز اور ذکر ہی کی بدولت سے نکل جاتا ہے تو دوسری کیفیت بسط کا دروازہ کھل جاتا ہے، یہاں معمولا ت زندگی بحال ہوجاتے ہیں، طبیعت میں نشاط اور آمادگی پیدا ہوجاتی ہے۔

ہر تمہید بیان کرنے کا مقصد یہ کہ آپ سے متعلق روایت ہے کہ جب آپ مخدوم میاں محمد صاحب علیہ الرحمۃ کی خدمت میں تھے اور ابھی یہاں زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ کیفیت انقباض کا اثر ہوا، اور آپ نے پانچ مرتبہ درود پاک پڑھ کر نبی آخر الزماں حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے رجوع فرمایا اور استغاثہ کیا، جس سے آپ پر کیفیت بسط کا دروازہ کھل گیا، اور معمولات زندگی بحال ہوگئے۔

اس کم عمری میں یہ ارتکاز، یہ فکر، یہ پرواز، یہ ادا، اور یہ انداز بتاتا ہے کہ سالک کا اندرون کس قدر منور اور بصیرت افروز روح ہے، یہی وجہ ہے کہ آپ یہاں سلوک کی منازل بڑی تیزی سے طے کی۔

لیکن سند علومقصبہ عاریجا کے بزرگ محمد سے حاصل کی کوٹڑی کبیر تحصیل کنڈیارو میں ایک قصبہ ہے جہاں اس رؤر میں ایک بہت مشہور تاریخی درس گاہ تھی۔

پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے دو ہم درس سید عاقل شاہ گیسوئے دراز اور مخدوم محمد داؤد اسی تاریخی دینی درس گاہ سے فیض یاب ہوئے۔ اور اپنے دور میں ہی اپنی پرہیزگاری اور علم کی وجہ سے مشہور ہوئے۔ آپ نے ۱۲۳۳ھ میں ۶۳

سال کی عمر میں گوٹھ رحیم ڈنہ کلہوڑا میں وفات پائی'' ص ۳۳

کوٹڑی کبیر میں پیر محمد راشدی کے حصولِ تعلیم کے عہد سے متعلق ایک روایت مشہور ہے:

''جس درخت کے نیچے چٹائی پر بیٹھ کر مخدوم یار محمدؒ اُن کو درس دیتے تھے اس درخت پر کوؤں نے اپنے گھونسلے بنائے ہوئے تھے، جب درس وتدریس کا سلسلہ جاری رہتا تو کووے اپنی فطرت کے مطابق غلاظتِ خفی پھینکنا شروع کردیتے، جس سے تنگ آکر ایک دن آپ کے استاد نے آپ کو حکم دیا کہ درخت پر چڑھ کر ان کے گھونسلے نیچے پھینک دو، فرمابردار شاگرد جو معصومانہ عمر میں تھا اور اس دور کے مطابق سر کے بال صاف کیے ہوئے تھا استاد کا حکم پاتے ہی درخت پر چڑھ گیا اور گھونسلے نیچے پھینکنا شروع کردیے کوؤں نے اپنی خصلت کے مطابق ان کے منڈھے ہوئے سر پر اپنی چونچوں سے حملہ کردیا۔ اتنا شدید حملہ کیا کہ جب آپ درخت سے نیچے اترے تو سارا سر لہولہان تھا، یہ عالم دیکھ کر آپ کے استاد نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور دعا دی کہ آج جس طرح کووے تیرے سر پر حملہ آور ہوئے ہیں، کل سیکڑوں، ہزاروں لوگ تیری سر بلندی اور وقار کے معترف ہوں گے''۔(۱)

اس واقعے سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں پہلی تو استاد کی پیشن گوئی جو حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوئی، اور سیکڑوں نہیں لاکھوں افراد سید محمد راشد روضے دھنی کی عزت وتکریم کرنے والوں میں شامل ہوئے، دوسری بات یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاگرد اپنے استاد کے حکم کی پاس داری کس طرح کرتا ہے نا زخموں کی پروا نہ تکلیف کا احساس نہ جان کا خوف۔ بس تعمیلِ ارشادِ استاد میں مخلص ومستعد، جب بچپن میں بزرگوں کا ایں جانب سے احترام کا یہ انداز ہے تو قابلِ غور امر ہے کہ اس کا اثر عالمِ عنفوانِ شباب میں کیا ہوگا۔

پیر محمد راشدؒ کی زندگی کا مطالعہ کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ آپ صرف اور صرف ملفوظی بزرگ نہیں تھے یعنی صرف گفتگو اور تقریر سے لوگوں میں نیکی کا عمل پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے تھے، بلکہ اپنے کردار اور عمل سے بھی ایسا ہی ظاہر کرتے تھے، یعنی جو کہا وہ اختیار بھی کیا۔ یہی عمل سنت ہے جو کہو ویسا کرو، قرآنِ پاک میں ارشاد ہوتا ہے:

''تم لوگ ایسا کہتے کیوں ہو، جیسا کر نہیں سکتے۔ بس وہی کہو جیسا کرو اسی کا اجر ہے''۔ لہٰذا راشد شاہؒ نے بھی اسی حکمت کو اپنی زندگی کا حصّہ بنایا ہوا تھا۔ اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ آپ نے سنتِ محمدی ﷺ کا اتباع حد درجے نظر آتا

ہے۔آپ ﷺ کے معمولاتِ زندگی پر سید محمد راشدؒ کی ایسی گہری نگاہ تھی کہ ایک چھوٹا سا واقعہ بھی آپ اسی طرح اختیار کرتے تھے،ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ سید محمد راشدؒ مریدوں کے ہمراہ گھوڑوں پر سوار تھے،ایک پگنڈی سے گزر رہے تھے کہ راہ کے درمیان میں ایک درخت آ گیا، کچھ لوگ درخت کے دائیں گزرے اور کچھ بائیں سے جوں ہی آپس میں ملے آپ نے درخت کی دوسری طرف سے آنے والوں کو سلام کیا۔مریدوں نے دریافت کیا ہم تو آپ کے ساتھ سفر میں شریک ہیں اس وقت کا سلام کا سبب ارشاد فرمایئے۔راشد صاحبؒ نے کہا۔

''میں نے سنا ہے کہ ایسا اتفاق حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ میں بھی آیا تھا تو آپؐ نے صحابہ اکرام رضوان اللہ علیہم سے ایسا ہی فرمایا تھا، میں ان کی اس سنت کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتا تھا''۔

ابوالخیر محمد زبیر نے بھی اپنی تصنیف میں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے وہ لکھتے ہیں:

''حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کے روحانی عقیدت محبت اور قلبی وابستگی کا یہ عالم تھا کہ جب آپ کو کوئی مشکل درپیش ہوتی تو آپ درود شریف کثرت سے پڑھ کو حضور کی بارگاہ میں عرض کیا کرتے تھے،تو وہ مشکل اسی وقت آسان ہو جاتی تھی، چناں چہ جس زمانے میں کوٹڑی کبیر کے اندر آپ مخدوم میاں یار محمد کے پاس تحصیلِ علم فرما رہے تھے ایک روز آپ کی طبیعت میں انقباس پیدا ہو گیا، اس کے حل کے لیے آپ نے رات کو ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر پانچ ہزار مرتبہ دورد شرف پڑھ کر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور استمداد اور استغاثہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی وقت قبض کی کیفیت دور ہو گئی اور بسط کا دروازہ کھل گیا، اور طبیعت میں نشاط وانبساط اور کیفیت وسرور کی لہر دوڑنے لگی... اتباع رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور متابعت سنت نبوی کا آپ کو کس قدر خیال تھا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ایک روز آپ اپنے مریدین کے ہمراہ دریا کی طرف تشریف لے جا رہے تھے تا کہ مسجد کی چھت کے لیے سرکنڈے کٹوا کر لائیں راستے میں آپ نے مریدوں کے سامنے اپنی یا عزت یا مشیخیت کی پروا کیے بغیر سید مرتضیٰ شاہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام لیا اور فرمایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اکثر اوقات اپنے صحابہ کرام کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر سفر کیا کرتے تھے۔لہٰذا آؤ آج ہم بھی اس سنت کی متابعت کرتے ہیں یہ فرما کر آپ نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامے ہوئے تقریباً آدھے کوس تک سفر فرمایا۔اور سنتِ نبی کی متابعت سے اپنے قلب کو منور و مستنیر فرمایا۔''(۲)

دینی خدمات

(۱) لوگوں کی ذہنی واخلاقی تربیت میں بہت کام کیا۔

(۲) مدرسوں کا قیام جو علم وعرفان کا مرکز بن گئے تھے۔

(۳) اپنی تصنیفات کے ذریعے لوگوں میں علم وادب اور اسلامی رجحانات کو فروغ دیا ان تصنیفات میں۔

(۱) شرح اسمأ الحسنیٰ

(۲) جمع الجوامع

(۳) مکاتیب اور ملفوظات

پیر سائیں روضے دھنیؒ کا جذبہء خدمات اسلام کو اگر دیکھنا ہے تو ان کے ملفوظات کا مطالعہ بہت ضروری ہے، ان میں تجربات، شرعی احکامات م، قرآنی تعلیمات، تجزیہ حیات اور تشریح کائینات کے رموز پوشیدہ ہیں۔ ان ملفوظات کو آپ نے دو خلفا یعنی خلیفہ محمد حسین مہسر اور خلیفہ محمود نظامانی کڑیہ والے نے الگ الگ جمع کیے، پھر مختلف اوقات میں اس کا سندھی، اردو، اور کئی زبانوں میں ترجمہ ہوا، یہاں ان کے ملفوظات کا انتخاب مع پس منظر وتعارف پیش کیا جاتا ہے۔

سید محمد راشد شاہؒ پیر سائیں روضے دھنی، یکم شعبان، ۱۲۳۳ھ کو ۶۳ سال کی عمر میں آپ کا وصال ہوگیا۔ پرانی درگاہ شریف گوٹھ رحیم ڈنہ کلہوڑا میں مدفن ہوئے، لیکن کچھ عرصے بعد حضرت سید علی گوہر شاہؒ نے دریا میں سیلاب اور طغیانی کا خطرہ دیکھتے ہوئے آپ کا تابوت وہاں سے، ٦، ربیع الاوّل، ۱۲۵۰ھ کو نکال کر موجودہ درگاہ شریف میں مدفون کیا۔

پیر سائیں روضے دھنیؒ ایک مکتب فکر کا نام ہے، جس سے وابستہ متعدد افراد کی کایا پلٹ گئی۔ اس لیے کہ پیر صاحب نے اپنی زندگی کو ایک نمونے طور پر اپنے سے وابستہ افراد کے سامنے رکھا ہے۔ اور اپنی تعلیمات، حکایات اور تحریکات کو عملی طور پر پیش کیا ہے۔ ہمیں ایسی مثالیں بھی مل جاتی ہیں، جس کی بابت آپ کے ملفوظات کو آپ کی زندگی کے آئینے میں دکھایا گیا ہے۔ اس کے بعد ایک سلسلہ قائم ہوجاتا ہے جو دو سمتوں میں آگے چلتا ہے۔ ایک وہ راستہ جو آپ کا خاندانی سلسلہ ہے، اور دوسرا آپ کے عقیدت مندوں، ارادت مندوں اور آپ کے معتقدوں سے آگے چلتا ہے۔

ملفوظات سے متعلق چند باتیں

اللہ تعالیٰ نے اپنی آخری الہامی کتاب ''القرآن الحکیم'' میں جا بہ جا اولیأ اللہ کی صفات گنائی ہیں۔ کہیں بتایا ہے کہ وہ خاموشی اور بلند آہنگی سے اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے ہیں، کہیں یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ولی (دوست) اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے، حتیٰ کہ بازار میں خرید و فرخت کے وقت بھی وہ ذکرِ قلبی سے غافل نہیں ہوتے اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں اولیأ کی یہ صفت بھی بیان کی ہے کہ اللہ کے ولیوں کو نہ صرف خوف ہوتا ہے اور نہ حُزن ملال۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کی مرضی کے تابع کر لیتے ہیں۔

سندھ میں بہت سے اولیأ نے اللہ کی اسی سنت کو زندہ کیا ہے۔ حضرت قبلہ روضے دھنیؒ بھی ایسے ہی برگزیدہ افراد میں سے تھے، جنھیں اللہ نے لوگوں سے محبت، بھلائی اور ان کی روحانی تربیت کے لیے بھیجا تھا۔ چناں چہ حضرت قبلہؒ نے پوری زندگی لوگوں کو اسلام کے جذبہء اخوت، امن، بھائی چارے اور صلح و آشتی کا درس دیا۔

یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ حضرت روضے دھنی صاحبؒ کے مریدوں اور عقیدت مندوں نے آنے والے زمانے کے لیے ان کے ارشادات کو تحریری صورت میں محفوظ کر لیا۔

مغلیہ عہد حکومت میں دربار کی زبان فارسی تھی۔ پورے ہندستان میں اس زبان کا چرچا تھا۔ اس زمانے کی تمام اہم علمی و ادبی کتابیں فارسی زبان ہی میں تحریر کی جاتی تھیں بل کہ اس عہد کی تہذیبی زبان فارسی ہی تھی۔ حضرت روضے دھنیؒ کے ملفوظات بھی فارسی زبان ہی میں مرتب کیے گئے۔

اب ان کو سندھی اور اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ ترجمے چھپ چکے ہیں اور آسانی سے دستیاب ہیں، ملفوظات کو سب سے پہلے آپ کے عقیدتمند محمد حسین مھیسر نے مرتب کیا تھا اس نسخے کو خصوصیت یہ ہے کہ پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ نے اسے مطالع فرمایا تھا۔ یہ مجموعہ ''ملفوظات صغیر'' کے نام سے مشہور ہے جب کہ دوسرا مجموعہ آپ کے خلیفہ فقیر محمود نظامانی نے مرتب کیا جو جامع ہے اور پہلے مجموعے سے زیادہ مشہور اور مقبول عام ہے۔

''پیر جو گوٹھ'' نے اب اسے شایع کر دیا ہے۔

حضرت محمد راشد روضے دھنی کے ملفوظات فیض، حکمت، شریعت، طریقت معرفت، حقیقت

،ادب ومحبت کے خزانے ہیں۔اس وقت درگاہ جوعظیم وشان مدرسہ ''جامع راشدیہ'' ہے،وہ عالموں ،مبلغوں مصنفوں،کاتبوں ،مدرسوں ،محققوں،کی بڑی جماعت تیار کررہی ہے (دوسو علمأ کرام تیار کیے) سندھ،بلوچستان ،پنجاب میں ہیں۔

انھوں نے دینی اور مذہبی تنظیم ''جمعیت علمائے سکندریہ'' کے تحت ملفوظات کی اشاعت کو اپنا دینی اورروحانی فرض سمجھا۔''

ملفوظات شریف حضرت روضے دھنیؒ

(۱) آپ نے فرمایا:

انسان میں چار گوہر ہیں۔

(i) (ایمان)۔اس کو ضایع کرنے والا ''جھوٹ'' ہے۔

الکذب مقراض الایمان (حدیثِ رسول اللہ ﷺ)

(ii) (عقل)۔اس کوختم کرنے والا ہے ''غصّہ''

(iii) (علم)۔اس کوختم کرنے والا ہے ''ریا''

(iv) (حیاء)۔اس کوختم کرنے والا ہے ''طمع''

(۲) آپ نے فرمایا نیت اچھی ہونی چاہیے۔

ایک شخص نے مسجد کے سامنے کیل ٹھوکی اس نیت سے کہ کوئی مسافر اس سے جان ور باندھے اور خود نماز پڑھے،اور دوسرے شخص نے وہ کیل نکال دی اس نیت سے کہ کوئی اٹک کر گر نہ جائے۔دونوں کی نیت اچھی تھی،اس لیے دونوں کا درجہ برابر تھا۔ ''الاعمالُ بنیات''

(۳) ذکر اس طرح کریں کہ ذکر اور ذاکر دونوں اللہ تعالیٰ میں فنا ہوں۔

(۴) ایک دن آپ باغ میں گئے اور میں بھی تھا تو عبدالکریم کبیرے نے کہا یہاں اتنے اونٹ اور بیل ہیں اور فقیر بھی ہیں کیوں نہ کام میں لائیں۔ تب آپ نے سوچ کر فرمایا کہ تم یہ کہہ رہے ہو مگر ہمارا گزر تو جاگیر پر بھی نہیں ہوگا۔ جیسے بچہ خود نہیں کھاتا تو والدین اسے کھلاتے ہیں جب خود کھانا شروع کرتا ہے تو اسے چھوڑ دیتے ہیں۔ سو ہمارا توکل اللہ پر ہے خود ہم کچھ نہیں کریں گے۔

(۵) حضرت نے فرمایا: ایک بزرگ کہیں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک ڈاکو رہتا تھا۔ وہ جس بھی مسافر کو دیکھتا تھا اس کو لوٹ کر مار دیتا تھا۔ جب ڈاکو نے ایک بزرگ کو دیکھا تو بزرگ پر حملہ کیا۔
بزرگ نے کہا، کیوں رزق کے لیے لوٹتے، مارتے ہو۔
آسمان میں تمھارا رزق ہے جس کا تم سے وعدہ کیا ہوا ہے۔
یہ سنتے ہی ڈاکو نے تلوار چھوڑ دی اور اپنے کیے پر غمگین اور پشیمان ہوا۔ پھر ہر روز اس کو کھانا، سونے اور چاندی کے برتن میں ملتا تھا۔ پھر اس نے حج بھی کیا۔ جب منیٰ پہنچا تو اس نے وہی بزرگ دیکھا اور کہا کہ پھر وہ آیت سنائیں۔ اور آیت سنتے ہی وہ اللہ کو پاک کو پیارا ہو گیا۔

(۶) میاں حافظ عصر، نصرپور کا رہنے والا کہتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا: کہ ایک عورت اور مرد توکل والے تھے۔ عورت حمل سے تھی۔ عورت، مرد سے پوچھا کہ ہونے والا بچہ توکل ہوگا یا نہیں۔ مرد نے کہا صبر کر، جب پیدا ہوگا تو پتا چلے گا۔ جب بچہ بڑا ہوا تو مرد نے عورت کو کہا، بچہ کو کہو کہ آنکھیں بند کرلے، ہاتھ اوپر کر کے اللہ پاک سے روٹی مانگے، تب تم اس کے ہاتھ پر روٹی رکھ دینا۔ عورت نے ایسا ہی کیا، بچے نے روٹی کھائی۔ روز بھی کرتی تھی، ایک دن بچہ نے کہا کہ اب میں خود خدا سے روٹی مانگوں گا، ایک دن جنگل میں چند دوستوں کے ساتھ کام سے نکلے کام سے فارغ ہونے کہ بعد سب نے روٹی کھانے کے لیے نکالی۔ اس سے کہا تمھاری روٹی کہاں ہے؟ اس نے کہا کہ میں اپنی روٹی (کھانا) اللہ پاک سے مانگوں گا، جب اللہ پاک سے مانگا تو ایک ٹرے میں طعام (کھانا) نازل

ہوا، یہ طعام کسی نے نہیں دیکھا تھا، دوست دیکھ کر حیران ہو گئے۔ اس کا توکل اور بڑھ گیا اور متوکل بنا ۔گھر آ کر والدین کو بتایا انھوں نے کہا کہ اس کا یقین کمال پر پہنچ گیا ہے۔ وہ مسجد میں جا کر عبادت کے لیے بیٹھ گیا۔

(۷) ہر دانے پر مہر ہوتی ہے کہ یہ کس کا دانہ ہے۔ اللہ پر توکل کر۔ حضرت نے فرمایا ایک قرآنِ پاک پڑھنے میں مشغول تھے: فَتَوَکَّلُوْا اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ

اس آیت کے بعد خیال آیا کہ ایمان کے بغیر توکل نہیں۔ پھر سب سامان چھوڑ کر چلے گئے اور پتے کھا کر گزارا کیا ایک دن میاں محمد اکرم'' جو ظاہری علم میں استاد اور پیر تجد دھنی تھا ہمارے گھر آئے، بچوں کو بھوکا دیکھ کر مجھے کہا، اگر تم درویش ہو گئے ہو تو ٹھیک ہے لیکن دوسروں کے حقوق کا بھی خیال رکھو۔ میں نے سوچا کہ بزرگ علم والا ہے، اشارے سے سمجھ جائے گا۔ پھر یہ آیت پڑھ کر سنائی۔

ترجمہ:- اے نبی! اپنے گھر والوں سے کہہ دے کہ اگر تم دنیا کی زندگی اور سینگار چاہتی ہو تو تمھیں گذران کا سامان دوں اور تم کو چھوڑ دوں، اور اگر تم اللہ اور رسولؐ اور آخرت چاہتی ہو تو پھر اللہ نے نیکوکار عورتوں کے لیے بہت بڑا اجر و ثواب تیار کیا ہے۔

میاں محمد اکرم نے اس آیت کے بعد سب کو اطاعت کا حکم دیا۔ کچھ دن ہم فاقے میں رہے ۔پھر اللہ نے اپنی مہربانی اور کشادگی فرمائی کہ ہم اور ہمارے تابعدار خوش و خرم رہے۔

حضرت نے اشارہ کیا کہ بی بی رابعہ بصریؒ کے پاس فقیروں کی جماعت مہمان بن کر آئے بی بی صاحبہ نے اپنے پاس سے کچھ نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی عادت تھی کہ روز مزدوری کر کے گزارا کرتی جو بچ جاتا وہ اللہ کے نام پر دے دیتی تھی۔ ان مہمانوں کے لیے دو روٹیاں پکائی تو دروازے پر صدا ہوئی کہ کچھ دو۔ انھوں نے ایک روٹی دی، پھر دوسری صدا ہوئی تو دوسری روٹی بھی دے دی۔

مہمان کہنے لگے کہ بی بی صاحبہ! ہمیں آپ کے کامل ولایت پر کوئی شک نہیں لیکن ظاہری علم بھی ضروری ہے، کیوں کہ یہ دو روٹیاں ہمارا حق تھا۔ رابعہ بصریؒ نے کوئی جواب نہیں دیا کہ دروازے

پر کوئی مال دار (۱۹) روٹیاں دے گیا، پھر بی بی نے فرمایا: کہ ایک روٹی کم ہے۔ ہماری (۲۰) روٹیاں ہیں۔

کیوں کہ اللہ پاک کا وعدہ بالکل صحیح اور سچا ہے کہ دس دنیا ستر (۷۰) آخرت پر نیکی کا اجر ہے۔
مہمانوں نے جب کھانا کھایا، تب بی بی صاحبہ نے فرمایا: کہ آپ عالم، کامل، زاھد، اور عابد ہیں لیکن اللہ پاک پر توکل نہیں رکھتے۔

تدبیر:-

(۱) خلیفہ میاں لقمان فرماتے ہیں: کہ ایک حضرت تجد دھنی کو عرض کیا کہ حضرت نے آخری بیماری میں کوئی کھانے، پینے کی چیز استعمال کی تھی یا نہیں؟ جواب دیا کہ: خلیفہ! حضرت کی عادت تھی کہ کوئی چیز مانگتے نہیں تھے۔

وصال کی بیماری میں ہر قسم کا طعام، چاول، روٹی، لسی، دودھ، سبزی وغیرہ دی۔
آخر میں لسی اور چاول خوب کھائے، آپ نے فرمایا: آج پیاس اور بھوک بہت تھی لیکن دل نے چاہا کہ سوال کروں، جب بہ غیر سوال کے اللہ پاک نے دیا تو کھایا بھی اور پیا بھی یعنی فقیر وہ ہے، جو کسی کا محتاج نہ ہو، نہ کسی غیر کے گھر جائے نہ اپنے گھر یعنی اللہ پاک سے بھی نہیں مانگے، جو روٹی کے لیے مرتا ہے وہ فقیر نہیں ہے۔

(۲) خلیفہ میاں امیر علی فرماتے ہیں: کہ ایک دن حضرت نے فرمایا: کہ طالب کو چاہیے کہ اپنے آپ کو رسمی تکلفات سے بے تکلف اور آزاد رکھے۔ اگر اپنے بچوں کے لیے کوئی چیز بنائی ہے۔ (کھانے) کی تو اس میں پانی زیادہ (شوربہ) کر کے مہمانوں کو بھی کھلا دے تو وہ بھی خوش ہو جائیں گے۔

پیر راشد روضے دھنی کی زندگی کے بعض واقعات ایسے بھی ہیں، جس کہ تحت آپ کو بلند سایہ بزرگ کہا جا سکتا ہے۔ اور یہ سب آپ کی عبادت، ریاضت، خدا ترسی، اخوت اور سنت رسولؐ کی

پیروی ہی کی وجہ سے ممکن ہوسکتا ہے۔ چناں چہ آپ نے اپنے معتقدوں، مریدوں اور عزیزوں کو اسی طرز زندگی کا سبق دیا اور کہا'' نبی پاک کی حیات مبارکہ ساری دنیا کے لیے اور رہتی دنیا کے لیے مشعل راہ ہے، اس میں ہر انسان کی زندگی سے متعلق ہر مسئلے کا حل ہمیں مل جاتا ہے، پھر بھلا ہم آپ کی حیات مبارکہ کو اختیار کیوں نہ کریں''۔

اس کے علاوہ پیر راشد روضے دھنی کو بزرگوں کے اور اہلِ اللہ کے لیے بے شمار روح پرور واقعات یاد تھے۔ جسے سن کر لوگوں پر رقعت طاری ہو جاتی تھی، وہ زار و قطار رونے لگتے تھے۔ جب آپ سامعین کو اس منزل پر لے آتے جہاں احساس زندہ ہو جاتا ہے، نفس اصلاح کو تیار ہو جاتا ہے۔ اور طبیعت میں آمادگی پیدا ہو جاتی ہے تو آپ قرآن پاک کی آیاتِ مبارکہ میں سے اور نبی پاکؐ کی حیات مبارکہ کی حیاتِ طیبہ میں سے اصلاحی واقعات و قصص کا بیان کرتے، اس بیان سے کہا جاتا ہے کہ سیکڑوں لوگوں کو راہِ حق مل گئی، بزرگوں کے دل بھر گئے بے شمار لوگوں کے دن پھر گئے، مسجدیں آباد اور سب سے بارونق ہو گئے، اجتماعات میں اضافہ اور واقعات سے مستفیض ہونے والوں کا شمار ممکن نہ رہا۔

یہ سچ ہے کہ اہلِ اللہ کی زبان میں تاثیر، آنکھوں میں جادو اور باتوں میں سحر ہوتا ہے، یہی تاثیر، اور تاثیر لوگوں کو صحیح سمت گامزن کرنے تلقین کرتا ہے۔ اب ذیل سے چند واقعات درج ہیں جو پیر سائیں نے اپنی محفلوں میں بیان کیے، اور لوگوں نے اس بیان سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی زندگی کو منور خیال کو پاکیزہ اور عمل میں مستحکم کرلیا۔

آپ نے ارشاد فرمایا کہ'' حضرت سلطان العارفین بایزید بسطانی سے کسی شخص نے عرض کیا '' حضور! مجھے توحید کی حقیقت سمجھا دیں حضرت شیخ نے فرمایا'' جا اور کچھ گڑ لے کر'' وہ شخص گڑ لے آیا حضرت شیخ نے اسے فرمایا'' اس گڑ میں سے کچھ حرام جانوروں (مثلاً کوا، کتا، بندر وغیرہ) کی شکلیں بنا دے اور کچھ حلال (مثلاً مرغ، کبوتر، بکری، بھیڑ وغیرہ) کی شکلیں بنا دے''!

اس شخص نے حسب الحکم شکلیں بنا دیں تو حضرت نے فرمایا:'' حلال جانوروں کی شکلیں

دوسری طرف رکھ دے اور اپنا منہ ان کی طرف سے ہٹا لے" اس شخص نے حلال جانوروں کی شکلیں ایک طرف حرام جانوروں کی شکلیں دوسری طرف رکھ دیں اور منہ پھیر کر کھڑا ہو گیا حضرت شیخ نے حلال وحرام جانوروں کی شکلیں یکجا کر کے توڑ پھوڑ دیں اور ملا کر ایک غلولہ بنا دیا پھر اس شخص سے فرمایا: اب اس غلولہ میں سے حلال وحرام جانوروں کی شکلیں جدا جدا کر دے" وہ شخص حیران ہو کر خاموش رہا، سلطان العارفین نے فرمایا یہ ہے "توحید"

طالبِ صادق کا پیر عشق ہے:

خلیفہ محمود نظامانی علیہ الرحمہ کا بیان ہے:

ایک دن شام کے وقت درگاہ مبارک پر میں نے حضرت پیر سائیں قدس سرہٗ کو اپنے حالات سنائے تو آپ نے ٹھنڈی سانس لے کر فرمایا:

"طالبِ صادق کا پیر سفید داڑھی والا نہیں ہے بلکہ اس کا پیر عشق ہے۔"

توبہ کی فضیلت:-

حضرت پیر سائیں خدمت اللہ نے فرمایا: "جس شخص نے کوئی گناہ کیا اور پھر اس گناہ پر وہ نہ پشیمان ہوا اور نہ توبہ کی اور نہ ہی اس کے دل میں گناہ کے ارتکاب سے کوئی رنج وغم پیدا ہوا تو وہ گناہ اس کے ذمے رہ جاتا ہے۔ اور جس شخص نے گناہ سے توبہ کی اور بہت زیادہ دکھ اور پشیمان کا احساس کیا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہ کو معاف فرما دیتا ہے۔ جیسے کہ حدیث شریف میں ہے یعنی گناہ سے توبہ کرنے والا شخص ایسا ہے کہ گویا اس نے گناہ کیا ہی نہ تھا۔"

توبہ کرنے والے اللہ تعالیٰ نہایت راضی ہوتا ہے حضرت پیر سائیں علیہ الرحمۃ نے فرمایا اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والے اور پشیمان ہونے والے کو بندے پر نہایت خوش ہوتا ہے، جیسے کہ کوئی شخص اونٹ پر سامانِ خوادونوش لاکر کسی بیابان میں سفر کر رہا ہو اور وہاں اس کا اونٹ گم ہو جائے اور یہ شخص

اونٹ اور سامان اس کو دوبارہ مل جائے تو جس طرح اس وقت اس کو فرحت وخوشی حاصل ہوتی ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے نائب بندے سے روضی اور اس پر خوش ہوتا ہے۔''

انتظارِ محبوب

حضرت پیر سائیں نے فرمایا:

''طالب کو چاہیے کہ وہ اپنا دل ہمیشہ محبوب حقیقی کے انتظار میں اس طرح رکھے جیسے کہ عاشق اپنے بچھڑے ہوئے محبوب کے دیدار کے لیے ہمیشہ پریشان وبے قرار رہتا ہے۔''

متعلق را چہ صبر و چہ قرار است

مبتلائے عشق کو صبر وقرار کیسا؟

یہاں آپ نے یہ سندھی بیت بھی پڑھا

صائم سکي جيئن اذان جي آواز کي

سون تن آهي تيئن سکايو سڄڻين

یعنی جس طرح روزہ دار مغرب کی اذان کا منتظر ہوتا ہے اسی طرح میں بھی دوستوں کا منتظر ہوں۔

صاجبزادگان کو وصیت

پیر سائیں نے اپنے صاجبزادگان کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

(۱) کسی شخص کی کسی بھی چیز میں خصوصاً مال میں لالچ نہ رکھنا۔

(۲) کسی کے پاس رشتہ طلب کرنے نہ جانا۔

(۳) دنیاداروں کی دوستی یا ان کی طرف میلان نہ رکھنا۔

(۴) اہلبیت کی عزت کرنے والے کو سب سے فوقیت دینا۔

(۵) چور کی طرف داری ہرگز نہ کرنا کیوں کہ بھیڑیے پر رحم کرنا بھیڑوں پر ظلم کرنے کے مترادف ہے۔

صاحبزادگان اور خلفاءٔ کو وصیت

خلیفہ میاں لقمان علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ حضرت پیر سائیں نے مرضِ وفات میں صاحبزادگان اور خلفاءٔ کو وصیت کرتے ہوئے فرمایا:

تمام حاضرین اور غائبان خبردار رہیں کہ ہمارا طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے، جو جہالت اور بدعت سے پاک ہے، اس سلسلے میں اگر کوئی بدعتی بن جائے تو اس کو جماعت سے خارج رکھنا، اور اس کے ساتھ کوئی تعلق نہ رکھنا اس ہدایت پر عمل کرنا اور استقامت رکھنا۔

ظلم کا وبال اور احسان کا فائدہ

حضرت پیر سائیں نے مخلوق پر احسان کرنے کے فوائد بیان فرماتے ہوئے مثال دی کہ ''لقمان تالپر'' اگرچہ دین دار اور پرہیز گار اور بزرگان لواری کا مرید ہے، لیکن غریبوں پر ظلم ڈھانے کی وجہ سے اس کی جاگیر ویران وغیر آباد ہوگئی ہے، اور ''مستی خان مری'' اگرچہ کسی طریقے میں داخل نہیں اور اس قدر دین دار بھی نہیں ہے مگر صاحبِ احسان اور مروت ہے اور غرباء رعیت سے ہمدردی کرنے والا ہے اس لیے اس کی تمام جاگیر آباد ہے۔

خدمتِ خلق کا جذبہء بے مثال

خلیفہ میاں لقمان علیہ الرحمہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ ''لاڑ'' کے سفر میں تھے، کہ جماعتِ فقراء میں بخار آنے لگا اور حضرت کو بھی بخار لاحق ہوا، سر اور بدن میں درد کے ساتھ اسہال کی بھی شکایت ہوگئی اس وقت آپ موضع ''پنوترہ'' میں تھے وہاں سے چلنے لگے تو آپ نے سینہ مبارک پر ایک کپڑا ڈال لیا دوسرا کپڑا بدن پر لپیٹا اور تیسرا کپڑا سر پر مضبوطی سے باندھ کر سوار ہوئے، راستے میں بھی آپ

کو متعدد بار اسہال آئے، میاں احمد خان نظامانی نے جو کہ حضرت والا کے راسخ الاعتقاد مرید میں سے تھا، ایک اگالدان لیے آپ کے ہمراہ چل رہا تھا، جب حضرت والا کو تھوکنے کی حاجت ہوتی تو وہ حضرت والا کے آگے اگالدان کر دیتا تھا۔ الغرض اس قدر تکلیف لاحق ہونے کے باوجود آپ فقیروں کی دعوتوں پر تشریف فرما ہو رہے

تھے۔ آپ نے جب فتح علی ساکن کھشیان پر ان کی دعوت پر تشریف فرما ہوئے اس وقت مرض شدت اختیار کر چکا تھا۔ یہاں تک کہ قضائے حاجت کے لیے جانا بھی دشوار ہو گیا یہ دیکھ کر پوری جماعت متفکر ہو گئی، تاہم اس قدر علیل ہونے کے باوجود حضرت ریگستانی فقراء کی دعوتوں پر پہنچنے کے لیے بالکل تیار ہو گئے۔ آپ کے بھائی محمد سلیم اور میاں قابل شاہ اور طریقہ کے مشائخ سب وہاں موجود تھے۔ ان سب نے آپس میں صلح کرنے کے بعد بندہ سے کہا کہ حضرت والا سے عرض کریں کہ ''حضرت آپ کی ناسازیِ طبع کے باعث پوری جماعت اور درگاہِ مبارک پر تمام اہلِ خانہ بہت متفکر اور بڑی تشویش میں ہیں۔ اگر چہ حضور اپنی اس کیفیت علالت سے مطلقاً بے نیاز ہیں مگر ہم مسکینوں اور اہلیانِ درگاہ پر رحم فرماتے ہوئے درگاہ پر چلیں کہ سات آٹھ دن سفر کر کے درگاہ مبارک پہنچ جائیں۔ جب صحت اچھی ہو جائے گی تو اس کے بعد ریگستان کا سفر اختیار فرمالیں'' انہی دنوں خلیفہ میاں اسماعیل اور ٹھوڑے کا باشندہ آیا تھا، جس نے بتایا کہ درگاہِ مبارک کا راستہ سیلاب سے محفوظ ہے درگاہِ مبارک پر پہنچنا آسان ہے۔ بندہ نے ان سب کی طرف سے یہ ساری حقیقت حضرت کی خدمت میں عرض کر دی۔ آپ نے پوری بات سن کر بڑے غصے سے فرمایا:

''تم نے خوب سمجھا ہم نے ریگستان کی مسکین فقراء سے دعوتوں پر پہنچنے کا وعدہ کر لیا ہے، اور انھوں نے قرض وغیرہ اٹھا کر دعوتوں کی تیاری کر رکھی ہے، ان کے ساز و سامان کو ضائع کر دینا جائز نہیں ہے، ہم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مخلوق کی خدمت کرنے کا حکم ملا ہوا ہے، پھر اس وقت تو ہم سوار ہونے کی بھی طاقت رکھتے ہیں اور جاتے ہیں لیکن اگر سوار ہو کر چلنے کی بھی طاقت نہ رہے تو اس حالت میں بھی ہم خود کو چار پائی پر اٹھوا کر بھی وہاں پہنچیں گے۔ اور خلقِ خدا کی خدمت سے خود کو سبکدوش

کریں گے اور تم نے جو یہ خیال کیا ہے کہ درگاہ مبارک پر صحت یاب ہو کر پھر سفر کریں۔اللہ تعالیٰ شافی مطلق ہے یہاں وہاں وہی ایک ہے۔

مکتوبات شریف

اہلِ بصیرت اور اہلِ بصارت بزرگوں کے خطوط علمی نکات، دینی رجحانات، تطہیر قلوب اور روحانی رموز واسرار کو سمجھنے کے لیے، بہت اہم ہوتے ہیں، حضرت مجدد الف ثانیؒ قدس سرہٗ (م،۱۰۳۴ھ) کے مکتوبات (تین دفتر) کو متذکرہ بیان کی سند کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے۔جس کے تراجم متعدد زبانوں میں ہو چکے ہیں، پھر اس کا انتخاب بھی شایع ہو چکا ہے۔اس کے علاوہ بزرگوں کے خطوط داخلی شواہد بھی رکھتے ہیں جن کی روشنی میں مکتوب نگار اور مکتوب الیہم کے ذاتی حالات، اُس عہد کے سیاسی حالات، اور علمی رجحانات وغیرہ دیکھے جا سکتے ہیں۔

مکاتب سید محمد روضے دھنی میں ایسی ہی خوبیاں نظر آتی ہیں جنھوں نے اُس عہد کے لوگوں میں دینی خدمات اور روحانی تعلیمات کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

پیر محمد راشد قدس سرہٗ کے خلفاء اور اس کے دور کے جید عالم مختلف مسائل کو سمجھنے کے لیے آپ کو خطوط لکھتے تھے، آپ نے ان کو جو جوابی خطوط لکھے وہ موجود اور محفوظ تو تھے لیکن منتشر تھے، آپ کے باکمال خلیفہ محمود فقیر نظامانی نے جہاں اپنے مرشد کے ملفوظات کو بڑے سلیقے سے مرتب کیا وہاں انھوں نے مکاتیب کو بھی جمع کیا اور کتابی شکل میں ترتیب دیا، جس کے پھر متعدد قلمی نسخے تیار کیے گئے۔

ڈاکٹر نذر حسین سکندری نے ان مکاتیب پر مسلسل سات سال محبت اور عقیدت سے علمی اور تحقیقی کام کیا، ان کا یہ علمی کارنامہ ''مکتوبات شریف سید محمد راشد روضے دھنی قدس سرہٗ'' مدرسہ ''صبغۃ الھدیٰ'' شاہ پور چاکر نے جولائی ۱۹۹۶ء میں جناب میر محمد وسان کی مالی امداد سے شایع کیا، سندھ یونی ورسٹی نے ڈاکٹر نذر حسن سکندری کو پی ایچ ڈی کی ڈگری دی۔

اس مجموعے میں پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ کے جملہ ۳۶ مکاتیب شامل ہیں جو تمام فارسی زبان میں ہیں۔پیر محمد راشدؒ کی مادری زبان سندھی تھی اور جن احباب اور اشخاص کو آپ نے خطوط یا جوابی خطوط لکھے ان کی اکثریت سندھی زبان پر مشتمل تھی، تاہم آپ نے سارے مکاتیب فارسی میں لکھے ہیں یہ بات جہاں ایک طرف فارسی زبان پر پیر محمد راشد کے عبور کا ثبوت ہے وہاں اس حقیقت کی بھی نشان دہی کرتی ہے کہ پیر محمد راشد کی حیات مبارک (۱۱۷۱ھ-۱۲۳۴ھ) میں سندھ کے

مشاہیر بھی برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح زیادہ فارسی میں خط وکتابت کرتے تھے۔

سندھ میں دین اسلام کی اشاعت میں صوفیائے کرام نے بہت کام کیا ہے، اسلامی تصوف کے لٹریچر میں مثنوی مولانا روم کو غیر معمولی اہمیت حاصل ہے، اسے فارسی زبان اا ایک بے مثال علمی شاہکار تسلیم کیا گیا ہے، پیر محمد راشد کی سوانح عمری کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مثنوی مولانا روم کا مطالعہ اور اس کا بیان آپ کا مرغوب مشغلہ تھا، آپ مسجد شریف ''پیر جو گوٹھ'' میں جمعہ کی نماز کے بعد مریدوں کو مثنوی کا درس دیتے تھے، اور بعض اوقات اس قدر والہانہ شوق سے کہ سامعین میں گریہ کی وجہ سے ایک شور برپا ہوجاتا تھا جو لوگ زار و قطار ہچکیاں لے کر روتے تھے۔

اپنے قول سے دینی خدمت کرنا قدرے آسان ہے لیکن زبان سے کی ہوئی اصلاح یا خدمت اپنے کردار سے ظاہر کرنا بہت مشکل ہے، اس بے بہا مثالوں میں سے چند ایسے واقعات قلم بند کیے جا رہے ہیں۔ جو آپ کے مکتوبات کے آغاز میں بھی درج ہیں اور ملفوظات وغیرہ میں بھی بیان ہوئے ہیں، ان واقعات کو بیان کرنے کا اصل مقصد یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ سکیں گے کہ حضرت راشد صاحب روضے دھنی نے اپنے کردار سے بھی دینی خدمت کی ہے۔

پیر محمد راشدؒ مولانا جلال الدین رومی کے علاوہ ساہ عبداللطیف بھٹائی سے بھی بہت متاثر تھے، چناں چہ ان دونوں صوفی شعراء کے خیالات و اشعار آپ اپنی تقریر اور تحریر میں کثرت سے استعمال کرتے تھے، شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ کے معروف محقق اور شارح ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے ''پنج گنج'' کتاب کے پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

> ''جن علماً و فضلاء نے شاہ عبداللطیف بھٹائی علیہ الرحمہ کے مجموعہ کلام المعروف بہ ''شاہ جو رسالو'' میں دقیق اصطلاحات اور الفاظ کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے بلکہ شاہ صاحب کے ابیات کا مفہوم واضح کرنے میں پیش رفت کی ہے ان میں پیر محمد راشدؒ روضے دھنی کا اسم گرامی سرفہرست ہے۔''

مکتوبات پیر محمد راشدؒ کے موضوع مختلف ہیں، مکتوب نمبر ایک جو آپ کے خلیفہ محمد حسین مہیسر کو لکھا ہے اس کا بنیادی موضوع اس دور کے سیاسی حالات ہیں، لیکن زیادہ تر مکاتیب میں ریاضت، عبادت، شرعی، مسائل، آیات الٰہی کا ترجمہ و تفسیر، احادیث کا بیان، معراج کی حقیقت - صبر کی تلقین - جمعہ نماز کی اہمیت موضوع تحریر ہیں۔

مکاتیب کے مطالعے سے جو بات نمایاں طور پر نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ پیر محمد راشد روضے دھنی نے اپنے قاری کو بین السطور یہ پیغام دیا ہے کہ قرب خداوندی کے حصول کے لیے ''سنت پیغمبر ﷺ'' اور ''شریعتِ محمدیؐ'' کی پیروی اور

اتباع لازم وملزم ہے، اس کے بغیر قرب خداوندی کا حصول ناممکن ہے۔

ہر اہلِ اللہ سنتِ پیغمبر کی پیروی لازم وملزم قرار دیتا ہے، لیکن پیر محمد راشدؒ اس معاملے میں نہایت مستعد ہیں، ملفوظات میں ایک واقعہ درج ہے کہ آپ کے ایک مرید کے ہاں تشریف لے گئے اس نے رہائش گاہ کے ساتھ وضو کرنے کے لیے چھوٹی سی جھونپڑی بنائی تھی۔ لیکن جب نماز کا وقت ہوا تو پیر محمد راشد نے کھلے میدان میں بیٹھ کر وضو کرنا شروع کیا، مرید نے ادب سے عرض کیا کہ حضور سخت ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے اس لیے میں نے وضو کے لیے چھوٹی سے جھونپڑی بنائی ہے، اگر آپ وہاں وضو فرمائیں گے تو سردی سے محفوظ رہیں گے، آپ نے جواب دیا کہ جھونپڑی بہت چھوٹی ہے اس کے اندر بیٹھ کر وضو کرنے سے میرا رخ جنوب کی طرف ہوگا، سنت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا تقاضا یہ ہے کہ قبلہ رخ وضو کیا جائے، لہٰذا میں سنت کو نہیں چھوڑوں گا سردی برداشت کروں گا۔

ایک دفعہ آپ جیسلمیر کے سفر پر تھے کہ طویل مسافت کی وجہ سے فقراء تھک گئے، جب منزل مقصود پر پہنچے تو سب کا یہ مشورہ ٹھہرا کہ اگر کوئی گانے والا ہو تو تھکاوٹ دور کرنے کے لیے اس سے گانا سنا جائے، مقامی لوگوں نے کہا یہاں ایک میراثی ہے جس کے گانے بجانے کی بڑی شہرت ہے میراثی حاضر ہوا اور ساتھ سارنگی بھی لیتا آیا، آپ نے جب یہ دیکھا تو فرمایا کہ آپ کا گانا ضرور سنیں گے فقراء کی خواہش ہے، لیکن شرعی طور پر ساز کے ساتھ گانا سننا معیوب ہے، میراثی نے عرض کیا ''حضور میں بغیر ساز کے گا نہیں سکتا'' آپ نے فرمایا ''پھر ہمیں ایسے گانے سننے کا کوئی شوق نہیں ہے''۔

ایک بار آپ کسی امیر کبیر میر صاحب کے پاس مہمان ہوئے جو آپ کا بڑا عقیدت مند تھا، صبح کو جب آپ کا خلیفہ حاضرِ خدمت ہوا تو پیر محمد راشد نے اس کو قریب بلایا اور فرمایا کہ گذشتہ شب مجھ سے عبادت میں سستی واقع ہوئی ہے، غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ رہائش گاہ امیر لوگوں کی ہے، دولت اچھی چیز نہیں ہے۔

پیر محمد راشد کے خلفاء میں محمود فقیر نظامانی کا برا مقام ہے ان کو اپنے آبائی ورثے میں سونا، چاندی، اور نقد رقم ملی جو اس زمانے میں بھی ہزاروں روپے تھی، خلیفہ نے ساری دولت ایک چادر میں باندھ کر ''پیر جو گوٹھ'' میں ایک مرشد کے آگے ادب سے نذرانے کے طور پر لا کر کھ دی۔

پیر محمد راشد برہم ہوئے اور خلیفہ سے کہا ''آپ کمال کرتے ہیں کہ اپنے گھر میں سے کوڑا کرکٹ جمع کر کے میرے گھر کے آنگن میں لا کر پھینکتے ہیں، اسی وقت یہاں سے اٹھاؤ مجھے سخت تکلیف ہو رہی ہے۔''

محمود فقیر نظامانی نے وہ ساری رقم اسی وقت وہاں سے اٹھائی اور گاؤں میں جاکر غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کی، خالی چادر کندھے پر رکھ کر مرشد کے حضور حاضر ہوئے اور اپنی غلطی کی معافی مانگی۔

پیر محمد راشد کے سندھ، بلوچستان، راجستھان اور دیگر علاقوں میں لاکھوں مرید اور ہزاروں خلیفہ تھے، لیکن مذکورہ واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ محمود فقیرؒ کا مقام و مرتبہ اپنے مرشد کے نزدیک کچھ اور ہی تھا جس کی تصدیق اس طرح بھی ہوتی ہے کہ ایک دفعہ پیر محمد راشد نے ان سے فرمایا کہ:

''میرے جتنے بھی خلیفہ ہیں ان سب میں آپ میرے دل سے زیادہ قریب ہیں۔''

اس کے بعد آپ نے اپنے کندھوں سے چادر اتار کر محمود فقیر کے کندھوں پر ڈالی اور اپنے سر سے دستار اتار کر خلیفہ کے سر پر رکھی، وہ دستار اب تک خلیفہ کے خاندان میں موجود ہے۔

پیر محمد راشدؒ کے ایک اور مشہور خلیفہ نبی بخش لغاری تھے، جو از حد پرہیز گار اور نیکوکار تھے، لیکن مجازی عشق کے شکار ہوگئے، قسمت نے آپ کی آرزو پوری کی اور جس خاتون کو آپ چاہتے تھے اس سے شادی ہوئی، میاں بیوی ایک دوسرے پر قربان تھے۔

ایک دن خلیفہ نبی بخش جمعہ کی نماز کے لیے ''پیر جو گوٹھ'' تشریف لے گئے، بی بی نے میاں سے عرض کیا کہ نماز سے فارغ ہو کر سیدھے گھر آ جایئے گا، مجھے اکیلے میں قرار نہیں آتا، جب نماز جمعہ ختم ہوئی تو خلیفہ واپسی کا ارادہ کر کے اٹھا پیر صاحب نے فرمایا کہ تشریف رکھیں، ہم اپنے مریدوں کو نصیحت کرنا چاہتے ہیں، خلیفہ نبی بخش یہ سن کر بیٹھ گیا، کچھ وقت گذر گیا، اور اسے اپنی بیوی کا خیال آیا تو اٹھنا چاہا، یہ دیکھ کر پیر محمد راشدؒ نے فرمایا کہ ''نبی بخش جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا اس لیے اب صبر کر کے بیٹھ جاؤ''۔

خلیفہ نبی بخش دوبارہ بیٹھ گیا، دیر سے جب اپنے گھر پہنچا تو دیکھا کہ ان کی بیوی اتنی دیر بھی جدائی برداشت نہ کر سکی، اس نے خودکشی کر لی تھی، اس دردناک واقعے نے خلیفہ نبی بخش کو غم سے نڈھال کر دیا۔

جناب غلام ربانی آگرو کے مطابق خلیفہ نبی بخش نے اس واقعے سے متاثر ہو کر، سسی پنہوں کی داستان، کو سرائکی زبان میں نظم کیا، آگرو صاحب کہتے ہیں ''یہ روایت میں نے قیام پاکستان سے پہلے ایک عالم شخص سے سنی تھی جو نہایت دیندار تھا، اس زمانے میں اس کے پاس سسی پنہوں کی مذکورہ منظوم عشقیہ داستان بھی دیکھی تھی، جو لیتھو میں

چھپی ہوئی تھی، اس کے ابتدائی اشعار یہ تھے۔

اول پڑھ تو صفت سارہ زبانی جنہیں دے نال بیا کو ناھ ثانی

کنوں اسرار رب آدم اپا یا اصل کیتا اھو وہ عشق دسیا

خلیفہ نبی بخش بہت بلد پایہ شاعر تھے، سندھ کے ممتاز عالم نبی بخش بلوچ نے آپ کا کلام بڑی محبت اور محنت سے جمع کیا ہے جو سندھیادبی بورڈ نے بڑے اہتمام سے شایع کیا ہے، بعض محقق کہتے ہیں کہ شاہ عبدالطیف بھٹائی کے بعد شاعری سچل سرمست کی طرح خلیفہ نبی بخش کے کلام میں اپنے عروج کو پہنچتی ہے۔

پیر محمد راشدؒ خود بھی شعر کہتے تھے، آپ کا سارا کلام ابیات کافیوں اور مولودوں کی صورت میں ملتا ہے، جو سب کا سب سندھی زبان میں ہے، سندھی زباں مین مولوداس کلام کو کہتے ہیں جو حضور ﷺ کی شان میں کہا گیا ہو، ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا خیال ہے کہ سندھی مولود کے موجودوں میں پیر محمد راشد کا نمانہایت نمایاں ہے، آپ کی شعرو شاعری کو بین السطور پڑھا جائے تو اس کا مرکز اور محور پیغمبر ﷺ کی ذات مقدس ہے:

ھہ ھہ تي پنہور ہر آربائي آيو

وائون ڤلن چانئيون ايندم ھوت ھتان

پیر محمد راشد کی زندگی میں سندھ کے، سیاسی اور معاشی حالات:

بارہویں صدی ہجری کی آخر میں سندھ کے حکمراں کلھوڑے تھے، جو ایک مقامی قبیلہ تھا اور ہندوستان میں مغل سلطنت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اقتدار پر قابض ہو گیا تھا۔

کلھوڑا قبیلہ بنیادی طور پر جنگجو نہیں تھا، مذہبی تھا۔ بے شمار لوگ اس کے عقیدت مند تھے، اپنی مذہبی شہرت کی وجہ ہی سے وہ اقتدار پر قابض ہو گیا، لیکن جب اقتدار میں آیا تو اس کا مزاج بھی بدلا دیگر حکمران خاندانوں کی طرح وہ بھی عیاش ہو گئے، لیکن جس بات سے کلھوڑا خاندان کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا وہ اپنے سیاسی حریفوں اور عزیز و اقارب کے فساد اور خونریزی تھی۔

جب پیر محمد راشد سن ۱۱۷۱ھ مطابق ۱۷۵۷ء تولد ہوئے تو سندھ کا حاکم غلام شاہ کلہوڑا تھا، میاں غلام شاہ نہایت ذہین اور ہر وجہ لائق حکمراں تھا تاہم وہ بھی خاندانی سازشوں سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب نہ ہوا، تخت اور تاج پہ مکمل قبضہ حاصل کرنے کے لیے اس کو اپنے چھوٹے بھائی عطر خان سے روھڑی شہر کے قریب جنگ کرنی پڑی جس میں وہ کامیاب ہوا، سندھ میں فسادات پر بھی جاری رہے، طالع آزما غیر ملکی لٹیروں کے حملے جاری رہے، سندھ مسلسل سیاسی ہیجان اور ہنگامہ آرائی میں مبتلا رہا، میاں غلام شاہ کے لشکر میں اکثریت بلوچ سرداروں کی تھی جن کی وہ قدر کرتا تھا، چناں چہ غلام شاہ اندرونی اور بیرونی سازشی حملہ آور کو دبانے میں کامیاب ہوگیا، غلام شاہ سندھ کے زندہ جاوید شاعر شاہ عبداللطیف بھٹائی سے عقیدت رکھتا تھا، چناں چہ اس نے بڑی محنت اور عقیدت سے شاہ کا روضہ اور ملحقہ مسجد تعمیر کروائی، یہ تعمیرات آج بھی اس کی تاریخ یادگار ہیں ہے۔

غلام شاہ ۱۷۷۲ء میں فوت ہوا، اس کے بیٹے میاں سرفراز میں اپنے عظیم باپ کی صلاحیت نہیں تھیں، لہٰذا معزول ہوا، اور سنہ ۱۷۷۵ء میں اس کا چچا غلام نبی کلہوڑا تخت نشیں ہوا، وہ بھی آخر کار قتل ہوگیا اور اس کا بھائی عبدالنبی تخت نشین ہوا جس نے اپنے تخت وتاج کو محفوظ کرنے کے لیے پہلا کام یہ کیا کہ اپنی قریبی رشیداروں میاں سرفراز میاں محمد خان، میاں محمود اور عطر خان کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد جودھپور کے راجا سے ساز باز کر کے دو جلاد حاصل کیے اور اپنے وزیر اور جرنیل میر بجار خان کو قتل کرا دیا، میر بجار خان کا قتل کلہوڑا خاندان کو مہنگا پڑا، موجودہ ضلع نوشہرو فیروز میں ہالانی شہر کے قریب جنگ ہوئی جس میں کلہوڑا خاندان کی حکومت ختم ہوگئی، اور سندھ پر بلوچ تالپور خاندان برسر اقتدار آیا۔

جناب غلام زبانی آگروکی روایت کے مطابق ثقافتی روایات کے پیش نظر کلہوڑا خاندان کے حرم سرا کی خواتین کی حرمت اور املی اثاثے کو محفوظ رکھنے کے لیے فریقین نے پیر محمد راشدؒ کو امین مقرر کیا۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ جنگ وجدل میں دشمنوں کی باہمی نفرت کا اندازہ کرنا بھی مشکل ہوتا ہے، لیکن کسی مقام پر صلاح جوہ کا وقت آئے اور فاتح و مفتوح دونوں کی ایک شخصیت کو منتخب کریں اس پر اتفاق کریں، تو وہ اس بات کی دلیل ہے کہ، اُس عہد میں وہ شخص سخ سے زیادہ متوازن اور ممتاز ہے، لہٰذا واضح ہوجاتا ہے کہ کلہوڑا عہد کے غروب اور تالپوروں کی حاکیت کے اس نازک مرحلے پر پیر محمد راشدؒ روضے دھنی سب سے زیادہ بااعتماد اور متقی شخص

تھے۔

معاشی حالات:

کلہوڑا دورِ حکومت نے زراعت میں نمایاں ترقی کی، حکومت نے آب پاشی کے نظام کو بہتر بنانے کے لیے نہروں کا جال بچھا دیا۔ تاہم امن و امان کی صورت حال اطمینان بخش نہیں تھی، اس لیے بقول ڈاکٹر حسین سکندری ''ہزاروں زندگیاں ضایع ہوگئیں''۔ انگریزوں نے اس صورت حال کا فائدہ اٹھایا اور کلہوڑا حکمرانوں سے سندھ میں تجارت کے لیے اپنی مرضی کے مطابق اجازت نامے حاصل کر لیے، آگے چل کر تالپور دورِ حکومت میں انھوں نے سندھ پر قبضہ کرلیا۔

ڈاکٹر قمر جہان مرزا کی تحقیق کے مطابق سندھی مسلمان وڈیرے اور سندھی متعصب ہندو جن کو غداری اور مخبری میراث میں ملی تھی تالپور دورِ حکومت میں سازش کرتے رہے کہ انگریزوں کو اقتدار مل جائے تاکہ خود ان کو وفادار مقامی باشندوں کی حیثیت میں زرعی زمین اور سرکاری ملازمتوں پر قبضہ کرنے میں آسانی ہو۔

چناں چہ انگریزوں کو اقتدار ملا تو سندھ میں اکثر سرکاری ملازمتیں ہندوؤں کے حصے میں آئیں جب کہ جاگیریں اور زمینیں مسلمان وڈیروں کو ملیں، دونوں فریق انگریز کے وفادار ایجنٹ رہے، ان سے سر، خان صاحب اور خان بہادر کے خطاب لیتے رہے، ڈیوڈ چیز مین (*David Cheeseman*) نام سے ایک انگریز عالم نے حال ہی میں ایک نہایت بلند پایہ تحقیقی کتاب لکھی ہے جو انگلستان سے شایع ہوئی ہے، اس نے مندرجہ بالا صورت حال کا تفصیلی جائزہ لیا ہے، اور سندھ کو انگریزوں سے آزادی کے بعد پچاس سال کا عرصہ گذر جانے کے باوجود سندھی وڈیروں کی طاقت، جبر استبداد کے بارے میں اپنی کتاب میں جو آخری باب رقم کیا ہے اس کا عنوان ہے:

(*The Governors Govern*)

سماجی کام:

پیر صاحب پیر محمد راشدؒ کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ دنیاداری کے معاملات سے اپنے آپ کو حتی المقدور دور

رکھیں اور ہمہ وقت خدا کی عبادت میں مشغول رہیں، تاہم آپ کے ملفوظات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کئی بار پیر جو گوٹھ سے نکل کر طویل سفر کر کے میروں اور تالپور حاکموں کے پاس گئے اور ان سے محتاج اور مسکین لوگوں کا قرضہ معاف کرایا، بعض اوقات آپ نے لوگوں کے خانگی معاملات میں بھی دخل دیا، اور خون خطرہ کی صورت حال کو رفع دفع کرادیا۔ مخالفین کو عقل مندی سے اس طرح قریب لے آئے کہ وہ آپس میں شیر و شکر ہو گئے۔

آپ کا سلوک صرف ہم مذہب مسلمان بھائیوں کے ساتھ نہ تھا، ایک بار ملتان کے حکمران نواب مظفر خان عربستان سے واپس آرہا تھا، دریائے سندھ کے راستے ملتان جارہا تھا، جب پیر جو گوٹھ کے قریب پہنچا تو حکم بھیجا کہ ہندو مذہب کے تمام لوگ ان کی خدمت کے لیے دریائی بندرگاہ پر موجود رہیں، ہندو باجماعت پیر صاحب محمد راشدؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ حضور ہمیں اس مصیبت سے نجات دلائیں، پیر صاحب نے ان سے کہا کہ آپ ایک ایک ہو کر کسی مخفی اور محفوظ مقام پر چلے جائیں اور پیر پیر جو گوٹھ خالی کر دیں، انھوں نے اس پر عمل کیا، جب نواب مظفر خان نے ہندوؤں کو غیر موجود پایا تو سخت ناراض ہوا اور پیر صاحب کی خدمت میں شکایت بھیجی، پیر صاحب نے جواب بھیجا کہ ہم فقیر لوگ دنیا داری کے جھگڑوں میں نہیں پڑتے آپ ہمارے صاحبزادوں سے رابطہ کریں، نواب مظفر خان نے پیر صاحب کے صاحبزادوں سے ملاقات کی کوشش کی لیکن ان میں سے بھی کوئی پیر جو گوٹھ میں موجود نہیں تھا، مجبور ہو کر نواب مظفر خان نے بندرگاہ پر قیام کا ارادہ چھوڑ دیا اور سفر جاری رکھا، اس کے چلے جانے کے بعد پیر جو گوٹھ کے ہندو آپ کے پاس حاضر ہوئے اور شکریہ ادا کیا، پیر صاحب نے فرمایا ''غریب اور مجبور انسان کی مدد کرنا بھی ایک طرح سے عبادت ہے سو یہ کام میں نے خدا کی خوشنودی کے لیے کیا ہے، آپ پر کوئی احسان نہیں''۔

یہ مثالیں قاری کو پیر محمد راشدؒ کی شخصیت سمجھنے میں مدد دیتی ہیں، ویسے آپ کی شخصیت اتنی عظیم ہے کہ اس کا احاطہ کرنا آسان نہیں ہے، تاہم ان کے ارادتمند اور عقیدت منداس بات پر متفق ہیں کہ پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ کی تعلیمات سے فیضیاب ہونے کے بنیادی طور پر دو علمی سرچشمے ہیں: ایک آپ کے ملفوظات دوسرے آپ کے مکتوبات یہ دونوں کتابیں سندھی زبان میں ترجمہ ہو کر شایع ہو گئی ہیں: ملفوظات پر بنیادی کام مولانا محمد قاسم مشوری مرحوم کا ہے جب کہ مکمل سندھی ترجمے کی اشاعت پیر جو گوٹھ میں جمیعت سکندری کا سنہری کارنامہ ہے، اس کی جتنی تعریف کیا جائے وہ کم ہے، دوسری جانب مکتوبات شریف جیسے پہلے بیان ہو چکا ہے کو عالمانہ انداز سے مرتب کرنے اور کتابی صورت پر

بھی ایک اجمالی نظر ڈالی ہے اور بتایا ہے کہ ملفوظات میں پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ سے وابستہ ایک ہزار نو سو گیارہ روایات نیز چار عدد مکاتیب، کچھ وظائف اور اوراد شامل ہیں، ملفوظات کے راویوں کی تعداد ایک سو اٹھانوے ہے جن میں سب سے زیادہ روایتیں خلیفہ محمود فقیر سے وابستہ ہیں، ان کی تعداد ایک ہزار تیرانوے ہے، دوسرے نمبر پر روایات خلیفے لقمان سے وابستہ ہیں، ان کی تعداد ایک سو چوہتر ہے، تیسرے نمبر پر روایات ہیں جن کی تعداد اسی کے قریب ہے، ایک راوی غیر مسلم بھی ہے، جس سے ملفوظات مرتب خلیفہ محمود فقیر کی رواداری کا ثبوت ملتا ہے، اس بات میں کوئی کلام نہیں ہے کہ سندھ میں کئی باکمال بزرگ گذرے ہیں، لیکن جس محبت اور عقیدت سے خلیفہ محمود فقیر نظامانی نے اپنے مرشد کے ملفوظات جمع اور مرتب کیے ہیں، ایسی کوئی مثال نہیں ملتی۔

مکتوبات شریف کی جملہ تعداد 46 ہے، یہ تمام مکتوب گیارہ اشخاص کو لکھے گئے ہیں، تین مکتوبات نامعلوم افراد کو لکھے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، آٹھ مکاتیب خلیفے محمد حسین کے نام ہیں، دو سید مرتضیٰ علی شاہ کے نام ہیں ایک محمد صالح طالب علم کے نام ہے، ایک میر مبارک خان تالپور کے نام ہے دو میاں احمد نصر پوری کے نام ہیں، دو خلیفہ غلام احمد کے نام چار مکاتیب غلام علی کٹھیان کے نام ہیں، ایک عبدالحمید کھوکھر کے نام ہے، پندرہ مکاتیب مخدوم پیر محمد ڈے پارچا کے نام ہیں، پانچ مکاتیب قاضی عبدالرحمٰن کے نام ہیں اور تین مکاتیب خلیفہ محمد علیم کے نام ہیں جو مکتوب آپ نے خلیفہ محمد حسین مہیسر سکندری کو اس دور کی سیاست اور ملکی حالات کے سلسلے میں تحریر فرمایا ہے اس سے ڈاکٹر نذر حسین سکندری نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ حضرت پیر محمد راشد رحمۃ اللہ علیہ کو سندھ کے کلہوڑا حکمرانوں کی شکست اور تالپور کی فتح پسند نہیں تھی، ڈاکٹر نذر حسین سکندری نے کلہوڑا خاندان کی طرف آپ کی رغبت اور تالپور خاندان سے دور رہنے کے اسباب بھی اپنی کتاب میں بیان فرمائے ہیں۔

تالپور خاندان کے حکمران شکار کے شوقین تھے، سندھ سرسبز کھیتوں کے بجائے شکارگاہوں میں تبدیل ہو گیا آباد گاؤں اجڑ گئے۔

تالپور حکمرانوں نے غلامشاہ کلہوڑا کے تعمیر کردہ حیدرآباد کے قلعے کو اپنی حکومت کا مرکز تو بنایا لیکن اس میں فن تعمیر کے لحاظ سے کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں کیا۔

کلہوڑوں نے مغلوں سے اقتدار چھین لیا تھا، اور ایک طویل عرصے کے بعد آزاد سندھ کی بنیاد رکھی تھی لیکن

تالپور خاندان نے اپنے دور میں افغانستان اور ایران کے حکمرانوں کو خراج اور تحفے تحائف دینے پر تکیہ کیا، جب ان کے اقتدار کا آفتاب غروب ہونے کو آیا تو انگریزوں سے فیصلہ کن جنگ میں انھوں نے بری طرح شکست کھائی، اس کی ایک بنیادی وجہ یہ تھی کہ تالپور خاندان اندر ہی اندر سے آپس میں بٹا ہوا تھا، چناں چہ سندھی زبان میں کہاوت ہیں جس کا مفہوم یہ ہوگا کہ:

''میرن کي گھر مان لبگي''

''اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے''

بناں بریں تاریخ سندھ کا طالبِ علم اس سیاسی منظر نامے میں یہ رائے قائم کرنے میں حق بجانب ہوگا کہ حضرت پیر راشدؒ جیسے ذہین انسان اور روشن ضمیر اہل اللہ کی دور بین نگاہوں سے یہ واقعات مخفی نہیں تھے، ورنہ آپ ہر قوم اور قبیلے سے محبت رکھتے تھے، آپ تو لوگوں کے ضمیر کو بیدار کرنے اور ان میں خودشناسی اور خداشناسی کا پیام پھیلانے کے جذبے سے سرشار تھے۔

حواشی

(۱) غلام ربانی آگرو نے اپنی تصنیف ''سنڌ جا بر بحر ۽ پھاڙ ''میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔

(۲) ابوالخیر محمد زبیر، ڈاکٹر سندھ کے صوفیائے نقشبند، رکن اسلام پبلی کیشنز حیدرآباد۔ حصہ دوم مطبوعہ ۱۹۹۷ء

سید صبغت اللہ شاہؒ (م،۱۲۴۶ھ)

المعروف بہ پیر پگارا (اوّل)

سید صبغت اللہ شاہؒ، اس خاندان کے پہلے شخص ہیں جو ''پگارا'' کے لقب سے نوازے گئے، ان کے بعد یہ خاندان اسی لقب سے اپنی پہچان رکھتا ہے۔ آپ کا سالِ ولادت ایک تذکرے سے جس کا ذکر ہم پہلے کر آئے ہیں ۱۱۹۳ھ معلوم ہوتا ہے۔ آپ سید راشد شاہؒ (م،۱۲۳۳ھ) کے چہیتے بیٹے تھے۔ اور والد گرامی نے ان کی دینی و روحانی تعلیم و تربیت کے بعد انھیں اپنا خلیفہ مقرر کیا تھا۔ اور (۱۸۱۸ء) میں آپ کی سجادگی ہوئی۔ سجادہ نشین سے متعلق انتہائی اہم معلومات ہمیں ''مخزنِ فیضان'' مطبوعہ ۱۹۸۷ء، (صفحہ:۴۰۷) سے حاصل ہوتی ہیں۔

''آپ جب سجادہ نشین بنے تو آپ کے بھائی سید محمد یسٰین شاہؒ نے اختلاف کیا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ سجادہ نشینی کا مستحق میں ہوں۔ یہاں تک کہ اُس وقت کے حکمران میر صاحبان کے پاس حیدر آباد جا کر اُس نے درخواست کی کہ مجھے میرا حق دلایا جائے، اور مجھے سجادہ نشین بنایا جائے۔ حاکم نے اپنے وزیرِ اعظم نواب ولی محمد خاں آف تاجپور کو حکم دیا کہ درگاہ مبارک جا کر تحقیقات کرے اور ازروئے انصاف سجادہ نشینی کا فیصلہ طے کر دے، وزیرِ اعظم موصوف نے درگاہ مبارک پہنچ کر بڑی تحقیق اور تفتیش کے بعد فیصلہ صادر کیا کہ پیر سید صبغت اللہ شاہؒ اوّل ہی سجادہ نشینی کے مستحق ہیں۔ یہ فیصلہ لکھ کر اپنے دستخط اور مہر ثبت کر کے تحریر سید صبغت اللہ شاہؒ اوّل کو دے دی۔

اس کے بعد سید پیر یسٰین شاہؒ صاحب نے مطالبہ کیا کہ مجھے پیر سائیں روضہ دھنی کے تبرکات میں سے کوئی تبرک دیا جائے تاکہ میں علیحدہ ہو جاؤں۔ میں اپنے بھائی کے ساتھ اکٹھا نہیں رہ سکتا اس بارے میں نواب ولی محمد خاں تاجپور نے بھی سید یسٰین شاہ کی سفارش کی۔ پیر صبغت اللہ شاہؒ نے فرمایا کہ میری خواہش یہی ہے کہ میرا بھائی ہم سے الگ نہ ہو سب مل جل کر دینِ اسلام کی خدمت کرتے رہیں۔

لیکن جب سید یسٰین شاہ صاحب کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے تو آپ نے ایک عَلَم

(جھنڈا) جس پر کلمہ طیبہ بحرف جلی طلائی تاروں سے سبز ریشمی کپڑے پر کشیدہ کاری سے لکھا ہوا تھا، سید محمد یسٰین شاہ صاحب کو مرحمت فرمایا۔ یہ وہی علَم تھا جو شاہ کابل زمان شاہ بن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی نے تیار کرا کر حضرت پیر سائیں روضہ دھنیؒ کی خدمت میں بطور نذرانہ پیش کیا تھا۔ پیر سید محمد یسٰین شاہ صاحب اس جھنڈے کو لیکر (مقام ٹھلاہ نزد اسٹیشن باقرانی ضلع لاڑکانہ) چلے گئے اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہوگئے اس طرح یہ خاندانِ راشدیہ دو حصوں میں منقسم ہوگیا۔ درگاہ مبارک کے سجادہ نشین پیر پگارا کے لقب سے اور پیر سید محمد یسٰین شاہ اور ان کے جانشین 'جھنڈے والے پیر' کے لقب سے معروف و مشہور ہوئے۔ اس لحاظ سے پیر سید صبغت اللہ شاہؒ پہلے پیر پگارا ہیں۔ یعنی 'صاحبِ دستار' کہ سندھی میں دستار کو 'پگ' کہتے ہیں''۔

آپ کے حالاتِ زندگی کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صوم وصلوٰۃ کے پابند متقی پرہیز گار ہونے کے علاوہ مسلم طرزِ زندگی کو اختیار کرتے ہوئے اسلام کی بقا کے لیے ایک مجاہدانہ فکر کے حامل تھے، حمید الدین آپ سے متعلق لکھتے ہیں۔ (اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ تحریر پیر پگارا صاحب کی زندگی میں تحریر کی گئی ہوگی۔)

باشندگانِ سندھ کے نزدیک سارے ملک میں ان جیسا کوئی شیخ و مرشد نہیں تقریباً تین لاکھ بلوچ ان کے مرید ہیں مرجع خلقِ عام ہیں، جود و کرم اور اخلاص و مروّت میں بھی شہرۂ آفاق ہیں ان کا کتب خانہ بڑا عجیب و غریب کتب خانہ ہے ایسا بادشاہ ہوں اور اہلِ ثروت افراد کے پاس بھی نہ ہوگا، پندرہ ہزار معتبر کتابیں اس میں موجود ہیں۔''

جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ زمانہ علم وحکمت کا زمانہ تھا، جو آج کے عہد سے بالکل مختلف تھا کتابوں کی اس تعداد اور مقدار سے اندازہ ہوتا ہے کہ صبغت اللہ شاہؒ مرحوم کی نظر ان کتابوں پر یقیناً بڑی گہری رہی ہوگی، اس لیے اس دور میں کتابوں کا رکھنا، پڑھنے سے مشروط تھا، اگرچہ آج عمل اس کے برعکس دیکھا جاتا ہے، لیکن ہم شخصیت کا مطالعہ جب اس عہد کے تناظر میں کرتے ہیں تو یقین کر لینا چاہیے کہ ایسا تاریخی کتب خانہ ہونے کی وجہ سے پیر پگارا صاحب کا علم بڑا وسیع ہوگا۔ اس بیان کی تصدیق کے لیے ہم آگے چل کر کچھ اور شواہد کا سہارا لے سکیں گے۔ لیکن اس سے ہمیں اعجاز الحق قدوسی کا یہ بیان بھی دیکھ لینا چاہیے۔

''صبغت اللہ شاہ پگارا اوّل نے جب سندھ کو رشد و ہدایت سے زینت بخشی اس وقت سلطنتِ اسلامیہ کا چراغ جھلملا رہا تھا۔ پنجاب پر سکھ چھائے ہوئے تھے، اور سندھ کے حصول پر انگریزوں اور سکھوں کی نظریں جمی ہوئی تھیں، حالات کی ناسازگاری نے مسلمانوں کو اس درجہ بدحواس وحشت زدہ اور کم ہمت بنا دیا تھا کہ ان کے قوائے عمل شل ہو چکے تھے، سارے معاشرے پر انحطاط کا رنگ غالب تھا، مذہب کی روح مفقود ہو چکی تھی اوہام اور رسوم پرستی کو مذہب کا نام دیا جاتا تھا۔ اس متزل اور انحطاط کے زمانے میں شاہ صبغت اللہ اوّل نے کلمہ حق تبلیغ و اصلاح اور تربیت کا کام شروع کیا۔ اس مردِ حق آگاہ نے جب یہ دیکھا کہ سکھ حکومتِ سندھ کی جانب پھیلنے لگے ہیں، تو آپ نے جہاد کا عزم مصمم کر لیا۔ آپ کا کوئی وعظ جہاد کی تربیت اور فضائل سے خالی نہ ہوتا تھا، اور لاڑ کے مرید جوان مواعظ میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ آپ نے ان کو مختلف خطوط لکھ کر جہاد کی اہمیت ان پر واضح کر دی اور انھیں جہاد کے لیے دعوت نامے لکھے''۔(۱)

آپ کی کوششوں، جدوجہد اور جہاد کے لیے تنظیم سازی کے جذبے سے آپ کے مریدوں پر مشتمل ایک جماعت تیار ہو گئی جسے حُر کہا گیا، جس کا مختلف تعارف ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، اس وقت سندھ پر میروں کی حکومت تھی کلہوڑوں کے زمانے ہی سے انگریزوں نے سندھ پر اپنا اثر رسوخ جمانا شروع کر دیا تھا اور اب آہستہ آہستہ مزید مستحکم ہوتے جا رہے تھے، اور ۱۸۴۳ء تک انگریزوں نے میروں کی حکومت بالکل ختم کر کے اپنا قبضہ جما لیا۔ نگریزوں کی آمد کے لیے تفصیل بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ تاریخ گواہ ہے انگریز سندھ میں کلہوڑوں کے عہد کا تاجروں کی حیثیت سے داخل ہوئے تھے۔ اور ان سے ایک معاہدہ بھی کیا تھا، جس کے تحت کسی قسم کی جارحانہ اقدامات سے یہ پرہیز کریں گے۔ جب میروں کا عہد شروع ہوا تو ۱۸۰۹ء میں انگریزوں نے ان سے بھی ایک معاہدہ کیا تھا جس تحت امن بحال رکھنے، سفارتی تعلقات مستحکم کرنے، جارحانہ اقدام سے پرہیز کرنے، اور برطانوی حکومت کی طرف سے میروں کی حمایت جاری رہنے کے نکات شامل تھے۔ اعجاز الحق کے بیان کی روشنی میں ہم دیکھ چکے ہیں کہ پنجاب پر سکھوں کا قبضہ تھا۔ رنجیت سنگھ وہاں ایک بڑی قوت کے طور پر سامنے آ چکا تھا مسلمان پنجاب میں بھی سمٹ گئے تھے، اگرچہ اس وقت پورے برِ صغیر ہی میں مسلمانوں کے لیے عرصہ حیات تنگ کیا جا رہا تھا لیکن ہمارا موضوع بحث اور مرکز نگاہ اس وقت سندھ ہے، اور یہاں بھی وہ خطہ جہاں کے پیر پگارا

مرحوم حروں کو جمع کرنے اور اسلام میں جہاد کی اہمیت کو اجاگر کرنے میں مصروف نظر آتے ہیں۔

۱۸۲۰ء تک انگریزوں نے یہ حکمت عملی اختیار کی کہ تالپور میروں سے تعلقات برادرانہ اور دوستانہ ہوں، یہاں تبسم چودھری کا کہنا ہے:

''۱۸۲۸ء میں جب ڈاکٹر الیگزینڈر خیر پور کے پرنس علی مراد کے علاج کے لیے بمبئی سے آیا تو اس نے نیا گل کھلایا، وہ بہت قابل ڈاکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اہلِ علم اور جاسوس بھی تھا۔ اس نے نہ صرف پرنس علی مراد کا علاج ہی کیا بلکہ سندھ کی طبعی اور سیاسی حالت کے نقشے اور رپورٹیں تیار کر کے خفیہ طور پر انگریزوں کو بھجوائیں تاکہ انھیں حملہ کرنے میں معاون ثابت ہوسکیں اس نے نہایت عیاری اور ہوشیاری سے تالپور میروں کے نظام حکومت کا جائزہ لیا اور تمام معلومات انگریز حکومت کو فراہم کیں۔'' (۲)

۱۸۳۲ء اور ۱۸۳۴ء میں انگریزوں سے میروں کے معاہدے ہوئے آخری معاہدے میں انگریزوں نے برائے نام محصول لینے پر زور دیا۔ اور اپنی سازشوں کے جال پھیلاتے ہوئے پنجاب کو استعمال کیا، جہاں رنجیت سنگھ اپنی حکومت کو وسعت دینے کے خیال میں تیار بیٹھا تھا، انگریزوں نے سندھ کی طرف پیش قدمی کا حکم رنجیت سنگھ کو دیا، اور میروں کو اس طرف سے حملے کا خطرہ صاف صاف نظر آنے لگا۔

ہر طرف مایوسی چھا گئی، پیر صبغت اللہ شاہ اوّل بہت مضطرب تھے ان کے مریدوں نے بھی جہاد میں حصہ لیا مگر افرادی قوت ابھی منتشر تھی، اور انگریزوں کے مقابلے میں کم بھی تھی۔ اس موقع پر سید احمد شہید کی تحریک کا ذکر ضروری ہے کہ وہ آگے چل کر پیر صبغت اللہ شاہ مرحوم سے آملے تھے، سید احمد شہید (م، ۱۸۳۱ء) نے ۱۲۳۹ھ / ۱۸۲۴ء میں مسلمانوں کو سکھوں اور انگریزوں کے خلاف منظم کرنا شروع کیا۔

''تاریخِ سندھ'' (صفحہ ۱۵۲) سے اس تحریک کے بارے میں خاص معلومات فراہم ہوتی ہیں جس میں پگارا اوّل کا کردار بھی نمایاں ہے:

''حضرت سید احمد شہید مورخہ ۱۷، جنوری ۱۸۲۶ء (۱۲۴۲ھ) بعزم جہاد و ہجرت مجاہدین کے ایک چھوٹے سے کارواں کے ساتھ رائے بریلی سے اجمیر روانہ ہوئے۔ مجاہدین کی جماعت بندی

رائے بریلی ہی میں کر لی گئی تھی۔ گوالیار پہنچنے کے بعد سید صاحب نے مجاہدین کو پانچ جماعتوں میں تقسیم کیا اور اُن کے سپہ سالار مقرر فرمائے، گوالیار سے ٹونک تشریف لائے۔ ٹونک سے اجمیر تشریف لائے۔ اجمیر سے پالی تشریف لائے۔ پھر کٹھیار سے جودھ پور آئے، اس کے بعد سندھ میں داخل ہوئے۔

جب آپ سندھ میں تشریف لائے تو اُس وقت سندھ میں تالپوروں کی حکومت تھی، جیسے ہی میران حیدرآباد کو آپ کی تشریف آوری کا حال معلوم ہوا، انھوں نے سید صبغت اللہ ولایتی کو آپ کے استقبال کے لیے بھیجا۔ سید صبغت اللہ مکہ معظمہ ہی میں آپ کے ہاتھ پر بیعت کر چکے تھے اور وہ اس وقت میر کرم علی خاں کے مصاحب تھے۔

شہر حیدرآباد سے تیر کے فاصلے پر مجاہدین کا لشکر ٹھہرایا گیا۔ تیسرے دن جمعہ تھا میران حیدرآباد نے کہلا بھیجا کہ جمعہ کی نماز آپ قلعے میں ہمارے ساتھ ادا فرمائیں... آپ ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ (۱۸۲۷ء) کو حیدرآباد سے پیر گوٹھ روانہ ہوئے مجاہدین کا یہ کارواں جب رانی پور پہنچا تو سید صالح شاہ بغدادی نے سارے لشکر کو کھانا کھلایا یہیں آپ کی ملاقات حضرت سید صبغت اللہ شاہؒ اوّل سے ہوئی۔ (۳)

یہاں اس تفصیل کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ صبغت اللہ شاہ اوّل نے تحریک آزادی اور جہاد میں بڑھ چڑھ کو حصہ لیا تھا، اور دینی خدمات میں جہاد کا مقام بہت افضل ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر دین کی خدمت اور کیا ہوگی۔

سورۃ الحج: آیت ۷۸ میں اللہ پاک ارشاد فرماتا ہے:

"وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ؕ

هُوَ اجْتَبٰكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ"

(ترجمہ) اور اللہ کی راہ میں جہاد کرو جیسا حق ہے جہاد کرنے کا۔
اُس نے تمہیں پسند کیا اور تم پر دین میں کچھ تنگی نہ رکھی۔

پھر سورۃ البقر: آیت ۱۵۴ میں بھی اللہ ارشاد فرماتا ہے:

''سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ط بَلْ اَحْيَآءٌ وَّ لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ''

(ترجمہ) اور جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں انھیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں، ہاں تمھیں خبر نہیں۔ (۴)

چناں چہ ہم یہاں ''پیکرِ حریت'' سے ایک طویل اقتباس پیش کر رہے ہیں، اس میں سید احمد شہید کا ایک خط بنام صبغت اللہ شاہؒ اوّل بھی ہے، اس کے مطالعہ سے ہمیں ان دونوں عظیم مجاہدین نے روابط، تعلقات اور مراسم کو بھی دیکھ سکیں گے اور جہاد میں ایک دوسرے کی امداد کرنے کے جذبے کو بھی دیکھ سکیں گے۔

''چناں چہ ۱۷، ذیقعدہ ۱۲۴۲ھ کو حضرت سید احمد شہیدؒ پیر جو گوٹھ پہنچے وہاں سید صبغت اللہ شاہؒ اور ان کے مریدوں نے سید احمد شہید کی خاطر و مدارات میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی، انھوں نے سید احمد شہید اور ان کے غازیوں کو خود اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ تیسرے دن حضرت سید احمد شہیدؒ نے نہایت اصرار کر کے اس تکلف سے روکا اور مجاہدین میں رسد تقسیم ہونے لگی۔ حضرت سید احمد شہیدؒ پیر جو گوٹھ میں تقریباً تیرہ دن قیام فرمارہے اور وہاں سے شکار پور کی راہ لی تاکہ بلوچستان اور افغانستان کی حدود کو پار کیا جا سکے۔ پیر صبغت اللہ شاہ نے حضرت احمد شہید کی پوری پوری معاونت کی۔ درزیوں کے ایک طائفہ کو بلا کر حکم دیا کہ مجاہدین کے لیے جنگی لباس تیار کریں، اور اپنے مریدوں جانثاروں کی ایک جماعت جو پانچ سو افراد پر مشتمل تھی کو حضرت شہید کے ہم رکاب کر دیا۔ یہ پہلی جماعت تھی جو حروں یعنی احرار کے نام سے موسوم ہوئی۔

سید صبغت اللہ نے اس جماعت کو ہر طرح کے سامان حرب وضرب سے پورے طور پر لیس کر دیا اور حضرت سید احمد شہیدؒ کے ہمراہ کیا۔ حضرت سید احمد شہیدؒ جہاد پر روانگی کے وقت اپنے اعیال و اطفال کو بھی پیر صبغت اللہ شاہ کی پناہ میں چھوڑ گئے۔

بدقسمتی سے سید احمد شہیدؒ ۱۲۴۶ھ کو سکھوں سے لڑتے ہوئے بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہو گئے، وہیں مدفون ہیں۔ مگر اس سے قبل حضرت سید صبغت اللہ شاہ، ۵، رمضان ۱۲۴۶ھ کو رحلت فرما گئے، فوجی اور افرادی امداد جو کہ ان کی طرف سے حضرت سید شہید کو ملی تھی اس کا سلسلہ منقطع ہو گیا حضرت صبغت اللہ شاہ کی وفات سے حضرت سید شہیدؒ کا ایک بازو ٹوٹ گیا، کیوں کہ حضرت شہید،

صبغت اللہ شاہ کو سندھ میں اپنا رفیق و معاون تصور کرتے تھے۔"(۵)

سید احمد شہیدؒ اور صبغت اللہ شاہؒ کے تعلقات سے اور باہم فوجی مراسم، امداد کا ذکر مولانا اعجاز الحق قدوسی اس طرح بیان کرتے ہیں۔

"دونوں کے خلوص، خصلت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حضرت سید احمد شہید نے اپنے اہل وعیال کو پیر جو گوٹھ میں پیر صبغت اللہ شاہؒ کی حفاظت میں چھوڑا، دونوں میں مسلسل خط و کتابت ہوتی رہی حضرت سید احمد شہید کی روانگی کے وقت غالباً یہ فیصلہ ہوا کہ جب صحیح طور پر جنگی مرکز قائم ہو جائے گا تو سید صبغت اللہ بھی یہاں پہنچ جائیں گے۔ لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ یہ جانے کے لیے بالکل تیار تھے کہ اس کی اطلاع آپ نے سید شہید کو بھی دے دی تھی کہ اچانک افغانستان اور پشاور کا راستہ ایرانی سرداروں کے مفاد کی وجہ سے مخدوش ہو کر رہ گیا، اور اب مجبوراً وہاں نہ پہنچ سکے۔"(۶)

سید احمد شہید کا ایک مکتوب قابلِ ذکر ہے جو "پیکر حریت" میں بھی درج ہے، اور متعدد اور تصانیف میں بھی ملتا ہے۔ اس سے صبغت اللہ شاہؒ صاحب کا جوش جہاد رانائے عقیدت واضح ہوتا ہے اور حبِ مسلم اور سنتِ مرسل کی پاسداری کا احساس بھی ملتا ہے۔ مناسب ہو گا اگر ہم یہاں اس تاریخی مکتوب کا مطالعہ کر لیں۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

بابرکت سجادہ نشین، محفل ارشاد تلقین مرجع مستفیدین، ہادی راہ الہٰ مخدومی حضرت شاہ صبغت اللہ صاحب مدظلہ بعد سلام مسنون

واضح ہو کہ جناب کے گرامی نامے جو بلند ہمتی کی ترغیب و عزائم کی بلندیوں اور سنت کے زندہ رکھنے اور جہاد کے قائم کرنے اور کفر و دشمنی کو مٹا دینے پر مشتمل ہیں، مضمون مکتوب گرامی نے جو اجمال اور تفصیل کے ساتھ فصیح و بلیغ زبان کے ساتھ قرآنی آیات سے مزین تھے، آنے اور جانے والوں کی کیفیت سے آگاہ کیا، یقیناً اس امر عظیم کو اختتام تک پہنچانا آں جناب جیسے مقبول بارگاہ ایزدی کو ہی لائق ہے۔ یہ کام آپ جیسی ہستیاں انجام دے سکتی ہیں۔ بہادر ہی ایسے کام انجام دے سکتے ہیں۔

بیشک آپ کی تشریف آوری اس کوہستان اور خارزار میں طالبین کے لیے باعثِ خیر و برکت ہوگی اور محفل فقراء اور عام مومنین کا آپ کے گرد جمع ہونا آپ کی ہمت عالیہ سے بعید نہیں ہے۔

لیکن وقت کا تقاضا ہے کہ آپ مخلصین اور محبین بلکہ تمام مومنین کو اکھٹا کریں اور ایسے مقام جو دشمنوں کے غلبہ سے محفوظ اور کافروں اور سکھوں کی سرحدوں کے قریب ہو لیکن ظالموں کے نقصان سے مامون ہو، قیام فرمائیں اور اس فقیر کے اہل و عیال کے ساتھ ایسی جگہ رکھیں یا اس کے علاوہ کسی دوسری جگہ مقیم ہوں اور معرکہ جہاد کافروں پر بہادری سے جاری رکھیں اور ہمت کا ہاتھ دائیں اور بائیں بڑھاتے رہیں اور کافروں کی بستیوں کو مجاہدین کے سفر کا مرکز بنا کر دین متین کے ستارہ کو عروج پر پہنچائیں اور یہاں تک کہ جس جگہ ممکن ہو جہاد فی سبیل اللہ کے نعروں سے کفر اور فساد کا استحصال فرمائیں۔" (۷)

اس مکتوب کی روشنی میں واضح نکات جو ہمارے سامنے آتے ہیں وہ اس طرح ہیں۔

(۱) سید احمد شہیدؒ، پیر صبغت اللہ شاہؒ پگارا کو نہایت عزت و تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔

(۲) ان کے جوشِ جہاد کے معترف تھے اور اپنے ساتھ شمولیت کو وجہ ہمت و استحکام تصور کیا کرتے تھے۔

(۳) پیر صاحب پگارا پر بھر پور اعتماد کرتے تھے کہ اپنے اہل و عیال کو بھی آپ کے پاس زیادہ محفوظ سمجھتے تھے۔

(۴) مجاہدین کے لیے آپ کی حمایت اور رفاقت باعثِ شجاعت شمار کیا کرتے تھے۔

(۵) آپ کے مشوروں پر سید احمد شہیدؒ عمل کیا کرتے تھے۔

(۶) پیر صاحب پگارا کو بھی اپنی جانب سے مفید مشورے دیا کرتے تھے۔ جیسا کہ خط کی آخری سطور سے بالکل واضح ہو جاتا ہے۔

پیکر حریت میں شہیدؒ کے ایک اور خط سے صرف ایک سطر نقل تو کی گئی ہے، ص ۳۹ پر یہ سطر درج ہے۔

''اگر ہماری زندگی جہاد میں ہی پوری ہو جائے تو ہمارے اہل و عیال کو حرمین شریفین پہنچا دیں۔''

''آب کوثر'' کے مصنف نے بھی تسلیم کیا ہے کہ پیر صبغت اللہ شاہ نے جہاد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، مسلم امّہ کو متحد و منظم کرنے میں اور ان میں ولولہ جہاد اور جوشِ شہادت پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

اس کے علاوہ آپ نے اپنی تقریروں، خطوط اور تبلیغ کے ذریعے مسلمانوں میں وہ جذبہ بیدار کر دیا جیسے مسلم زندگی میں بڑی فضیلت حاصل ہے، سید صاحب مرحوم نے اپنے مریدوں، معتقدوں اور عقیدت مندوں میں سے ایسے سرفروش ، جیالے اور جاں باز مجاہدین تیار کر لیے، کہ ایک جماعت منظم ہوگی یہی جماعت اور یہی مجاہدین آگے چل رحر کہلائے جنھوں نے تحریکِ حرقم کی اور پھر تحریک پاکستان میں نا قابلِ فراموش کردار ادا کیا، یہ داغ بیل اور یہ خشتِ اوّل پیر صبغت اللہ شاہؒ اوّل ہی نے رکھی تھی، جس پر آج ہم پر شکوہ، پرعزم اور عظیم عمارت دیکھ رہے ہیں۔

پیر صاحب کے لیے یہ روایات مستند کتابوں میں بطور حوالہ ملتی ہیں کہ آپ بڑے عالم، فاضل، ذہین اور متقی شخصیت کے مالک تھے اور اسی طرح اہلِ علم، اہلِ قلم، اہلِ سیف اور اہلِ نظر کی بڑی قدر کرتے تھے۔ ان کی سرپرستی اور امداد میں کوئی کثر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ جیسا عرض کیا جا چکا ہے کہ آپ کی تحویل میں ایک عظیم کتب خانہ تھا، جو نادر مخطوطات اور نایاب مطبوعات کا ایک خزانہ تھا۔ اور اس خزانے سے جہاں آپ خود مستفید ہوئے وہاں دوسروں کو بھی مستفیض ہونے کا موقع دیا۔ آپ کے روز وشب کے متعلق ہمیں معلوم ہاتا ہے کہ آپ بعد از نمازِ فجر قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے۔ حدیث کا ورد کرتے اور پھر اس کا درس بھی دیتے تھے۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہو کر مولانا رومیؒ کی مثنوی کی تشریحات فرماتے۔ اس درس وبیان کی محفل اپنے وقت کے اہم علماء، فضلاء، اور لکابرین تشریف لاتے اور پگارا مرحوم کے علم اور بیان سے مستفیض ہوتے۔ ان محفلوں میں شرکت کرنے والوں کی تعداد تو بہت ہے لیکن معروف شخصیات میں سے مولانا اسمٰعیل، مولانا محمد صالح وزیر آبادی، اور مولانا عبدالقدوس سرہندی قابلِ ذکر ہیں۔

پیر صاحب پگارا (اوّل) اس خطے میں علم کی شمع اور تحریک آزادی کی مشعل روشن کرنے والے اولین تاریخ ساز افراد میں سے تھے۔ جنھوں نے یہاں غلامی کی زنجیر توڑ دینے کے لیے آوازِ حق بلند کی تھی، اور دوسری طرف دینِ حق کے فروغ میں درس دیا، مسجد تعمیر کرائی اور اسی میں مدرسے کی بنیاد رکھی۔ جو علم دینیات اور مذہبی روایات کے فروغ کا ذریعہ بنا۔ پیر صبغت اللہ شاہؒ پگارا اوّل ۵، رمضان ۱۲۴۶ھ مطابق ۸، فروری ۱۸۳۱ء کو پیر جو گوٹھ میں اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ (۸)

پیر صاحب پگارا کے آخری ایام سے متعلق ایک روایت آپ کے مرید سید انور علی سے ہمیں ''خزا نۃ المعروف'' کے آخر میں ہمیں اس طرح ملتی ہے کہ آخری وقتوں میں پیر صاحب بہت علیل تھے تب ارادت مندوں، عقیدت

مندوں، اور مریدوں کی ایک بڑی تعداد آپ کی زیارت وعیادت کے لیے باہر جمع تھی، آپ نے اپنے ایک مریدِ خاص کو اشارہ کیا کہ لوگوں کو بلالو، لہٰذا ان شیدائیوں کو اندر لایا گیا، لیکن پیر صاحب آنکھیں بند کیے ہوئے تھے، اور آنکھوں میں تکلیف کا اظہار کر رہے تھے کچھ دیر بعد مرید کو حکم دیا کہ وہ ان کی آنکھوں میں عرقِ گلاب ڈال دے، چناں چہ ایسا ہی کیا گیا، اور پیر صاحب نے آنکھیں کھول کر سب کو دیکھا، سلام کیا، مریدوں اور عقیدت مندوں نے جواب دیا پھر آپ نے سب کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

''یاد رکھو! نبی آخرالزماں کے توسط سے جو دین ہم تک پہنچا ہے۔ وہ تمام و کمال ہے اور ساری دنیا کے لیے رہتی دنیا تک باقی رہے گا اس دین کے احکامات کو اختیار کرنے ہی میں ہماری فلاح وبقا ہے''(۹)

بعد از وفات پیر صبغت اللہ شاہؒ پگارا کے معتقد یا کسی رفیق نے ایک قطعۂ تاریخِ وفات بھی کہا تھا، جو متذکرہ کتاب میں اسی روایت سے درج ہے، اگر چہ اس میں شاعر کا نام نہیں ہے لیکن قطعۂ تاریخ وفات میں مرحوم کو عالم، شریف، شہنشاہ امین، عادل، عارف، دین پرور، حق شناس، جیسے اوصاف سے یاد کیا گیا ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاعر نے مرحوم کو قریب سے دیکھا، ان کے باطنی اوصاف سے واقف رہا، انھیں حق شناس اور دین پرور پایا، اور ان کی دینی اور علمی خدمات کا اعتراف اس انداز میں کیا، مناسب ہے کہ اس قطعے کو یہاں ضرور دیکھ لیں۔ جو مثنوی کی ہیئت میں ہے۔

قطعہ تاریخِ وفات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

زاولاد شہ انبیا سرفراز　　زامجاد آل علی بی نیاز
ہمیشہ نگاہش زلطف الٰہ　　ہمہ نور پر فیض جائی پناہ
یگا نہ زمانہ نکو نیکرائی　　یمین و یسار چومہ پر ضیائی
ہزاران مریدان ازویافتہ　　ہدایت کرامت کہ می خواستہ
امامِ زمان پیشوائی ہدیٰ　　امین جہان رہنما مقتدیٰ
دل او منور ز نور وداد　　دمادم بذکر خدا خوش نہاد

یدش پر سخاوت چو بحر عطائی — یمن گاه خورشید برج سیاهی
ولایت نشان در ضیا ماه رو — وسیله جمیله جهان نیک خو
سعادت قرین و شریعت شناس — سیادت سرشت و طریقت لباس
یکا یک زراه حقیقت سرائی — یقین کاه جائی عرفان . . . فزائی
دری از محیط نقابت مزید — دمش ذوق به شوق حق آفرید
شهنشاه دین پرور و مه رخش — شب و روز در یاد ایزد دلش
همه وقت هر گاه نوری نگاه — هوا هوت لاهوت در پائگاه
یزکی مزکی زال علی — یکی در از بحر یکتا ولی
براوج سخا بود چون آفتاب — به بزم صفا بود شمع شهاب
امید جهان صاحب کبریا — چو ابراز غطا مورد اتقیا
ولیء خدا والی دهر ،او — ورا داد سبحان چون ماه ضو
فلک بارگه جائی عزو شرف — براوج جهان نور هر چار طرف
اشارات او عین لطف و عطا — ازل تا ابد فیض بی انتها
امر مهای ایزد ازو شد بجا — ادا کرد احقاق حق ره نما
مهی برج اوج سما از کرم — منور چو بیضا حمیده شیم
بعالم حیا مهر عالی جناب — بملک سخا و عطا چون سحاب
امانت پرست و دلیل هدیٰ — ازو شد هویدا، رموزِ خدا
پراز پر توِ نورحق راست چپ — پدیداست زو نه طبق راست چپ
امین، عادل و عارف مهتدیٰ — امان داد در ملک دین سرمدا
کریم و عطا بخش سیرت ملک — که خوانده صفاتش ملک بر فلک
زوی جود احسان زبانش لذید — ذریعه منیعه بیانش لذید

امیر ، قوی ، پشت ، مہر صفا　　ازاو گشت روشن ذرات سما
تولا زمانہ کہ در کائنات　　تنش قوت بگرفت ملک جنات
رضا جوی ، راضی ارو کرد گار　　راہِ راستی او نمود اختیار
کرم بین و لطف شہنشاہ ملک　　کرامت گزین زو سما تا ملک
صفا بخش سلطان با اختصاص　　صفوت مراتب خاصانِ خاص
فیوضات اوبر وضیع و شریف　　فروزندہ خورشید ماہ لطیف
ازین دار فانی ز عالم بقا　　اذا جاءَ اجلہا رسیدہ ندا
تزلزل کہ آمد بروز وفات　　تجلی کہ از گوہر مجد یافت
نمودہ نظر منیر قضا　　کہ شمس ضحیٰ بودہ مہر رضا

۱۲۴۶ھ　　۱۲۴۶ھ

"تذکرہ مشاہیرِ سندھ" سے معلوم ہوتا ہے کہ پگارا اوّل مرحوم کی وفات پر کئی قطعات تاریخی اور مرثیے لکھے گئے تھے، ان میں سے ایک اور قطعہٗ تاریخِ وفات آپ کے خلیفہ آخوند گل محمد ہالائی نے بھی تحریر کیا تھا، جو اپنی مثال آپ ہے کہ اس کے آخری دس اشعار کے ہر مصرعے سے پگارا مرحوم کی تاریخِ وفات ۱۲۴۶ھ برآمد ہوتا ہے۔ اس قطعے کو یہاں پیش کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ہم دیکھ سکیں کہ مرحوم کی عزت وتوقیر اُن کے اپنے عہد میں کس قدر تھی، نیز ان قطعات سے یہ بھی علم ہوگا کہ مرحوم کی دینی خدمات اور اخلاقِ عالیہ سے اس عہد کے لوگ کس قدر متاثر تھے۔

اس قطعے سے قبل مؤلف نے پیر صاحب مرحوم کے حالاتِ زندگی بھی پیش کیے ہیں جس میں بعض نئی باتیں بھی سامنے آتی ہیں اور پھر انہیں، عالم، فاضل، بزرگ، مجاہد، صوفی، متقی اور پرہیز گار جیسے اہم لاحقوں سے یاد کیا گیا ہے۔ پھر ایک اور اہم بات قابلِ ذکر ہے کہ اس تذکرے اور قطعہٗ تاریخ کے ساتھ پیر صاحب مرحوم کے چند ملفوظات بھی پیش کیے گئے ہیں اگر چہ یہ تمام تذکرہ سندھی میں ہے لیکن قطعہ فارسی میں ہے۔ جس میں غوثِ عالم، مرشدِ کامل، مربی ومہدی، آن شفیع، بحرِ اعظم، مظہرِ کمال، جامع ذات، حق نما، جامع رشید، ضیاء وجود، مرشد بہ صفات جیسی عمدہ تراکیب استعمال کی گئی ہیں، جس سے مرحوم کی زندگی کے اہم پہلو واضح ہوتے ہیں، لہٰذا ہم یہاں مذکورہ تذکرے کے چند صفحات سے استفادہ کرتے ہیں۔

عالم فاضل صوفي ڪامل حافظ سيد صبغت‌الله ولد پير سيد محمد راشد روضي ڌڻي عليه الرحمت. هي بزرگ حضرت روضي ڌڻي جي سيني فرزندن ۾ وڏو فرزند ۽ سندن گادي نشين ٿيو. ۽ انهيءَ ڪانپوءِ هن خاندان جي گادي نشين بزرگن تي پاڳاري جو لقب پيو.

ظاهري علمن جي ختم ڪرڻ ڪان پوءِ نقشبندي ۽ قادري طريقه ۾ سلوڪ جون سموريون منزلون پنهنجي والد بزرگ جي خدمت ۾ ختم ڪيائين. والد بزرگ جي مٿس ايڏي مهرباني هئي جو علم مريد ۽ پيا ماڻهو انهيءَ وقت ۾ ئي هن صاحب کي خليفت الله جي لقب سان سڏيندا هوا ۽ سندس بيحد ادب ڪندا هوا. سي جدا جدا پاڙن ۾ وراهجي ويا. مگر هن صاحب پنهنجي عقلمندي سان هڪ اهڙي سرفروش جماعت جو بنياد رکيو جنهن تي سندس پوٽي جناب پير حزب الله شاهه صاحب جي زماني ۾ ”حرن“ جو لقب پيو.

سفر يا حضر ۾ هن بزرگ جي عادت هئي ته مولانا روم جي مثنوي جا ڪي ٽڪرا پڙهي انجو ترجمو جماعت کي ٻڌائيندا ۽ تصوف جا نڪتا بيان ڪندا هوا. بعض وقتن تي قرآن ۽ حديث بيان فرمائي وعظ ڪندا هوا. اگرچه پنهنجي مائٽن جي رواج موجب حنفي مذهب جو پاءِبند هو مگر ان هوندي به ڪيترن مسئلن ۾ هنجو پنهنجو مجتهدانه رنگ هوندو هو. سندس زماني جي علمائن ۾ هن ڳالهه ۾ اختلاف پيدا ٿيل هو ته جمعه نماز ڪانپوءِ (آخر ظهر) اڳين جون چار رڪعتون پڙهجن، يا نه. گهڻن حنفي عالمن جو خيال هو ته پڙهڻ گهرجن. ڇو ته جمعه نماز ادا ڪرڻ لاءِ ضروري شرط آهي ته وڏو شهر هجي. ۽ ان ۾ حاڪم مسلمان، اسلامي حڪم به جاري رکندو اچي ته پوءِ جمعه فرض

جماعت نوم يا ننڊ ۾ هجي، تنهن لاءِ اهو جملو ضروري آهي. مگر جا جماعت هميشه سجاڳ آهي. تنهن لاءِ غير ضروري آهي. يعني ته فراموشي واري حالت ۾ به اها تاويل ڪئي وئي.

نماز تراويح سمورو مهينو جماعت سان پڙهڻ ضروري نه سمجهندو هو. جيئن امام مالڪ رح جو مذهب آهي. رمضان شريف جي پوئين ڏهي ۾ اعتڪاف ڪندو هو. ۽ جمعة الوداع جو هڪ خاص رنگ ۾ نظم و نثر ۾ خطبو پڙهندو هو. رمضان شريف جي مهيني ۾ سندن ڳوٺ ۾ ڪوبه مسلمان ڪليو ڪلايو نه ڪاٿي سگهندو هو. هڪ دفعه مير سهراب خان جو نوڪر، پير ڳوٺ ۾ رمضان شريف ۾ ڪاٿي رهيو هو. جنهن کي جماعت جي فقيرن روڪيو هو مگر هن پرواهه نه ڪئي. ڇو ته حاڪم جو ماڻهو هو. پير صاحب کي اطلاع ڪيو ويو. جنهن ارشاد فرمايو، اسان کي سهراب جي عزت کان اسلام جي عزت وڌيڪ ڪرڻي آهي. ضرور مير جي نوڪر کي تعذير ڏنو وڃي. آخر هن جو منهن ڪارو ڪري، گڏهه تي چاڙهي شهر ۾ شهرت ڪئي وئي.

ٽالپرن جو زمانو هو. هڪڙا حيدرآباد ته ٻيا خيرپور ۾ حڪمراني ڪري رهيا هئا. هوڏانهن پنجاب ۾ رنجيت سنگهه جو راڄ هو. انگريز سيني جي ڪمزوري مان فائدو وٺي، آهسته آهسته ملڪ ۾ پير ڪوڙيندو ويو ٿي. سکن جي ظلمن ڪري دهلي مان شاهه عبدالعزيز بن امام ولي‌الله دهلوي جهاد جي تحريڪ هلائي، جنهن جي وفات کان پوءِ سندس مجاهد مريد سيد احمد غازي بريلوي ۽ سندس ڀائٽي مولانا اسماعيل شهيد، سکن سان جهاد ڪرڻ ۽ دهلي ۾ وري مضبوط اسلامي سلطنت قائم ڪرڻ جي ارادي سان نڪتا. سفر ڪندي ۽ ڪهندي ڪهندي اچي پير ڳوٺ ۾ جناب پير سيد صبغت الله شاهه جا مهمان ٿيا. پير صاحب سندن مرحبا ڪئي ۽ مهمانيون ڪيون ۽ جماعت ۾

جهاد جو روح ڦوڪيو. ان وقت راڻي پور ۾ پير صالح شاهه پهريون سجاده نشين هو. ان وقت به سيد احمد غازي ۽ پير صاحب ڳڏ جي دعوت جهاد لاءِ آيا.

مگر هن صاحب قبول نه ڪيو. مگر ان وقت هڪ سرويچ جماعت جو بنياد پوندو رهيو جا اڳتي هلي اسلامي سلطنت جي قيام جو ڪم ڏئي. انهيءَ ساڳي زماني ۾ رنجيت سنگهه سنڌ تي ڪاهڻ جو ارادو ڪيو. ٽالپرن ۾ مقابلي جو اصلي حوصلو ڪونه هو. جنهن ڪري رضاڪارانه نموني ۾ پير صبغت الله شاهه صاحب جماعت کي سڪن ڪافرن سان جهاد لاءِ تيار ڪيو. ۽ چوطرف دعوت ناما لکي، هنن کي الله جي واٽ ۾ سر ڏيڻ لاءِ آماده ڪيو.

انهيءَ سڏ تي لاڙ ملڪ مان هڪ معزز بلوچن جي ٽولي آئي، جا مال املاڪ اولاد تان آسرو ڪٽي اچي پهتي، جنهن تي پير صاحب جماعت کي فرمايو ته اوهان جهاد لاءِ جيڪو قدم کنيو آهي. انجو ثواب اوهان کي الله تعاليٰ ڏيندو. ۽ پاڻ هنن کان ڏاڍا خوش ٿيا، مگر هنن جواب ۾ عرض ڪيو ته قبلا اسان کي ثواب جي سڌ ڪانه آهي. اسان ته آيا آهيون فقط اوهان جي قدمن ۾ قربان ٿيڻ. اگرچه انگريزن جي وچ ۾ پوڻ ڪري رنجيت جو رولو سنڌ تان ٽري ويو. مگر حرن جي جماعت جو بنياد پئجي ويو. ان وقت ”فرق وارا“ ۽ سالم جماعت ۾ وراهيل ڪونه هوا. پر سمورا مُريد هڪبئي سان رلي ملي رهندا هوا اهو فرق پوءِ جناب پير سيد حزب الله شاهه صاحب جي زماني ۾ پيدا ٿيو. هو بزرگ زماني جي معاملات کي منهن ڏيڻ سان گڏ عابد زاهد ۽ ذاڪر ۽ صاحب تلقين جو به زبردست هو. سيد احمد بريلوي جو هڪ زبردست روحانيت جو مالڪ صوفي هو. ۽ مولانا اسماعيل شهيد سندس موحد مريدن مان هو. ان بابت روايت آهي ته پير ڳوٺ ۾ رهڻ وارن

ڏينهن ۾ هڪ دفعي پير سائين روضي واري جي مقبري تي ٻئي ڄڻان گڏ هوا. اتي مولانا اسماعيل تي ايڏو توجه وڌائون جو هو بزرگ عالم چوڻ لڳو ته ”زهي صدق ارادت ايشان و زهي مرشد كامل ايشان“

دهلي جي مجاهد جماعت مان ڪي مسافر غلطي ڪان اولهه ڏانهن پير ڪري سهيل هوا. جنهن تي ڪنهن فقير وڄي، پير سائين سان ڳالهه ڪئي ته بي ادبي ڪن ٿا. پاڻ فرمايائون ”الله جي واٽ ۾ جهاد لاء سر ڏيڻ هليا آهن، تنهن ڪري هو مثلن ۾ داخل آهن ۽ مثل ماٿهو جا اولهه ڏانهن پير ٿين ته ان ۾ ڪو عيب ڪونه آهي.“ اگرچه روحانيت جو مالڪ ۽ روحانيت جي ذريعي فيض حاصل ڪرڻ جو قائل به هو مگر وفات ڪيل بزرگن تي نذر نياز ڏيڻ جو ڏاڍو مخالف هو. سندس ملفوظات شريف ۾ آهي:-

”ناقل بلال فقير که روزي حضرت خليفةالله در وعظ احاديث بيان فرمودند که آن کسان که ماده گاؤ يا بزغاله يا غيره بطريق نذرانه به نيت اهل مقابر درگورستان ذبح مي کنند، کشننده وکشانيده يعنی آن مرد و مامور هرد و کافر مطلق اند وبر خورندگان حرام ست

(خزينت المعرفت قلمي)

صاحبزادگي جي زماني ۾ سنڌي، هندي، فارسي ۾ شعر به چوندو هو. مگر پوء والد بزرگ جي منع فرمائڻ تي اهو شغل صفا ترڪ ڪري ڇڏيائون، فارسي ۾ مسڪين تخلص ڪندو هو، ۽ اهو ساڳيو تخلص سندس پوٽي پير حزب الله شاه به اختيار ڪيو.

فارسي ڪلام تمام ٿورو آهي. نموني طور هيٺ هڪ غزل ڏجي ٿو:-

يار مـن در نقاب مـی آيد ــ سر مـن در رکاب مـي آيد
خواب آلوده بخت نو بيدار ــ نرگس نيم خواب مـي آيد

هوس وصل هـل زآنـي را ـ لـن ترانـي جواب مـى آيد
تشنگي صدف چون شود بسيار ـ بهر سقيش سحاب مـى آيد
عـاشق بيگناه را كشتـن ـ دلبران را ثواب مـى آيد
رونمودن بہ همچومن مسكين ـ نازنين را حجاب مـى آيد

جناب پير صاحب وڏي ڄمار ڪي پهچي هيٺيان فرزند پوءِ تان ڇڏي وفات فرمائي ويو.

(۱) پير غلام مصطفيٰ شاهہ (۲) پير عبدالقادر شاهہ (۳) پير علي محمد شاهہ (۴) پير علي حيدر شاهہ (۵) پير شاهہ مراد شاهہ (۶) پير مان علي ذوالفقار شاهہ (۷) پير علي گوهر شاهہ (سجاده نشين).

سندس وفات تـي ڪيترن ئي شاعرن قطعات تاريخ ۽ مرثيا لکيا آهن. مگر انهن مان سندس خليفہ آخوند گل محمد هالائي جيڪي قطعات لکيا آهن. تن مان ڪجهہ هيٺ درج ڪجن ٿا.

قطعہ تاريخ فـى القميہ از خليفہ گل محمد هالائي

غوثِ عالم مرشد فياض مـا كان كرم
كامل و اكمل مربي و مهدي و اعلي همم
صبغت الله پير ما آن محي دين احمدي
محي دلها ماصي عصيان و آثام اُمـم
چون بہ امر ارجعي نقل مكان زين دار كرد
وائى واويلا زعالم خواست تا لوح و قلم
در بيان سال و صال از اسم پاک آن شفيع
صبغت الله زيب دلها گفتہ ام بيش و كم
۱۲۴۶ھ

ايضاله كہ از هر مصرعہ سال تاريخ حاصل مى شود

نائب دین خلیفةالله خاص ـ خاص در بزم خاص، خاص‌الخاص
حق نما با حقیقت حق بود ـ بحق از خلق غیر حق بزدود
کرد صورت مثال ظهور ـ بی مثل از تہ ظلال نور
چون شد ازظل باز سوئی اصل ـ رفت از اصل سوي اصل الاصل
من هاتف شدیم در سر سال ـ در جواب و سوال، قیل و قال
او بما گفت مابوي گفتیم ـ حد تاریخ را در سفتیم
گفتمش بود شمع انجم خلق ـ گفت جامع رشید در دل فرق
۱۲۴۶ ۱۲۴۶
گفتمش "بود بحر اعظم جود" ـ گفت وه "خوش دل و کریم وجود"
۱۲۴۶ھ ۱۲۴۶ھ
گفتم این "فرد با فتوت بود" ـ گفت هئے "آن علی سخاوت بود"
۱۲۴۶ ۱۲۴۶ھ
گفتم "او بدر پر ضیاء وجود" ـ قال "قد شاع شمس یوم شهود"
۱۲۴۶ھ ۱۲۴۶ھ
گفتمش "مهدي چہ خوب مثال" ـ قال لـي "کان ذاتہ لازال"
۱۲۴۶ھ ۱۲۴۶ھ
گفتمش "مظهر کمال هدا" ـ گفت "وه روشن جمال خدا"
۱۲۴۶ھ ۱۲۴۶ھ
گفتمش "زیب در طریقت شد" ـ گفت حق "بود در حقیقت شد"
۱۲۴۶ھ ۱۲۴۶ھ
گفتم "آن مرشد بمع صفات" ـ گفت "هے هے وجود جامع ذات"
۱۲۴۶ ۱۲۴۶ھ
گفتم "از رفعت صفاتي او" ـ گفت "حق وجود ذاتي او"
۱۲۴۶ ۱۲۴۶
گفتم "آن شرح از صفات حق" ـ گفت "وی واحد بذات حق"
۱۲۴۶ ۱۲۴۶

پیر صاحب کے یہاں ہمیں عمدہ، سلیس، معیاری اور دل فریب شاعری بھی ملتی ہے۔ اگر چہ آپ کا کلام بہت زیادہ نہیں ہے، لیکن جو کچھ ہے وہ "خزینۃ المعروف" کے آخر میں یک جا کر دیا گیا ہے۔ اس میں ہمیں تصوف کا رنگ بھی نظر آتا ہے کہ آپ نے شاعری کے ذریعے اپنے عشق کا اظہار کیا ہے۔ گویا ہمیں آپ کے یہاں وہ شاعری ملتی ہے جس کو قرآن نے بھی جائز قرار دیا ہے اور ایسی شاعری کرنے والوں کو تلمذ الرحمٰن کہا گیا ہے۔

شاعری کا نمونہ اور ان کی غزلوں میں عشق حقیقی کا لطف ہم بعد میں لیں گے پہلے یہاں آپ کی وہ غزل پیش کی جاتی ہے جو آپ نے اپنے والد یعنی پیر روضے دھنیؒ کے فراق میں کہی۔

غزل

ای خانہ کد خدا تو گو باز رفتہ ست
آن ساکن سرائی تو گو باز رفتہ است
آن کز فروغ رویش روزت مضئی بود
آن نور روز ہائی تو گو باز رفتہ ست
آن کر عشابہ صبح شبت زندہ داشتی
محی لیالی تو گو باز رفتہ است
آن کز و لاش نامت شد کعبہ عجم
مقصود نا مہائی تو گو باز رفتہ ست
آن کز تبنیش تو چو بیت المقدس
آن بانی بنائی تو گو باز رفتہ ست

پھر اسی طرح ایک بیت اپنے والد کی تعریف میں بھی کہا ہے۔ اور نہایت دل کش انداز میں کہیں کہیں اپنے والد کو مخاطب بھی کیا، اور ان کی تعریف میں نہایت عمدہ لفظیات و کنائے سے کام لیا ہے۔ اس بیت کے اشعار اس طرح ہیں:

بیت

من چه گویم مدح حسن بی مثال اندر مثال
خلقه فی احسن التقویم ربی ذوالجلال
نہر جائی جنت اندر جنت از ماتشنگی
کی برندار ما، ننوشیم ازلبش آب زلال
آنکه تلخی فراقش این چنین است
بازگو یندمہ چہ لذت دارد او اندر وصال

اب ہم یہاں پیر صاحب پگارا کا وہ کلام پیش کرتے ہیں، جو تصوف میں ڈوبا ہوا ہے۔ جس کے مطالعے سے پیر صاحب کے سینے کی اس لگن، اوران کے وجدان کے اس انوار کو دیکھا جا سکتا ہے۔ جو ہمیں کہیں ان کی تقریروں میں بھی نظر آتا ہے، کہیں واعظ اور نصیحتوں میں، کہیں جہاد کی تیاریوں میں اور کہیں شاعری میں۔

شاعری میں بالخصوص شاعر کے جذبات واضح طور پر سامنے آتے ہیں اس لیے کہ اس موقع پر شاعر بعض جگہ ان کہی باتیں بھی کہہ جاتا ہے۔ اور چوں کہ اپنے محبوب کو اپنے سامنے دیکھتا ہے اس لیے شاعری میں بیان اور تیکھا، اور معنی خیز اور امکانات وسیع تناظر میں دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پیر صاحب کا محبوب وہ ہے جو ہزار پردوں میں چھپا ہے مگر سب پر عیاں ہے۔ جو دکھائی نہیں دیتا اور نظر بھی آتا ہے، وہ جسے فلسفۂ وحدت الوجود والے ہوں یا فلسفۂ وحدت الشہود والے سب شاعری میں جب اسے یاد کرتے ہیں تو کائنات پر تمام جمال اور انوار اسی ذات والا صفات کا صدقہ ٹھیراتے ہیں، کیوں کہ یہی حق ہے۔ پیر صاحب کے کلام میں بھی اسی فلسفے کی ترجمانی نظر آتی ہے۔ آیئے چند غزلیں دیکھتے ہیں۔

غزل

تشنگی صدف چون شود بسیار
بحر سقیش سحاب می آید
عاشق بی گناه را کشتن
دلبرانرا صواب میں آید

روشمودن، ہچومن مسکین
نازنین راحجاب میں آید

غزل

دردا کہ رفت تار زما کار برنشد
وقتی وداع گشت دل از خواب پر نشد
ہر چند سعی کردم کاندر رکابِ جانان
باشم ہمیشہ دوان درپائی باد پایان
از طالع نگون سرواز بخت شوم پایان
نامد، مدد نخواست بما ہمسفر نشد
ہیہات آہ ودرد کہ آن یار سروقد
دیروز رفت ازما، مارا بخود نبرد
بود درد دلم کہ ماہم ہمراہ یار خود
گردم روان ولیک اجل راہبر نہ شد

غزل

دلبرا صبرو قرارم بردۂ
خانمان بیچارہ ویران کردۂ
خرقہ پشمین زہد از دوش من
بے حیا کشتی بغارت بردۂ

زہد و تقویٰ و ورع با جان و دل
این ہمہ بردہ ہنوز آزردۂ
دستم از دامان خود ای نازنین
چہ گنہ دیدی و از چہ افشردۂ
از فراقت اندرونم چاک چاک
چین برابر ابرو، چرا آوردۂ
ای فراق! گر دہد دستم وصال
آن کنم باتو کہ تو با ما کردۂ
ہست امید وصال از درگہش
پس تو ای مسکین! چرا پژمردۂ

غزل

خرقہ پوشیست خود نمائی نیست
عشق بازی ست میرزائیٔ نیست
حال مجنون زگرد مجنون پرس
دور گردی است آشنائی نیست
خون دل جرعہ جرعہ نوشیدن
کارِ رندی ست پار سائی نیست

فرد

رقیب سگ صفت رابدنمی گویم کہ ازمن یار می رنجد

عجیب یاری کہ از بھر سگ مردار میں رنجد

فرد

ما بدلبر مدتی ہم خانہ بودم یا نصیب

این زمان دلبر زمن من زو جدایم یا نصیب

پیر صبغت اللہ شاہ پگارا (اول) کے ملفوظات اور اس کا پس منظر:

''۴، ذی قعد، ۱۴۱۱ھ کو فقیر محمد رحیم نے پگارا (اول) کے ملفوظات ''خزینۃ المعروف'' کی اشاعت سے متعلق ابتدائی صفحات پر لکھا ہے کہ۔

''۱۲۵۵ھ میں ان ملفوظات کی کتابت ہوئی۔ پیر سائیں علی گوہر شاہ کی مہریں لگی ہوئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخہ ان کا اپنا ہے۔ اندازاً، ۲۸، برس پہلے زیر نظر ملفوظات کا نسخہ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ نے جامعہ راشدیہ کے مہتمم استاد مولانا محمد صالح ؒ کے پاس دیکھا۔ اور وہ حاصل کیا ڈاکٹر صاحب کا ارادہ تھا کہ سندھی ادبی بورڈ سے ملفوظات شایع ہوں، ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۹۷۶ء میں استاد مولانا محمد صالح ؒ کا وصال ہوا۔ ۱۴۱۰ھ تک ملفوظات شریف کے ترجمے اور اشاعت کا کام نہیں ہوا۔''(۱۰)

ان ملفوظات کی تفصیل، کاتبین کا تعارف اور زمانے کے علاوہ ان ملفوظات کی دینی، روحانی اہمیت اور اس کی تفصیل ہمیں ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کے فاضلانہ مقدمے سے حاصل ہوتی ہے، چناں چہ یہاں ملفوظات کے انتخاب کے علاوہ ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ کے مقدمے کا اردو ترجمہ بھی پیش کیا جارہا ہے۔

ان ملفوظات کی روشنی میں ہم صبغت اللہ شاہ مرحوم کے دینی رجحانات، تبلیغ کا جذبہ، دینی خدمات اور اسلام کی تعلیمات کے حوالے ملتے ہیں نیز ان ملفوظات میں ایسی روشی ہے جو آج بھی دلوں کو منور اور اذہان کو تابندہ کرسکتی ہے۔ راقم نے ملفوظات کا انتخاب کرتے ہوئے موضوعات بھی واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ مقدمے میں کہتے ہیں:

''لغت میں ملفوظا کے معنی زبانی لفظاً یا کہی ہوئی بات کے ہیں اس کی جمع ملفوظات ہے۔

اصطلاحی معنوں میں ملفوظات سے مراد، ولی، عارفین، طریقت کے صاحبوں اور مرشدوں کے بیان یا اقوال کے ہیں ان میں قلب، اور نیت کی صفائی، اخلاق نصیحتیں کی مثالی باتیں، درویشی اور دانائی کی حقیقتیں اور عقیدت مندوں کی رہنمائی کے لیے دینی اور دنیاوی ہدایات وغیرہ ہوتی ہیں۔

یہ ملفوظات (خزانۃ المعرفت) یہ صحیح معنوں میں معرفت کا خزانہ ہے۔ ہندستان میں سہروردی اور چشتی طریقے کے بزرگوں کی ملفوظات۔ ۷، ۸، صدی میں مشہور ہوئے۔

سندھ میں سہروردی، قادری اور نقشبندی طریقے کے ملفوظات لکھے گئے۔ قادری طریقے میں محمد راشدؒ (روضے دھنی) کے فیض اور تلقین سے آپ کی جماعت والوں میں ملفوظات جمع کرنے کا ذوق ہوا۔

۱۔ آپ کے خلیفہ محمود نظامیؒ نے اس جمع آوری کی شروعات کی اور ''مجمع الفیوضات'' کے نام سے اپنے مرشد کے ملفوظات لکھے۔

۲۔ دوسرے ملفوظات خلیفہ محمد حسین مھیسرؒ نے لکھے۔

۳۔ یہ تیسرے ملفوظات (خزانۃ المعرفت) حضرت محمد راشد کے فرزند اور سجادہ نشین حضرت صبغت اللہ شاہؒ (پیر پگارا) کے قول اور فرمودات شامل ہیں۔

۴۔ صبغت اللہ شاہؒ کے سجادہ نشین علی گوہر شاہؒ ''اصغر'' صاحب نے یہ ملفوظات مرتب کیے۔

دین کے علم میں آپ کو (صبغت اللہ شاہ اول) تجہ دھنی، اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ قرآنِ پاک، حدیث شریف اور فقہی احکامات سے باخبر تھے۔ آپ صبح نماز کے بعد حدیث سنایا کرتے تھے۔ آپ کے حدیث کے عارف و شارح تھے۔

جہاد کے بارے میں آپ نے فرمایا: بہشت غازیوں کی تلوار کے سائے میں ہے۔ آپ نے ذکر الٰہی کو افضل جانا اس لیے ان ملفوظات کی شروعات بھی ذکر الٰہی سے ہے۔

عشق حقیقی، دکان کا سودا نہیں جو پیسے سے خریدے، نہ چوری سے، نہ زبردستی سے، نہ لڑنے سے، بلکہ یہ نعمت اللہ پاک کا عطیہ ہے۔

عشق ہر چیز کا مغز اور خلاصہ ہے، جیسے مغز بادام کے اوپر دو چھلکے ہوتے ہیں ایک موٹا اور ایک پتلا چھلکا ہوتا ہے۔

اسی طرح عشق کے مغز پر بھی دو چھلکے ہوتے ہیں۔ایک کفر دوسری شریعت۔

عرفان کے مقام پر آپ کے ارشادات اکثر جلال الدین رومی کی مثنوی کی روشنی میں تھے۔مثنوی کے مطالعے کا شوق اور سبق آپ کو اپنے والد سے عطا ہوا، آپ نماز کے بعد مثنوی کا درس دیتے تھے اور مولانا رومی کے عارفانہ اسرار کی تشریح کرتے تھے۔

ملفوظات سے معلوم ہوتا ہے کہ سائیں صبغت اللہ شاہؒ کی طبیعت میں بے نیازی اور استحکام، خدا ترسی، غریبوں سے ہمدردی، جہاد کا جذبہ، بہ درجہ اتم موجود تھا۔ایک فقیر نے نذرانے کے طور پر کچھ رقم دی، تو آپ نے فرمایا: دیکھیں لوگ حرام (دنیا) تو ولی کو دیتے ہیں۔لیکن حلال (دل) کوئی بھی نہیں دیتا۔آپ کے پاس جو بھی پیسے ہوتے تھے وہ خیرات کر دیا کرتے تھے۔ایک رات آپ کو بے آرامی ہوئی، فقیر خیر محمد سے پوچھا کہ کچھ پیسے رکھے ہوئے تو نہیں ہیں۔فقیر نے دیکھا کہ ایک چاندی کا ٹکڑا رکھا تھا۔تو آپ نے کہا: یہ کسی کو دے دو۔اس کے بعد آپ کو آرام آیا۔فقیر کو تلقین کی کہ اللہ پر بھروسا کریں، جتنا ہو سکے دولت مندوں سے دور رہیں، آپ کبھی حکمرانوں کی پروا نہیں کرتے تھے۔

آپ نے فرمایا: کہ لوگ کہتے ہیں یہ فقیر، یہ مرشد یا ولی ہے۔مگر ان کہنا غلط ہے۔فقیر، اولیٔ وہ ہے جو سنت پر عمل پیرا ہو۔ایک دن ایک غافل اور بیکار شخص کو تنبیہ اور نصیحت کی تو فقیروں نے کہا۔ہم مریدوں کا ننگ مرشد کے ذمے۔آپ نے جلال میں آ کر فرمایا: کہ ایسا بے بنیاد دعویٰ کرتے ہو۔ جیسے عباسی حاکموں (کلھوڑا) کے زمانے میں ان کے مرید ہر مشکل وقت میں ایسے الفاظ کہنے کے عادی ہو گئے تھے۔"گھت میاں تے" "گھت میاں تے" (میاں پر رکھ) اس لیے وہ برباد ہو گئے۔

آپ نے صفائی کا سبق دیا، غسل کرنا، خوشبو لگانا صاف کپڑے پہننا وغیرہ کی ترغیب دلائی جو سنت طریقہ ہے۔

روحانی برکات:-

اس خاندان میں روحانی تعلیمات، اور دینی رجحان کا زیادہ اثر حضرت محمد راشدؒ (روضے دھنی) کے جملہ اوصاف سے راسخ ہوا، پھر اُن کی اولاد میں اس لیے زیادہ نمایاں ہوا کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے مریدین اور معتقدین میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔پگارا اوّل کے مریدوں نے ایسے کئی واقعات لکھے ہیں جو مرحوم کی زندگی کے روشن پہلوؤں کے ترجمان

ہیں۔ان میں سے چند کا یہاں دیکھ لینا ضروری ہے۔

(فقیر) مریدوں سے پیار محبت:-

کوئی مرید بیمار ہوتا تھا تو اس کی عیادت کے لیے جاتے تھے۔فقیر (غلام علی ملکانی لغاری) آپ کو دعا کے لیے کہا تو آپ نے پوچھا کون سی دعا کروں۔فقیر نے کہا جو آپ کی مرضی آپ نے دعا کی کہ خدا کرے اپنی جلد ملاقات ہو۔

آپ اپنے فقیروں سے بے تکلفی اور خوش طبعی سے پیش آتے تھے۔شہولی فقیر نے کہا کہ سائیں میں نے پوری زندگی نہ عبادت کی ہے نہ کوئی اچھا کام۔آپ کے سوا میرا چھٹکارا ممکن نہیں اور آنکھوں میں آنسوں بھر آئے۔تب مرشد نے فرمایا انشاء اللہ آپ کو عذاب نہیں ہوگا۔اس بات کا فقیر کے اوپر اتنا اثر ہوا جب آپ،٦، رمضان ١٢٤٦ھ میں وصال ہوا تو یہ خبر سننے کے،١١، دن بعد شہولی فقیر کی،١٧، رمضان کو وفات ہوئی۔

(صبغت اللہ شاہ اول تجر دھنی) زندگی کے عادات اور اطوار:-

بہ استفادہ، ملفوظات (خزانۃ المعرفت)

آپ تہجد گزار تھے۔عارف شیخ فرید الدین عطار کی مناجات پڑھتے تھے اور فارسی میں دعا کرتے تھے۔فجر نماز کے بعد وظیفہ کرتے تھے۔اور قرآن پاک پڑھتے تھے۔ظہر کی نماز کے بعد مثنوی شریف پڑھتے تھے۔نماز عصر کے بعد قرآن پاک پڑھتے تھے عشاء کے بعد فقیروں کے ساتھ جا کر روضے کی زیارت اور دعا کرتے تھے۔جمعہ کے دن کرسی پر بیٹھ کر تقریر کرتے تھے۔

مسجد کے ساتھ آپ کے مطالعے کا کمرہ ہوتا تھا۔درگاہ پر کشتی کے ذریعے خیر پور جاتے تھے۔لنگر کا انتظام بچل فقیر کے حوالے تھا۔آپ فقیری کو پسند کرتے تھے اور فرماتے تھے۔جو شخص مسکینی

سے دولت مند ہو جائے تو اسے مسکینی کو نہیں بھولنا چاہیے آپ کا طعام بھی سادہ تھا۔

ان ملفوظات کا جامع آپ کے فرزند جناب پیر صاحب علی گوہر شاہ ''اصغر'' ہیں یہ خود بھی عالم، فاضل، شاعر اور ادیب تھے۔اور طریقت میں معرفت کے صاحب مجاز تھے۔ص ۱۲۵۵ھ میں ''خزینۃ المعرفت'' لکھ کر مکمل کی۔

بہ استفادہ ''مقدمہ'' (ملفوظات)

یہ مقدمہ ملفوظات کے مرتب پیر گوہر علی شاہؒ ''اصغر'' نے تحریر کیا ہے، جو ایک خاص پس منظر رکھتا ہے۔

ملفوظات کو جمع کرتے ہوئے دل میں خیال آیا کہ حضرت کے مقام و مرتبے کے لیے کیا لقب استعمال کروں۔ چند دوستوں نے ''ختم العارفین'' کا مشورہ دیا۔اس دوران میں فقیر عبداللہ نے ایک خواب دیکھا وہ سچا عاشق اور بھروسے والا طالب تھا۔اس نے حضرت پیر سائیں روضے دھنیؒ کو خواب میں دیکھا کہ سائیں کو ہم خلیفۃ اللہ کا لقب دیتے ہیں۔حضرت (پیر روضے دھنیؒ) کی عادت تھی کہ ان کو (پیر صبغت اللہ شاہ ملفوظات) کے پیٹ پیچھے بڑے پیار سے بلاتے تھے۔کیوں کہ آپ کے تمام بیٹے کے عمر اور اوصاف میں بڑے تھے۔پھر اس کتاب میں جہاں بھی لفظ ''خلیفۃ اللہ'' لکھا ہوا ہے اس سے مراد حضرت سائیں سے ہے۔''حضرت اوشان'' ترجمے میں ''حضرت'' اور کہانیوں میں (یعنی واوین میں) ''پیر سائیں روضے دھنی'' لکھا ہے۔

اس سے مراد حضرت مرشد المرشد (حضرت سائیں) کے والد اور اس مسکین کے دادا (پیر سائیں روضے دھنی) ہوگا۔طریقہ عالیہ، قادریہ، نقشبندیہ اور چشتیہ کے پیروں کے بیان میں حضرت نے (پیر روضے دھنیؒ) کی وساطت سے روحانی اور معنوی نسبت اور تعلق رکھتے ہیں۔''

ان ملفوظات کے ابواب کے سرنامے کو دیکھنے ہی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ دین کی کتنی بڑی خدمت ہے کہ لاکھوں افراد کی رہنمائی کے خاطر کیسے اہم اور دقیق موضوعات پر پیر صاحب مرحوم نے ذکر و وعظ فرمایا۔پھر یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب مرحوم کی نظر میں عمل اور شریعت بنیادی اوصاف ہیں جس سے تصوف کی تعلیم مکمل ہو سکتی ہے اور ایک سالک منزل یاب ہو سکتا ہے۔اسی لیے انھوں نے اپنے ملفوظات میں شریعت اور عمل پر زیادہ زور دیا ہے۔اس بات کو ہم

یوں بھی ادا کر سکتے ہیں کہ شرعی عمل پر زیادہ زور دیا ہے۔ پھر تیسرا نکتہ جو دیکھنے میں آیا ہے وہ نیت ہے۔ اگر چہ ہم نے یہ نکتہ اپنے مطالعے کی ترتیب سے پیش کیا ہے جب کہ اس حقیقت سے انکار نہیں کہ نیت عمل اور شریعت دونوں کی اساس اور بنیاد ہے۔ بہ ہر حال پیر صاحب مرحوم نے نیت پر بھی بہت زور دیا ہے اور یہ واضح کیا ہے کہ نیت کا صاف ہونا، مضبوط ہونا سب سے افضل اور بڑھ کر ہے۔

ایک اہم موضوع ہمیں "لا الہٰ الا اللہ" کی فضیلت بھی ملتا ہے۔ چاروں سلسلوں میں ذکر کی فضیلت اپنی جگہ مسلمہ ہے کہیں یہ ذکر خفی ہے اور کہیں جلی۔ بالخصوص سلسلہ نقشبندیہ میں ایک سالک کا تمام سفر ذکر کے بدولت طے ہوتا ہے، اور سلوک کی تمام منازل طے کرنے میں کام یاب رہتا ہے جو جتنا ذکر کرتا ہے اس پر کائنات کے رموز و اسرار اُسی قدر کھلتے چلے جاتے ہیں اور وہ اس ذکر کی لذت سے اس قدر لطف اندوز ہونے کا عادی ہو جاتا ہے کہ اسے کارِ جہاں فضول معلوم دیتے ہیں اور وہ اس ذکر میں مشغول رہنے کو ترجیح دیتا ہے۔ کیوں کہ وہ جانتا ہے یہی وہ کلید ہے جس سے تمام دروازے سالک پر واہوتے چلے جاتے ہیں۔ ذکر کے دوران یعنی بیٹھے بیٹھے خاموشی سے یہ تصور کرنا کہ میرا دل جو میرے بائیں ہاتھ پر ہے اندر سے اللہ اللہ کر رہا ہے۔ پھر یہ آواز ایک تصور نہیں حقیقت بن جاتی ہے اور پھر اس کی فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسی فضیلت کو پیر صاحب مرحوم نے اپنے ملفوظات کے پہلے باب میں پیش کیا ہے جس کی ترتیب اور تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

باب (۱)	ذکر لا الہٰ الا اللہ کی فضیلت۔
باب (۲)	عملوں کی نیت۔
باب (۳)	علم حاصل کرنا۔
باب (۴)	شریعت کے بارے میں۔
باب (۵)	شریعت کی تابعداری۔
باب (۶)	نماز کے بارے میں۔
باب (۷)	رمضان شریف کے روزے۔

(۱) ذکر:-

فقیر بلال کہلاتے ہیں کہ ایک دن خلیفۃ اللہ نے فرمایا: کہ موت اور سکرات کی تکلیف بہت سخت ہے لیکن ذکر کے ذریعے وہ آسان ہو جاتی ہے۔ ایسے جیسے مکھن سے بال کو نکالنا۔

دلبر فقیر سے روایت ہے کہ خلیفۃ اللہ فرماتے ہیں: کہ جیسے ذکر کا کلمہ نکلتا ہے تو خوبصورت پرندے کی شکل میں اللہ پاک تک پہنچتا ہے۔

خلیفۃ اللہ نے جمعہ کے دن تقریر کرتے حدیث کے حوالے سے بیان کیا کہ اگر کوئی شخص دل سے ذکر کرتا ہے تو پھر (فرض) نماز، روزہ، اور قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو وہ فرمابردار بندہ ہے اور اگر کوئی نماز، روزہ، اور قرآن پاک تو ادا کرے اور ذکر سے دل خالی ہو تو وہ بندہ نافرمان ہے۔

قرآن پاک میں ہے۔ وَاَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِی (میرے ذکر کے واسطے نماز قائم رکھ)

مثنوی میں مولانا روم نے فرمایا:

زبان پر سبحان اللہ کا وظیفہ اور دل میں گدھے اور جانوروں کے خیال، منہ میں شراب اور دل میں خدا کی یاد۔ یہ فرق عبادتِ قلب اور اس کے ذوق کے بغیر بے وقعت ہے۔

مَنْ کَانَ کَلامہ لااِلٰہَ اَلّا اللّٰہُ دَخَلَ الجَنۃ

جس شخص کو زندگی کے آخری سالوں میں کلمہ نصیب ہوا وہ جنتی ہوا۔

بلال فقیر نے کہا کہ خلیفۃ اللہ نے فرمایا: کہ جس بیماری کا علاج نہیں ہے اس کا علاج ذکر ہے۔

خلیفۃ اللہ نے فرمایا: دولت مند اگر دولت غریبوں میں دے مگر اس سے بہتر مسکین (غریب) ذکر کرنے والا ہے۔

خلیفۃ اللہ نے فرمایا: کہ حدیث ہے کہ ذکر ایک کوٹ (کمرے) کی طرح (جنت) ہے۔

خلیفۃ اللہ فرماتے ہیں کہ اللہ پاک کا ارشاد ہے کہ میں بندوں سے (اپنے عنایتوں

کے) ساتھ ہوں اس وقت تک جب تک بندہ ذکر میں ہے۔

خلیفۃ اللہ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ہے کہ ہر چیز کی قیمت ہے اور بہشت کی قیمت ذکر میں ہے۔

خلیفۃ اللہ فرماتے ہیں حدیث ہے کہ جو شخص ہاتھ پاؤں سے کام کرتا ہے اور زبان سے ذکر تو اس شخص کا کام بھی آسان کرتا ہوں اور ذکر کا ثواب بھی۔

(۲) عمل کی نیت:-

بلال فقیر سے روایت ہے کہ خلیفۃ اللہ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ نماز (فرض) کی ادائیگی میں جلد بازی کرنی چاہیے یا آہستہ کرنی چاہیے۔تو آپ نے فرمایا: کہ حدیث ہے کہ لاصٰوۃ الا بحضور القب یعنی نماز دل کے حضور کامل ہوتی ہے۔

وسایے فقیر نے کہا کہ خلیفۃ اللہ نے فرمایا: کہ دینی و دنیاوی ہر کام ضروری ہے اور ہر کام کا ثواب بھی ہے مگر شرط ہے نیت صحیح ہو۔عمل کا ردو مدار نیت پر ہے۔

(۳) علم حاصل کرنا:-

دلاور فقیر نے کہا کہ خلیفۃ اللہ" فرماتے تھے کہ فقیر ہونا بھی آسان ہے۔بزرگ اور پیر ہونا بھی آسان ہے۔لیکن عالم ہونا مشکل ہے کیوں کہ عالم، علم کے بغیر نہیں ہوتا۔

خلیفۃ اللہ" نے فرمایا: کہ ہر شخص کے لیے اتنا علم ضروری ہے کہ وہ نماز اور دوسری عبادات اور قرآن پاک کی تلاوت اس کے لیے ممکن ہو سکے۔

(۴) شریعت:-

خلیفۃ اللہ نے فرمایا کہ حدیث شریف ہے کہ: کُل مسکرِ حرام (ہر نشہ آور چیز حرام ہے) شراب پینے والا، پلانے والا، شراب کی مزدوری کرنا، شراب بیچنے والے وغیرہ پر اللہ پاک نے

لعنت دی ہے۔

خلیفۃ اللہؒ نے اعتکاف کی فضیلت بیان کی کہ جوشخص آخری عشرے میں اعتکاف میں بیٹھے گا اس کو دو کامل حج یا دو کامل عمرے کا ثواب ہوگا۔

خلیفۃ اللہؒ مسجد میں تھے، اصغر (پیر علی گوہر شاہ جامع ملفوظات) آپ کے ساتھ تھے۔ تو فرمایا: قرآن پاک اور احادیث پر عمل کرنا شریعت ہے۔

(۵) نماز:-

خلیفۃ اللہ نے فرمایا: جوشخص نماز کی ہمیشہ، پابندی کرتا اور اسے قائم رکھتا ہے تو یہ نماز اس کے لیے روشنائی اور دلیل ہے اور عذاب سے چھٹکارے کا سبب ہے اور جو غفلت کرتا ہے وہ ان تمام باتوں سے محروم اور بدنصیب ہے۔

آپ نے تہجد پڑھی اور فرمایا آپ لوگ بھی تہجد پڑھیں (۶ نفل) ہر نفل میں پہلی رکعت میں جو سورۃ یاد ہو اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص (قل ھو اللہ احد) پڑھیں۔ بعد میں قرآن پاک کی تلاوت کریں۔

وعظ اور نصیحت سچائی کی فضیلت اور جھوٹ کی مذمت۔ ریاء والی عبادت اور سخاوت کچھ کام کی نہیں۔

کمال فقیر مؤذن نے کہا کہ خلیفۃ اللہ نے فرمایا: حسد اور فتنہ اتنی خراب چیز ہے کہ اس کا اثر جانوروں پر بھی ہوتا ہے حسد کی وجہ سے نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں۔ حدیث ہے: حسد سے بچو کیوں کہ حسد نیکیوں کو ختم کر دیتی ہے، جیسے آگ لکڑیوں کو جلا دیتی ہے۔

سلطان فقیر نے کہا کہ خلیفۃ اللہ نے فرمایا: کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ جلدی سو جائیں اور جلدی اٹھ جائیں۔ کیوں کہ دیر سے سونا اور دیر سے اٹھنا کافروں کا طریقہ ہے۔ ارشاد ہے کہ: اے کمبل اوڑھنے والے محبوب! رات کو اٹھ کر عبادت کر سوائے تھوڑے حصے کے لیے اور قرآن پاک کو ٹھہر ٹھہر

کر پڑھیے۔

محمد فقیر نے کہا کہ خلیفۃ اللہ نے وحدت اور معرفت کے موضوع پر فرمایا: کہ معرفت نہ ظاہری علم سے ملتی ہے نہ ریاء والی عبادت سے اور نہ ظاہری عقل سے ظاہری معرفت کی دولت اگر نصیب ہوتی تو ابلیس لعنتی کو ہوتی وہ فرشتوں کا استاد تھا۔

معرفت کی سعادت ظاہری عقل سے ہوتی تو حکیم افرادوں کو ہوتی۔ معرفت کی سعادت ظاہری عبادت سے نصیب ہوتی تو پھر سیانے عابد کو ہوتی وہ عبادت گذار تھا زاہد تھا آخر کار شیطان لعنتی کے تابعدار میں ہوا۔

محمد فقیر نے کہا کہ ایک دن حضرت خلیفۃ اللہ ٹنڈے بہادر خان میں رونق افروز ہوئے اور جوش میں آکر فرمایا: کہ کون کہتا ہے کہ مرد کو خاص پوشاک کم خواب وغیرہ درست نہیں۔

وہ تمام مردوں کو درست ہیں۔ مرد سے مراد ہے خدا کی راہ کا مرد دنیا والے نہیں اور یہ آخرت کا طالب مؤنث ہے اور اللہ کا طالب مذکر ہے اور مرد وہ ہیں جو ماسوائے اللہ کو چھوڑ کر خدا کی طلب میں رہیں اور اپنی کوشش بالکل چھوڑ دیں اور بہ غیر کوشش کے جو چیز حاصل ہو جائے اسے قبول کرلیں۔

حاجت بکلاہ ترکی داشت نیست
درویش صفت باش کلاہ تتری دار
زاہدی در پلاس پوشی نیست
زاہدی پاک باش اطلس پوش

حضرت خلیفۃ اللہؒ نے فرمایا کہ روزے میں دن کے آخر میں جو منہ میں بو ہوتی ہے، اللہ پاک کو روزے کی وجہ سے وہ بو ایسی پسند ہے جیسے لوگوں کو مشک اور زعفران یا اس سے بھی زیادہ۔

حضرت خلیفۃ اللہ نے رمضان شریف کا چاند دیکھنے کے لیے، شعبان کے چاند دیکھنے کی تاکید کی اور اس بارے میں ایک حدیث کی طرف اشارہ فرمایا کہ رمضان کا چاند دیکھنے کے لیے شعبان کا چاند بھی دیکھ لینا چاہیے۔

حضرت خلیفۃ اللہؒ نے فرمایا کہ روزے دار کو چاہیے کہ بے غیر سحری کیے ہوئے روزہ نہیں رکھے اگر کچھ موجود نہ ہو تو ایک کھجور کھا کر پانی پی لے اگر پانی بھی نہ ہو تو کچھ بھی کھا کے پھر روزہ رکھے۔

☆☆☆

یہ ملفوظات پیش کرنے کے دو بنیادی مقاصد ہیں، ایک تو یہ کہ اس کے تناظر میں پیر صاحب پگارا (اوّل) کی فکر اوران کی دینی خدمات کو پیش کیا جا سکے دوسری بات یہ ان ملفوظات کے آئینے میں ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ پیر صاحب پگارا (اوّل) کی نظر قرآن اور سنت پر شریعت اور طریقت پر کس قدر گہری تھی۔ چناں چہ اب ہم چند نکات کی صورت میں متذکرہ ملفوظات اور مجموعہ ہائے ملفوظات کو پیش کرتے ہیں، جن سے ایک تاثر ضرور قائم ہوگا۔

(۱) ان ملفوظات میں بنیادی چیز ''ذکر'' کو قرار دیا گیا ہے۔ جیسا کہ ہم اس بحث سے قبل مختصراً طور پر ذکر کی فضیلت و اہمیت کو بیان کر چکے ہیں کہ علمائے کرام اور مشائخ نے ذکر کو ایک رابطہ قرار دیا ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم غارِ حرا میں ذکرِ خفی فرمایا کرتے تھے، چناں چہ معلوم ہوا کہ یہ سنت طریقہ بھی ہے اس طریقے کو سلسلہ تصوف میں نقشبندی بالخصوص اختیار کرتے ہیں۔ پگارا صاحب نے بھی اپنے مردین اور معتقدین کو ذکر کی ضرورت پر آمادہ رکھا، اس سے استفادہ کرتے ہوئے ان کے مریدوں نے اس درس کی تبلیغ فرمائی۔

(۲) حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمل کو نیت کی بنیاد قرار دیا ہے، اس مجموعہ ہائے ملفوظات میں اس قولِ زریں کو دہرایا گیا ہے۔ نیت راسخ تو عمل آسان اور ممکن ہوتا ہے۔ یہ قول صرف دینی عمل ہی کے لیے ضروری نہیں بلکہ اس سے دنیاوی کاموں میں بھی استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

(۳) حدیث ہے: کہ ''عالم کے قلم کی سیاہی شہید کے لہو سے بڑھ کر ہے''۔ قرآنِ پاک میں فرمایا گیا:

''نٓ وَالقلمِ وَمَا یَسْطُرُوْن''

(قسم ہے ن کی اور اس قلم کی جس سے لکھنے والے لکھ رہے ہیں)

مقبول شعر ہے:

قلم گوید که من شاه جهانم
قلم کس را بدولت می رسانم

اس سے معلوم ہوا کہ علم انسان کی فضیلت اور مرتبے کے لیے لازم وملزوم ہے اس لیے کہ علم کے معنی ہی ''نامعلوم سے معلوم کی طرف سفر ہے''۔

پیر صاحب پگارا اوّل نے بھی اپنے اقوال میں اور تعلیمات میں علم کو ضروری قرار دیتے ہوئے اپنے حلقہ ہائے ارادت منداں پر زور دیا ہے کہ وہ علم کے حصول میں کوشاں رہیں، ان کے متعدد ملفوظات علم کے حوالے سے ممتاز اور ممیز ہیں۔

(۴) سنت کے بہ غیر دینی اعمال میں کوئی کشش نہیں اسی سے شریعت اور طریقت کی راہ ہموار ہوتی ہے۔ پیر صاحب نے سنت کو لازم قرار دیا ہے کہ زندگی کے روزمرہ معمولات میں بھی اگر مسلمان سنت کا خیال رکھیں اور انہیں اختیار کرنے کی کوشش کریں تو عبادت میں کشش پیدا ہوگی اور عمل مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا۔ نیز اس عمل سے فطری طور پر رسول پاک ﷺ سے محبت اور عشق کا ایک رشتہ قائم ہوگا جو سالک کے لیے راہِ سلوک میں بہت آسانی پیدا کردے گا۔ پھر یہ بھی سچ ہے کہ روزِ قیامت یہ محبت اور عشق وسیلہ مغفرت اور ذریعہ شفاعت بن سکے گا۔

(۵) عبادت میں استقامت اور استحکام اسی صورت میں ممکن ہے جس متذکرہ نکات کو زندگی کا حصہ اور فکر کی بنیاد بنایا جائے، اس لیے پیر صاحب پگارا نے عبادت سے قبل ان ضروری نکات کو غور سے دیکھنے اور ان کو اختیار کرنے پر زور دیا ہے۔ اور اس کے بعد اس امر کو بھی ضروری سمجھا ہے کہ زیادہ سے زیادہ وقت عبادت میں گزارا جائے، رات کے اوّل پہر میں سونا اور پچھلے پہر میں جاگنا اور پھر عبادت میں مشغول ہو جانا یہ سب تعلیماتِ مصطفوی میں شمار ہوتا ہے اور ایک مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان تعلیمات سے ہمہ وقت استفادہ کرتا رہے، اس کے ساتھ انھوں نے مسلمانوں کی بہتری اور فلاح کی سوچ کو بھی عبادت کا درجہ دیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ پیر صاحب پگارا نے بھی یہ عبادت بڑی مستعدی سے اختیار کی تھی۔

(۶) حرام اور حلال میں فرق بھی بہت اہم ہے۔ پگارا صاحب نے اس نکتے کو بھی اجاگر کیا ہے یہاں ہم آپ کے والد کے ایک قول سے بھی بات کو واضح کر سکتے ہیں کہ انھوں نے کہا:

''حلال چیز تو وہ ہے جس میں خواہش کا دخل نہ ہو، جو کام اپنی خواہش سے کیا جائے وہ سب حرام ہے، ایسی چیز اللہ تعالیٰ طالبان کو نہیں کھلاتا۔ خراب چیزیں خراب اشخاص کے لیے اور پاکیزہ چیزیں پاک اشخاص کے لیے ہیں۔''

حواشی

(۱) اعجاز الحق قدوسی، ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' اردو اکیڈمی کراچی، مطبوعہ: ۱۹۵۹ء

(۲) ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' تبسم چودھری، کنگری پرنٹرس حیدر آباد، مطبوعہ ۱۹۷۵ء

(۳) محولہ بالا

(۴) اس فرمان کو اقبال نے بھی نظم کیا ہے:

مرے خاک وخوں سے تو نے یہ جہاں کیا ہے پیدا
صلۂ شہید کیا ہے ؟ تب و تابِ جاودانہ

(۵) ''پیکرِ حریت'' صفحہ ۳۵-۳۶

(۶) اعجاز الحق قدوسی، ''تذکرہ صوفیائے سندھ'' اردو اکیڈمی کراچی، مطبوعہ: ۱۹۵۹ء

(۷) ''لبِ تاریخِ سندھ'' صفحہ ۲۸۵

(۸) ''پیکرِ حریت'' میں صفحہ ۳۷ میں پیر پگارا صاحب اوّل کی تاریخِ وفات یکم رمضان درج ہے، لیکن اس کتاب میں کتابت کی اور غلطیاں بھی ہیں، مثلاً: صفحہ ۳۷ ہی پر سید احمد شہید کا سالِ شہادت عیسوی ۱۹۳۱ء لکھا ہے۔ کتابت کی غلطی سے سو سال کا فرق آ گیا۔

(۹) متذکرہ کتاب کے صفحہ ۵۶۸ پر سندھی میں روایت ہے جس کی یہاں ترجمانی کی گئی ہے۔

(۱۰) مقدمہ ''خزینۃ المعرفت'' (ملفوظات پیر صبغت اللہ شاہؒ اوّل)

پیر علی گوہر شاہؒ (م،۱۲۶۳ھ):-

المعروف، پیر پگارا (دوم) بنگلہ دھنیؒ

آپ بچپن میں سجادہ نشین ہوئے۔۱۵، برس کی عمر سے آپ نے شعر کہنا شروع کیے جن میں یادالٰہی کا تاثر نمایاں تھا۔ مشق سخن جاری رہی اور ہزاروں شعر کہے معرفت الٰہی کا یہ خزانہ ''اصغر سائیں کا کلام'' کے نام سے منصۂ شہود پر آیا۔ کہ آپ کا تخلص ''اصغر'' تھا اور چوں کہ آپ کو کم عمری میں سجادہ نشین بنایا گیا تھا۔ اس رعایت سے بھی آپ کو ''صغیر'' کہا گیا۔ ۴رجب ۱۲۳۱ھ میں پیر صبغت اللہ شاہؒ (پگارا اوّل) کے گھر پیدا ہوئے۔ والد صاحب کی شفقت میں دینی تعلیم حاصل کی آپ نے بنگلہ تعمیر کروایا اور اسی وجہ اور نسبت سے ''بنگلہ دھنی'' کا لقب پایا۔ آپ کے مرید آپ کے علم سے مستفیض ہوتے تھے۔ یہ سلسلہ آپ کے یہاں منعقدہ محفلوں میں جاری رہتا تھا۔ اس کے علاوہ آپ اپنے مریدوں کے یہاں بطور مہمان بھی جایا کرتے تھے، تو وہاں بھی درس کا یہ سلسلہ جاری رہتا، ایسا بھی ہوتا تھا کہ بعض مرید بالخصوص ان درسی محفلوں کا انعقاد کرتے اور اپنے مرشد کا خطاب سنتے۔

آپ نے اس خطے میں سیلاب کے خطرے کے پیش نظر ''پیر روضے دھنی'' اور والد پیر تجر دھنی'' کے تابوت منتقل کر کے نئی درگاہ موجودہ پیر جو گوٹھ میں دفن کیے۔ اس سے متعلق ایک مضبوط روایت ہمیں ''مخزنِ فیضان'' کے آخر میں ملتی ہے:

> ''آپ کے دور میں پرانی درگاہ مبارک کو دریائے سندھ کی طغیانی سے خطرہ لاحق ہوا تو آپ نے بتاریخ ۶، جمادی الاوّل ۱۲۵۰ھ اپنے جد امجد پیر سائیں روضے دھنی اور اپنے والد ماجد پیر سائیں تجر دھنیؒ کے تابوت وہاں سے منتقل کرا کر نئی درگاہ (موجودہ پیر گوٹھ) میں لائے، اور موجود درگاہ مبارک میں دفن کیے تھے، اس کے بعد یہ مقام رفتہ رفتہ بصورت قصبہ آباد ہوتا چلا گیا۔
>
> آپ ہی کے دور میں جب انگریزوں نے محرم ۱۲۵۹ھ بمطابق فروری ۱۸۴۳ء میں سندھ پر قبضہ کرلیا تو یہاں کے غداران ملک وملت دنیاوی مفادات کے حصول کی خاطر اقتدار انگریزی کا دم بھر نے لگے، اور انگریز حکام انہیں نقد انعام، جاگیریں اور خطابات دے کر نوازنے لگے۔ انگریز حکام چا

ہتے تھے، کہ پیر علی گوہر شاہ اولؒ بھی ان کے حضور حاضر ہو کر اپنی وفاداری کا اظہار کریں، لیکن آپ نے انگریز حکام کی جانب ذرہ بھر توجہ مبذول نہ کی، حسبِ سابق اپنے خاندانی معمولات میں مصروف رہے۔

انگریزوں کی جی حضوری کرنے اور وفاداری کا دم بھرنے والے رئیس اور خان بہادر انگریزی حکام کو سید علی گوہر شاہ اوّل کے خلاف بھڑکانے کی کوشش کرتے تھے، کہ پیر پگارا نے انگریزی اقتدار کو قبول نہیں کیا تھا، اور حکومتِ برطانیہ کے آگے سر نہیں جھکایا تھا، مگر چالاک انگریز پیر صاحب پگارا پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مناسب موقع کے منتظر رہے، اسی کشمکش کے دوران پیر علی گوہر شاہؒ صاحب صرف چار سال بعد ہی بتاریخ ۱۱ جمادی الاوّل ۱۲۶۳ھ چھتیس برس کی عمر میں وفات پا گئے۔''(۱)

آپ کے والد پیر صبغت اللہ شاہؒ (م، ۱۲۴۶ھ) کے سات بیٹے تھے۔

(۱) سید عبدالقادر شاہؒ

(۲) سید غلام مصطفیٰ شاہؒ

(۳) سید علی گوہر شاہؒ (اوّل)

(۴) سید علی محمد شاہؒ

(۵) سید علی حیدر شاہؒ

(۶) سید علی ذوالفقار شاہؒ

(۷) سید شاہ مراد شاہؒ

جیسا کہ ان میں آپ اپنے بھائیوں میں تیسرے نمبر پر آتے ہیں لیکن آپ ہی کو سجادہ نشین بنایا گیا۔ آپ کے حالاتِ زندگی جس میں انگریزوں سے محاذ آرائی بنیادی حوالہ ہے کا ہم تفصیلاً ذکر کریں گے، کیوں کہ یہ خود دین کی ایک خدمت ہے۔

انگریزوں نے جب سندھ پر قبضہ کیا ۱۲۵۹ھ میں کئی لوگ ذاتی فوائد، لالچ، موقع پرستی اور اقتدار کے لیے بک

گئے یہ انگریزوں کی چال تھی کہ مسلمانوں کو لالچ دے کر دین سے الگ، مذہب سے دور، اللہ اور اس کے رسول ؐ کی سنت یعنی شریعت کے خلاف کر دیں۔ انگریز نے اپنی حکمت کو کامیاب کرنے کے لیے کافی لوگوں کو مختلف طریقوں سے خرید لیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ پیر علی گوہر بھی ان کے ہم خیال اور وفادار ہو جائیں۔ طرح طرح کی کوششیں کی گئیں۔ سختی سے بھی اور لالچ سے بھی لیکن پیر علی گوہر شاہ کے پائے استقلال میں جنبش نہیں آئی اور انھوں نے کوئی بات نہیں مانی اور اپنی دینی خدمات جاری رکھیں۔

خان بہادر انگریز کے وفادار تھے ان کو بھی پیر علی گوہر شاہ کے خلاف کیا گیا بہت تکالیف برداشت کی لیکن اللہ پاک کے احکام کی پاسداری پرہیز گاری اور خدا کا خوف رکھتے ہوئے دنیاداری کی پروا کیے بغیر آپ نہ لالچ میں آئے اور نہ ہی کسی قسم کی سختی سے گھبرائے۔ کسی کی ایک نہ سنی اور انگریزوں کے اقتدار کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ انگریز کوشش میں لگے رہے لیکن پیر علی گوہر شاہ کی حمایت حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوئے آپ نے ،۱۱، جمادی الاول،۱۲۶۳ھ، میں وفات پائی۔

علمی اور دینی خدمات:۔

جب ہم پیر گوہر شاہؒ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ آپ میں عزم کا استحکام تھا۔ ورنہ آپ کے گرد جو سیاسی اور جغرافیائی حالات چل رہے تھے اس میں مضبوط ارادہ رکھنے والوں کے قدم بھی اکھڑ گئے تھے۔ لیکن چوں کہ آپ کو ایک دینی ماحول ملا تھا اور پیر صبغت اللہ شاہؒ جیسے مجاہد صفت انسان کے سایۂ عافیت اور سایہ شفقت میں تربیت پائی تھی ،اس لیے آپ کی زندگی میں مسلم امہ کی یک جہتی ،اسلام کی خدمت ،دین کی تبلیغ ،قرآن پاک کی تعلیم اور سنتؐ کا اتباع دیکھا گیا، آپ نے واعظ کے ذریعے ،شاعری کے ذریعے ،نجی محفلوں میں ،مختصر محفلوں میں ،منتخب مجلسوں میں اور دیگر موقعوں پر اسی درس کو پھیلانے کی کوشش کی جس کے بنیادی نکات یہ ہیں۔

(۱) اسلام سے محبت

(۲) شریعت کی پابندی

(۳) حق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کو ادا کرنے کی کوشش

(۴) یک جہتی اور بھائی چارہ

(۵) انصاف، تحمل، معیانہ راوی اور بلند اخلاق کا مظاہرہ

(۶) مسجدوں اور مدرسوں میں قرآن پاک کی تعلیم دینے کی ضرورت

(۷) غیر مسلم قوم کی حاکمیت کو تسلیم کرنے سے انکار

(۸) اپنی بقا اور سلامتی کے لیے جدوجہد کرنا

(۹) لالچ، دھونس، یا جبر میں نہ آتے ہوئے اپنی رائے پر قائم رہنا۔

(۱۰) اپنے بزرگوں کے نقش قدم کو راہِ حق سمجھنا اور اسے اختیار رکھنا۔

(۱۱) انصاف فراہم کرتے ہوئے غیر مسلموں کو مسلمانوں پر ترجیح نہ دینا۔

گوہر شاہؒ کی زندگی کے مطالعے سے یہ چند نکات ہمارے سامنے آتے ہیں جسے کتابِ حیاتِ گوہر کہنا چاہیے، لیکن بعض باتیں یقیناً تفصیل طلب ہیں مثلاً۔

''مخزنِ فیضان'' میں ذکر ہے کہ آپ ''علی گوہر شاہ کو ایک فرزند تھا۔ سید حزب اللہ شاہؒ تھے وہی سجادہ نشین بنے اور آپ علی گوہر شاہؒ ے وفات، ۱۱، جمادی الاول ۱۲۱۳ھ میں پائی۔

لیکن ڈاکٹر عبدالجبار، عابد لغاری ''جدجہد آزادی میں سندھ کا کردار'' لکھتے ہیں کہ پیر علی گوہر ساہ نے محرم الحرام، ۱۳۱۴ھ/۱۸۹۶ء میں انتقال کیا اور آپ لاولد تھے اس لیے چھوٹے بھائی ''سید شاہ مردان شاہؒ سجادہ نشین ہوئے۔

سید علی گوہر کے دور میں کھپرو، سانگھڑ اور شہداد پور میں دفتر بنائے۔ ان کا دور بہت ہی پر آشوب رہا۔ اس وقت کوئی تحریک نہیں تھی، حکومت مضبوط ہو چکی تھی۔ محکمہ سراغ رسانی، مال گذاری، جاگیرداری، اور خطابات نے بااثر اور امیر لوگوں کے بے بس کر دیا تھا۔ پیر علی گوہر شاہ نے ''خزانۃ المعرفت'' ملفوظات شریف پیر سائیں پگارا صبغت اللہ شاہ اول (تجردھنی) کا مقدمہ بیان کیا ہے۔

پیر علی گوہر شاہ کو ''اصغر سائیں'' اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ ،۱۵، برس کی عمر میں سجادہ نشین ہوئے۔ تمام بھائیوں چھوٹے ہوتے ہوئے بھی (یعنی تیسرے نمبر پر) آپ کی اعلیٰ لیاقت اور فضیلت کی بدولت سب نے آپ کے حق میں

فیصلہ دیا۔۴، برس بعد جب آپ ۱۹، برس کے ہوئے تو آپ بڑی آزمائش سے گذرے جس کا ذکر ہم پہلے ہی ''مخزن فیضان'' اور ''جدوجہد آزادی میں سندھ کا کردار'' دے چکے ہیں۔ آپ نے بڑی محنت اور ہمت سے یہ کام انجام دیا آن نے بنگلے کے علاوہ کئی حویلیاں بھی تعمیر کروائیں یہ کام آپ نے چند مہینوں میں انجام دیا۔ آپ لوگوں (جماعت) سے ملنے کے لیے سفر شروع کیا اندازاً ۶، مہینے یا ایک سال کا سفر رہا سفر سے واپسی پر آپ نے بنگلے سنگار اور بناوٹ میں متوجہ ہوئے۔ کتب خانے اور مساجد تعمیر کروائے۔ انگریزوں کے قبضے کی وجہ باقی ۵ برس آپ نے ۱۲۵۹ء ھ سے مریدوں (جماعت) والوں کو توجہ دی۔ آپ نے یہ مشکل دور ۳۶ سال پورے کیے۔

پیر گوہر سے متعلق بعض تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں شریعت کی پابندی بہت تھی خود درس اور واعظ میں اتباع شریعت پر زور دیتے تھے، اور تمام ہی اہلِ اللہ اتباع شریعت کی حقیقت کو سمجھتے ہوئے، خلق خدا کو اس طرف راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہٗ (م، ۱۰۳۶ھ) اتباع شریعت کی برکات کے بارے میں مولانا عبدالواحد لاہوریؒ کو تحریر فرماتے ہیں۔

> ''انسان میں جس طرح اس کا لقب رحمٰن جل سلطانہ کے عرش کا نمونہ ہے اور اس کا ظہورِ قلبی ظہورِ عرشی کا نمونہ ہے، اسی طرح انسان میں بیت اللہ کا بھی ایک نمونہ اور نشان ہے جو میانہ (درمیان) ہے اور دائیں بائیں سے بیگانہ اور حسنِ سبقت میں یگانہ ہے۔ اس دولت عظمیٰ کے اصل مالک تو انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات ہیں، اور ان بزرگوں (انبیا) کی تبعیت (اتباع) و وراثت کی وجہ سے امتیوں میں سے جس کو چاہیں اس دولت سے مشرف فرمادیں۔ انبیاؑ علیہم الصلوات والتحیات میں انبیا علیہم الصلوات والتسلیمات کی صحبت کی برکت کی وجہ سے یہ دولت بہت زیادہ تھی۔ اب صحابہ رضی اللہ علیہم کے زمانے کے بعد وہ کم ہوگئی، البتہ طویل زمانوں کے گزر جانے کے بعد اگر کسی ایک ہی کو وراثت اور اتباع کی بنیاد پر اس دولت سے مشرف کریں تو وہ بڑا غنیمت اور کبریتِ احمر ہے، ایسا شخص اصحابِ کرام علیہم الرضوان کے زمرہ میں دخل ہے اور سابقین (مقربین) میں سے ہے۔ اور اس عالی نسبت والا مرکزِ مطلوب کی دولت سے ممتاز ہے۔ اگر چہ نفس مرکز میں بھی بہت ست مراتب ہیں لیکن یہ سبقت کی دولت سے مشرف ہے۔ اس سے زیادہ اس معمے کو کیا ظاہر کرے اور ان رموز کی کیا

شرح بیان کرے۔اور جب اللہ سبحانہ کے فضل سے یہ نسبتِ عالیہ ظاہر ہوتی ہے تو سابقہ نسبتیں زوال پذیر ہو جاتی ہیں اور ان کا نام ونشان تک نہیں رہتا،خواہ وہ نسبتِ قلبی ہو یا غیر قلبی'':(۲)

اب کچھ تفصیل حضرت علی گوہر شاہ ''اصغر'' کے ماحول اُن کی دینی خدمات اور شاعری کے حوالے سے بھی بیان کی جاتی ہیں اس کے لیے ہم ضمنی عنوانات کا تعین کریں گے،اور یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ ضمنی عنوانات کے تحت بعض باتیں دہرائی بھی جاسکتی ہیں، کہ اُن کے بہ غیر ضمنی عنوانات کا پس منظر واضح نہیں ہوسکتا،لہٰذا اس عمل کو طوالت نہیں بلکہ ضرورت سمجھا جائے۔

سید علی گوہر راشدی ''اصغر''

پیر پاگارا سید علی گوہر شاہ سید محمد بقا شاہ کہ شہرہ آفاق صاحب زادے سید محمد راشدؒ کے پوتے اور پیر صبغت اللہ شاہؒ کے فرزند تھے، آپ نے کئی کارنامہ سرانجام دئے۔مثلاً:

(۱) آپ نے نئی درگاہ کی بنیاد ڈالی، اُس کی تزئین اور آزمائش پر خاص توجہ دی۔

(۲) اپنی جماعت کو ایسی تربیت دی کہ اس میں خودداری اور آزادی کا جذبہ پیدا ہوا۔

(۳) آپ نے علم وادب کی فروغ کے لیے نمایاں طور پر کوشش کی۔

پیر سید علی گوہر شاہ اصغر کی علمی ادبی خدمات

پیر علی گوہر شاہ ''اصغر'' کا کلام سندھی زبان میں ہے اور اصغر سائیں جو کلام کے نام سے جمیعت علماً سکندری نے شایع کیا ہے، نامور عالم ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اپنے مقدمے میں لکھا ہے''سید علی گوہر شاہ اصغر نے اپنے دادا پیر محمد راشد کے کتب خانے میں قابلِ قدر اضافہ کیا'' اس کی ایک مثال یہ ہے کہ آپ نے سندھ کی اولین تاریخ ''چچ نامہ'' (فتح نامہ) کا قلمی نسخ اپنے کتب خانے کے لیے بنوایا، اس قلمی نسخے کی کتابت سن ۱۲۴۸ھ میں مکمل ہوئی۔اس پر آپ کی مہر لگی ہوئی ہے اور یہ تاریخی قلمی نسخہ اب لنڈن میں برٹش میوزیم میں موجود ہے۔

خزانۃ المعرفت

یہ کتاب پیر علی گوہر کے والد سید صبغت اللہ شاہؒ کے ملفوظات کا مجموعہ ہے، یہ کتاب سن ۱۲۵۵ھ میں مکمل ہوئی، پورا قلمی نسخہ ۲۵۵ اوراق پر مشتمل ہے، کتاب کا موضوع نصیحت اور ہدایت ہے، پیر صبغت اللہ کے ملفوظات میں جا بجا قرآن کریم کی آیات ،مثنوی مولانا روم کے اشعار اور سندھ کے معروف شعراء قاضی قاضن ،شاہ کریم ،شاہ عبداللطیف بھٹائی، عبدالرحیم گروھڑی اور پیر محمد راشد کے ابیات ملتے ہیں۔

خزانۃ الاسرار

یہ قلمی نسخہ گیارہ خطوط پر مشتمل ہے جو پیر صبغت اللہ شاہؒ نے اپنے مریدوں کو لکھے ہیں، جن اصحاب کو یہ خطوط لکھے گئے ہیں ان میں مندرجہ ذیل اصحاب شامل ہیں۔

(۱) میر مرزا تالپر

(۲) میر ولی محمد تالپر

(۳) خلیفہ نبی بخش لغاری

(۴) خلیفہ بخش علی تالپر

(۵) میر بھورا تالپر

(۶) میر الہداد

(۷) میر شفیع محمد

(۸) خلیفہ میاں سلطان

(۹) خلیفہ محمد اسماعیل

(۱۰) سید میر نور علی شاہ لکھوی

(۱۱) خلیفہ میاں امید علی

پیر علی گوہر کی شاعری

پیر علی گوہر شاہ کے کلیات ''اصغر سائیں جو کلام'' پروفیسر شیخ محمد فاضل نے مرتب کیا ہے، آپ نے لکھا ہے کہ ''انسان کی تخلیقی صلاحیت کو اجاگر کرنے میں ماحول کا بڑا عمل و دخل ہوتا ہے، انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کو ہم اس کی مخفی قوتیں بھی کہہ سکتے ہیں جو اس کے خیالات کے تعمیر اور جذبات کی تہذیب میں نمایاں کردار ادا کرتی ہیں۔ ان تخلیقی صلاحیتوں میں شاعری سرِ فہرست ہے۔ چناں چہ شعر اور موسیقی کی ہم آہنگی سے سنگ دل انسانوں میں بھی نفاست اور لطافت کے جواہر پیدا ہوتے ہیں، شعر کو سحر یا جادو کہا گیا ہے، نفسیات کے ماہر کہتے ہیں کہ شاعری انسان کے دل میں رقت پیدا کرتی ہے، ساعری درس اور عشق کی تفسیر ہے، چناں چہ عشق اور عاشقی کے بغیر لفاظی شاعری انسان کے دل کی دھڑکن نہیں بن سکتی۔''

سید علی گوہر شاہ ''اصغر'' اپنے عہد اور حالات کے نمائندہ شاعر تھے، اصغر سائیں کا ماحول چوں کہ شمالی سندھ تھا اس لیے آپ نے اپنے کلام میں سندھی زبان کا وہ لہجہ استعمال کیا ہے جس کو اترادی (یعنی شمالی لہجہ) کہتے ہیں۔

پیر علی گوہر شاہ فارسی زبان پر کامل عبور رکھتے تھے، آپ کے کلام میں فارسی اشعار اور تراکیب کثرت سے ملتی ہیں، جو دیگر شعراء نے استعمال نہیں کیے، مثلاً:- مصحفی نے آتش چنار کا محاورہ یوں استعمال کیا ہے:

پیری میں کوئی جاتا ہے عشق کا سوز دل
کہنا جو ہو تو جھڑتی ہے آتش چنار سے

''آتش چنار'' کی تشبیہ اصغر سائیں کے علاوہ کسی اور سندھی شاعر نے استعمال نہیں کی، اصغر سائیں نے ''سر لیلاں - چنیسر'' میں یہ تشبیہ اس طرح استعمال کی ہے۔

''چينسر جان چنار جوش جانب جي ہر جيلو''

چنار کا درخت کشمیر میں کثرت سے ہوتا ہے۔اس کی عمر ایک ہزار برس سے بھی زیادہ ہوتی ہے، کہتے ہیں کہ جب چنار کا درخت بہت قدیم ہوتا ہے تو اس سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں، اصغر سائیں نے اپنے کلام میں ماروی کی اپنے وطن ملیر سے جدائی اور فراق کی آگ کو آتشِ چنار سے تشبیہ دی ہے۔

اصغر کی سرائیکی شاعری

سرائیکی سندھ کی ثانوی زبان ہے، اصغر سائیں کی مادری زبان سندھی تھی تاہم آپ نے سرائیکی زبان میں شعر کہا ہے، سرائیکی شعر میں ''ھیر'' بھی شامل ہے۔

اصغر سائیں نے سندھی شاعری میں فلسفیانہ اور عالمانہ زبان استعمال کی ہے لیکن سرائیکی زبان میں آپ نے عوامی لہجے کو ترجیح دی ہے، اصغر کے کلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں، اہلِ علم اصحاب کے دل میں اصغر کا کلام ہیجان پیدا کرتا ہے اور یہ ایک عظیم شاعری کی علامت ہے، آپ کے کلام کے کچھ نمونے اس طرح ہیں:

(۱) میرے حبیب کی آنکھوں کی پلکیں میرے سینے میں تیروں کی طرح چلی گئیں۔

(۲) عیش اور عشرت میرے محبوب کے بغیر میرے لیے عذاب ہے۔

(۳) برس گذر گئے ہیں کے تیرا نام لیتا ہوں اور آنسو بہتا ہوں۔

(۴) سید کی صحبت کے لیے میں نماز کو قضا کروں گا۔

(۵) میری منت مانو ایک رات بھنبور میں بسر کرو۔ (بھنبور سسی کا شہر)

(۶) پالکی میں بادشاہوں کی طرح سفر کرنے سے مجھے محبوب کی منزل کی طرف پیدل جانا پسند ہے۔

(۷) اے میرے مولا میرے محبوب سے میری ملاقات کی درخواست قبول کریں۔

(۸) باغ باغیچے اور بنگلے تیرے بغیر میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتے۔

(۹) تیری محبت میری قسمت میں لکھی تھی اس کو کون مٹا سکتا ہے؟

(۱۰) بے شمار سید کے لیے تڑپ رہے ہیں کیا حیثیت ہے؟

(۱۱) میرے ''جسم'' کو بیابان میں چھوڑ گئے ہیں لیکن میری ''سانس'' اُن کے ساتھ ہے۔

(۱۲) جو مٹی میرے محبوب کے قدموں کے نیچے ہے اُس کی خوشبو مشک ہے، بہتر ہے۔

(۱۳) سوالی کو کھلانا اور آرام قربان کرنا یہ سب کچھ صدقات میں شامل ہیں۔

(۱۴) ھابیل اور قابیلِ آدم کی اولاد تھی لیکن آدم کا نہ کوئی ابا نہ کوئی امی۔

(۱۵) محبت میں میرا من مخمور ہوا اور میری جان میرے جانب سے مل گئی۔

(۱۶) طوفانِ نوح خشک ہو گیا لیکن میری آنکھیں برستی رہتی ہیں۔

(۱۷) کسی دوسرے کے وصال سے تیرے فراق مین قرار ملتا ہے۔

(۱۸) جو آگ میری محبوب نے لگا دی ہے وہ کبھی بجھ نہیں سکتی۔

(۱۹) میں نے خواب میں محبوب دیکھا اس کی خوشبو میرے من میں بسی ہوئی ہے۔

(۲۰) میں نے خواب میں محبوب دیکھا وہی شب سب سے اچھی ہے۔

(۲۱) ہر ایک میں محبوب کو دیکھنا عاشقوں کی ادا ہے۔

(۲۲) کتابِ قرب کھولی اور مجھے سوز کا سبق دیا۔

(۲۳) میری آرزو ہے کے میں محبوب کا مشاہد کروں اور موت اس کے بعد آئے۔

(۲۴) ''اناالحق'' کا نعرہ لگا کر میں نے خود کو پکڑ لیا اور سولی پر ایک علامت بن گیا۔

(۲۵) میں محبوب کی نرگس جیسی نوری آنکھیں بھول نہیں سکتا۔

(۲۶) خود سکندر خود نوشابہ اور خود ہی وکیل بنا۔

(۲۷) اے محبوب جو تیرے لیے تڑپ رہے ہیں ان کو وصل کا واعدہ دینا۔

(۲۸) اُس کی آنکھیں بادام کی طرح خوبصورت ہیں سیاہ رنگ کے سرمہ میں مجھے اسرار نظر آئے ہیں۔

(۲۹) سب مجھے مبارک باد دیں کہ میرا محبوب میرے گھر آیا ہے۔

(۳۰) میرا محبوب شہد اور قند سے بھی شیریں تھا۔

اصغر سائیں کے کلام میں ہمیں وہی رنگ نظر آتا ہے جو سچل اور بیدل کے کلام میں جھلکتا ہے، ان عظیم شعراء کے کلام میں عاشق اور معشوق کے استعارے وغیرہ جو بھی ہوں ان کا مقصد بندکا اپنے آقا سے رجوع ہونا ہے، دوسرے الفاظ میں خدا کی ذات میں فنا ہونا انسانی زندگی کا اولین اور آخرین مقصد ہے۔ گویہ ان عظیم شعراء کا کلام قرآن کریم کے اس آیت کی تفسیر ہے کہ 'ہم خدا کی طرف سے آئے ہیں اور ہمیں خدا کی طرف جانا ہے۔

پیر سید علی گوہر شاہ راشدی اپنی زندگی میں گوشہ نشین پیر طریقت نہیں تھے، وہ اپنے والد بزرگوار کے نقشِ قدم پر چلتے تھے۔ آپ نے پوری زندگی دین اسلام کی اشاعت کے لیے دور دراز علاقوں میں سفر کیا، اور بے شمار لوگوں کو مسلمان کیا، آپ تبلیغی سفر میں اپنی جماعت کی خیر وعافیت معلوم کرنے کے لیے سورت کا سفر بھی کیا۔

''کلامِ اصغر'' کی ندرت وانفرادیت

جیسا کہ اصغر کا کلام ''اصغر سائیں جو کلام '' کے نام سے جمعیت علماء سکندریه جامعه راشدیه درگاه حضرت پیر صاحب پاگارا پیر جو گوٹھ ،سندھ، پاکستان سے ۱۹۹۹ء میں شائع ہو چکا ہے اس کا ابتدائیہ پروفیسر شیخ محمد فاضل نے لکھا ہے۔ جب کہ فاضلانہ مقدمہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے تحریر کیا ہے۔ جو اصغر اور اس کی زندگی اور اس کی شاعری کو سمجھنے کے لیے، بہت اہم ہے، اس کے علاوہ پروفیسر محمد فاضل ہی نے بہت عمدہ انداز اور الفاظ میں اس کلام کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جس سے استفادہ ہم نے اپنی بالائی سطروں میں کیا ہے لیکن ہمیں خود تشنگی کا احساس ہے کہ جب تک اصغر کی شاعری کا وہ جائزہ نہ دیکھ لیا جائے جو فاضل مصنف پروفیسر محمد فاضل نے کیا ہے، لہٰذا ہم یہاں وہ جائزہ پیش کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پیر علی گوہر شاہ اصغر کے کلام میں صنعت تلمیح کا جواب نہیں۔ بظاہر تلمیح تو ایک ایسے شعر کو کہا جاتا ہے جس میں کسی کہانی، واقع، داستان، حکایت یا کسی تاریخی واقع کی طرف اشارہ کیا گیا ہو لیکن تلمیح ایسے اشارے کو بھی کہتے ہیں جس کو پڑھنے کے بعد ذہن کسی خاص مفہوم کی تلاش میں ہو جائے مثلاً متعدد شعراء نے اپنے کلام میں ایسے اشارے اور کنائے سے کام لیا ہے جس کی تشریح اور تفہیم کے وقت ہمارا ذہن قرآنِ پاک کی آیات کی طرف جاتا ہے جس پر مشتمل ڈاکٹر صفیہ آفتاب نے اپنا گراں قدر مقالہ ''اردو شاعری میں قرآنی تلمیحات'' قلم بند کیا ہے۔ چناں چہ ہم یہاں اصغر سائیں کے کلام میں دل کش تلمیحات کے علاوہ متعدد محاسنِ سخن کا جائزہ پیش کرتے ہیں جس میں لفظیات سے بحث اور لفظیات کو نئے امکانات کے ساتھ پیش کرنا قابل ذکر پہلو ہے۔

" اصغر کي قدرت شاعراڻي ڏات سان گڏ الفاظ سازيءَ ۾ جيڪا مهارت عطا ڪئي هئي، تنهن جو مثال ملڻ شايد مشڪل آهي. سنڌي ٻوليءَ ۾ ڪيترائي مصدر پنهنجي سر تہ موجود آهن، پر سندن ٻيون صورتون اصغر سائينءَ جي زماني تائين وجود ۾ اچي نہ سگهيون هيون. اصغر انهن کي پنهنجي ڪلام ۾ استعمال ڪري ٻوليءَ جو حصو بڻائي ڇڏيو آهي. ان کان سواءِ مفرد لفظن مان مرڪب ٺاهڻ ۾ اصغر سائينءَ اهڙي ڪاريگري رکي آهي، جو اهي بالڪل فطرتي پيا لڳن. دراصل اصغر کي سنڌي لغت سان والهانہ عشق هو، انهيءَ ڪري هن ڪيترن ئي لفظن کي ساڳيءَ معنيٰ ۾ انوکا روپ ڏنا آهن . هتي اصغر جي لغوي خدمتن جا چند مثال پيش ڪجن ٿا:

سَنيءِ:

سنيڙڻ سنڌي ٻوليءَ جو عام لفظ آهي، جو تيار ٿيڻ جي معني ۾ استعمال ٿيندو آهي. اصغر سائينءَ سنيڙڻ مصدر مان " سنيءِ" اسم جوڙي، سنڌي لغت ۾ هڪ سهڻو اضافو ڪيو آهي:

" اصغر آڪي سار نہ ٿي، سات ڪئي جڏهن سنيءِ"

ڏوڙ:

ڏوڙو ڪرڻ (ٻٽو ڪرڻ) مان " ڏوڙ" سنڌي ٻوليءَ ۾ رائج آهي، پر اهو ڏوڙ رڳو ڪپڙي يا پني وغيره کي ورائي ٻيٽي ڪرڻ واري هنڌ لاءِ ڪم آڻبو آهي. اصغر سائينءَ اهو لفظ جبل يا ٽڪر جي وڪڙ لاءِ ڪم آندو آهي. سنڌي ادب ۾ اصغر سائينءَ کان اڳ، ڏوڙ جو لفظ جبلن وغيره لاءِ استعمال ٿيل نظر نٿو اچي:

" پهچي پانڌي چنج سنيها، ڪر وڃن پنهون ڪٿيون
ڏونگر جي سو هن ڏوڙ ڪوڻ"

ٿاني:

" ٿان" جو لفظ سنڌي ٻوليءَ ۾ آهي ۽ جاءِ يا ٿاڻي جي معنيٰ ۾ ڪم اچي ٿو، مثلاً "ٿان جي شوخي " (گهوڙي جو پنهنجي ڪڙهہ يا جاءِ تي شوخي ڏيکارڻ)، ٿانيڪو ٿيڻ (پنهنجي جاءِ تي پهچي قرار وٺڻ) وغيره، پر اصغر سائينءَ "ٿانيڪو ٿيڻ" بدران "ٿاني" لفظ ڪم آڻي، ڪيس هڪ ٻيءَ صورت بخشي آهي:

" اصغر عاشق" سان اڪڙيون اڙائي، ٿئين وڃي ات ٿاني"

ڪور:

ٻاهہ جي وڏي مچ کي ڪورو يا ڪوري چئبو آهي، جنهن ۾ ڪچيون سرون يا ڪچا ٿانوَ پچائبا آهن. سختيون ڪاٽي پختي ٿيڻ لاءِ بہ چئبو آهي تہ " ڪوري مان

پڇي نڪتو آهي. اصغر سائينءَ ڪوري ۽ ڪوريءَ ڪان سواءِ ٽيون لفظ بہ استعمال ڪيو آهي، جو آهي " ڪور. " اهو لفظ سنڌي لغت ۾ اضافي جو سبب بڻيو آهي:

" اصغر عاشق" ڏک جا ڏاڍا، ڪيچ وڃڻ جا تا ڪَرن ڪاڍا
خوش ٿيو ڪامن، سي عشق جي ڪُور"

تاڳڻ:

"تاڳڻ" (سبڻ) مصدر سنڌي ٻوليءَ ۾ گهڻ استعمال ٿني ٿو. البتہ اردو زبان ۾ ڏاڳي کي تاگو (تاڳو) چيو ويندو آهي. اصغر سائينءَ انهيءَ لفظ کي جيڪا صورت عطا ڪئي آهي، ساهن طرح آهي:

" تار جا زلفن جي ظالم زوري، تن منهنجي ۾ تو تاڳي
چو تو سوهين تنهين ڇڪ ڪيو"

ڇَسڻ:

"ڇَس" سنڌي ٻوليءَ جو عام لفظ آهي، جيڪو مزي يا دوستيءَ جي معنيٰ ۾ ڪم ايندو آهي. اصغر سائينءَ ان مان ڇسڻ (مزو وٺڻ) مصدر جوڙيو آهي:

" گهورن سان گهاني گهوٽ ويو، تنهن جون ڇَسان هيءَ تي ڇَسي"

ڊِيلون:

" ڊِيل" سنڌي ٻوليءَ جو آڳاٽو لفظ آهي، جنهن جي معنيٰ آهي، " ڊر" . اهو لفظ اردو زبان ۾ (ڊِيل دينا) تہ عام استعمال جو لفظ آهي، پر سنڌي زبان ۾ رڳو اصغر سائينءَ وٽ نظر اچي ٿو:

" لال، لکن ۾ پاءِ لياڪو، تو ري ڪنهن سان سَگَ نہ سياڪو
وجهہ نہ ورڻ ۾ ڊولڻ ڊِيلون"

مانگ:

ساڳيءَ "طرح مانگ" يا سينڌ سنڌي ٻوليءَ ۾ آڳاٽو لفظ آهي، جو هينئر اردو ۽ سرائيڪي ٻولين ۾ تہ عام استعمال ٿئي ٿو، پر سنڌيءَ ۾ رڳو لغت جي زينت بڻيل آهي. عورتون وعدي جي پختگي ظاهر ڪرڻ لاءِ ، سينڌ تي هٿ رکنديون آهن (يعنيٰ جيڪڏهن هيئن نہ ڪريان تہ وار ڪَتايان). اصغر سائينءَ اهو لفظ گهڻ ئي هنڌن تي ڪم آندو آهي:

" اصغر چوي عشق ۾ ڪوڙي نہ ڪنديس مانگ"

ڏاڙ:

ڏاڙو عام لفظ آهي، جنهن کي گهڻو اڳ ڏاڙ بہ چنبو هو، " ڏاڙو لڳندو ڏسي، ماڻهو " ڏاڙ ڙي، ڏاڙ ڙي" جا واڪا ڪندا هئا. اڄ بہ ڪنهن وڏي نقصان تي " ڏاڙ ڙي، چيو

وبندو آهي، اصغر سائينءَ ڏاڙ لفظ کي هيٺينءَ طرح استعمال ڪيو آهي:

" نـورِي نيائونس ننڍ ۾، ڏوہڻ سان ڪري " ڏاڙ"

" مهر ڪريو ڪيچي قريب، ڏوہڻ سان جا تِي ڏاڙ"

اوٽ:

اٿڻ مصدر مان " اٿاپ" جو لفظ هن وقت بہ اتر سنڌ ۾ رائج آهي، پر گهٽي ياڳي پوک جي سلسلي ۾ ڪم ايندو آهي، مثلاً فصل اُٿاپ ڪيو آهي (اُٿي هليو آهي يا تڪڙي واڌ ڪئي اٿس)، يا ڪڏهن ڪڏهن چنبو آهي تہ " اُٿاپ ڪريو" يعني اٿو تہ هلون. اصغر سائينءَ اٿاپ جي معني ۾، ان جي هڪ ٻيءَ صورت استعمال ڪئي آهي " اوٽ" :

" سنجهي هيس سجاڳ آءٌ، اَسُر جا ڪيائون اوٽ"

ڪامر:

ڪامڻ (سڙڻ، پچرڻ) مصدر مان ڪامر جو لفظ. اصغر سائينءَ کان اڳ گهٽو ڪري ڪنهن شاعر استعمال نہ ڪيو آهي. اصغر سائينءَ اهو لفظ هن طرح ڪم آندو آهي:

" جيرا جگر جلن ٿا جان ۾، ڪوري جي جيئن ڪامر" (سر سارنگ)

يعني منهنجي جسم جي تنُور ۾، جيرا ۽ جگر ايئن جلن ٿا پيا، جيئن ڪوري جي ڪامر يا سخت باھ ۾ پيل شيون پچي لال ٿين ٿيون.

گهار:

گهاريءَ يا وٿيءَ جو لفظ مؤنث طور ڪم ايندو آهي. ان جو مذڪر آهي گهارو (گهارا)، پر اهو مذڪر لفظ پاڻيءَ سان وڏل وٿيءَ لاءِ هڪ مخصوص معنيٰ ۾ ڪم ايندو آهي، باقي گهارِي لفظ هرهڪ قسم جي وٿيءَ لاءِ ڪم ايندو آهي. اصغر سائين گباريءَ جي هڪ ٻي صورت گهار پيدا ڪئي آهي:

" عاشق هن اصغر" سان، گهوٽ نہ وجهج گبار"

متار:

بالڪل ساڳئي نموني ۾ "متارا" لفظ جي هڪ ٻيءَ صورت "متار" اصغر سائينءَ هن ريت ڪم آندي آهي:

" ڪاڏهون پچان ڪرهن کي، مُنا هنِ متار"

لٽير:

لفظ لُٽيرو يا لٽيرا (لٽيندڙ) هن وقت رڳو اردو زبان ۾ استعمال ٿئي ٿو، پر

اصغرسائينءَ جي دؤر ۾، اهو لفظ سنڌي زبان ۾ شايد گهڻو استعمال ٿيندو هو. اصغر سائين انهيءَ لفظ جي هڪ صورت " لُٽير" طور ڪم آندي آهي:

" نمائيءَ سان ننڍ ۾ لُٽ ڪئي آھ لُٽير جا"

اُباڻ:

اُباڻڪو ۽ اباڻڪي لفظ بنيادي طور تي اُباڻو ۽ اُباڻي آهن، پر اڄڪلهه اهي لفظ ڪو، ڪي، ڪا وغيره جي اضافت سان ايتري قدر هڪ ٿي ويا آهن، جو سندن اصل ماخذ اباڻ ڏانهن، گهري نظر وجهڻ ڪان سواءِ، ڌيان ني نٿو وڃي. اصغر سائينءَ هن لفظ جي اصلي صورت استعمال ڪئي آهي:

" پسڻ لاءِ پرينءَ جي، اُپر آهيان اُباڻ"

تِڪڻ:

تِڪڻ يا ڳيت ڏيڻي چڙڻ جو استعمال سنڌي ٻوليءَ ۾ نه هئڻ جي برابر آهي، البته اتر سنڌ ۾ " ڏيڻ" مصدر ڳنڍڻ سان " تڪ" لفظ ڪم ايندو آهي ، جهڙوڪ: تڪ ڏيڻ يا تڪون ڏيڻ. اصغر سائينءَ اهو مصدر، ڏيڻ مصدر جي مدد کان سواءِ، ڪم آندو آهي:

" سورن جي ٻه سوزڪؤن، تِڪيان زهر تڙان"

هيڏتي:

سنڌي ٻوليءَ ۾ طرفن ڏانهن اشاري ڪرڻ لاءِ ٻه لفظ هيڏانهن (هي + ڏانهن) ۽ هوڏانهن (هو + ڏانهن) آهن، جن جا مخفف آهن، هيڏي ۽ هوڏي. انهيءَ قسم جا ٻيا لفظ آهن " اورتي" ۽ " پرتي" (اوري تي ۽ پري تي) . اصغر سائينءَ پهرئين ۽ پوئين قسم جي طرف نما لفظن جي امتزاج سان هڪ لفظ " هيڏتي" آندو آهي:

" هادي تن جا هيڏتي، سولا ڪر تون ساج"

نيارج:

سنڌي ٻوليءَ ۾ " نيڻ" (وٺي وڃڻ) مصدر مان بالواسطہ مصدر " نِيارڻ" جو مثال رڳو اصغرسائينءَ وٽ ملي ٿو:

" وبندي وندر ڏي سپرين، سڙي نيارج ساڻ"

هيهي:

جيهي ، تيهي ۽ ڪيهيءَ جو استعمال اڄاڻي سنڌي ٻوليءَ ۾ گهڻو آهي. (هوءَ جا پائن پير ۾، تنهن جتيءَ نه جيهي) پر هيهي (ههڙي) جو استعمال شايد تمام ٿورن شاعرن ڪيو آهي. اصغر سائينءَ چيو آهي ته:

" جيهي مون سان لائق لايڻ، هني هني ڪنهن سان نہ ٿئي هيهي"

گندائي:

گنده (ڪنو) فارسي زبان جو لفظ آهي، جنهن مان گندگي لفظ اسان وٽ ڪنهن تبديليءَ کان سواءِ جيئن جو تيئن رائج آهي، البت، گند لفظ سنڌي زبان ۾ پنهنجي جاءِ پيدا ڪري چڪو آهي، جنهن مان اصغر سائينءَ اسان کي گندگي بدران هڪ پيو لفظ " گندائي" ڏنو آهي:

" محب منهنجون ڪر معاف مدايون، گوليءَ ڪوُن ٿيون جيڪي گندايون
ڪر نہ سون جان سوڌ"

وڳوڙ:

سنڌي لغت ۾ "وڳوڙ" لفظ اسم طور تہ رائج آهي، پر فعل طور ان جو ذڪر اصغر جي ڪلام کان سواءِ ڪٿي نٿو ملي. اصغر سائينءَ " وڳوڙڻ" مصدر مان جڙيل فعل هن طرح استعمال ڪيو آهي:

" صورت تنهنجي لاءِ سڪن جي، وير نہ تن سان وڳوڙ"•

مُنهن موڙ:

مفرد لفظن مان مرڪب لفظ ٺاهڻ ۾ اصغر باڪمال صنعتگر آهي. سندس جوڙيل مرڪب اڄ بہ ڪَر ڪنيو، ٻوليءَ جي پارکن کان داد وصول پيا ڪن. دراصل سڀ مرڪب اهي ليکجن ٿا، جيڪي يا تہ ڪنهن اصطلاح مان جڙن ٿا، يا سندن مفرد " تجنيس سر حرفيءَ" جا حامل هوندا آهن. منهن موڙڻ" هڪ اصطلاح آهي، اصغر ان مان اجهو هن طرح مرڪب جوڙيو آهي:

" جنهن ڏينهن لاڪون جدا جو ٿيڙين، ڪکر ڪرن جيئن ڪئيون
رونان تنهنجي منهن موڙ ڪوُن"

ڪنڌ ڏوڏ:

" ڪنڌ ڏوڏڻ" هڪ اصطلاح آهي، جنهن جي معني آهي " هاڪار ڪرڻ". اصغرسائينءَ انهيءَ اصطلاح مان هن طرح مرڪب ٺاهيو آهي:

" هيڪر آءُ تون هن هيٺيءَ وٽ، دل دکيءَ جا درد ڪُلني ڪٽ
ڪر ڪيچي " ڪنڌ- ڏوڏ،" دل جي درد جا دافي"

ڊولائتا ڊول:

شاعر لفظن جي قيمت وڌائڻ لاءِ همہ وقت ڪوشان رهندا آهن. سنڌي زبان جو هڪ لفظ آهي ڊول، جنهن جي معنيٰ آهي طريقو يا نمونو. اصغر سائينءَ ڊول سان ڊولائتو ڳنڍيو ، سندس ملهہ وڌائي ڇڏيو آهي:

• حضرت سچل سرمست وڳوڙڻ نہ پر وڳوڙجڻ مصدر استعمال ڪيو آهي، مگر ان جي معنيٰ ٻيءَ آهي. سچل سائينءَ چيو آهي تہ :

" ويئو آهي وڳوڙجي، ڪنين کي ڪوڙي" (مالڪوس).

" ڪيم ملڻ لئہ محب توهان جي، ڊولانتا سڀ ڊول
پايم ڳل ڳاري"

قليل قدر:

" قليل قدر" هڪ مرڪب لفظ آهي، جنهن جي معني آهي ٿورو مقدار. اهو مرڪب بہ اسان کي اصغر سائينءَ جي ڪلام ۾ ملي ٿو:

" بيهہ بلوچ پنيور ۾، ڪيچي قدر قليل"

هن حقيقت جي اقرار ۾ ڪنجوسائي ڪرڻ نہ گهرجي تہ اصغر جا استعمال ڪيل گهڻا انوکا لفظ سنڌي لغت ۾ اضافي جو باعث بڻيا آهن. اصغر سنڌي زبان کي ڪيترائي پر معنيٰ ۽ مايہ دار لفظ ڏنا آهن، جن تي سنڌي ٻولي بجا طور فخر ڪري سگهي ٿي، پر افسوس تہ اڄوڪي سنڌي ادب ۾ انهن لفظن جو ورجاءُ ٿي نہ رهيو آهي، تنهنڪري فطرتي طور تي سندن استعمال ترڪ ٿيڻ لڳو آهي. اصغر سائينءَ جي وفات کان گهڻو پوءِ بہ اديبن ۽ شاعرن انهن لفظن جي استعمال سان پنهنجي ڪلام ۾ فصاحت ۽ بلاغت پئي پيدا ڪئي آهي، پر اڄڪلهہ نظم خواہ نثر ۾ اهي لفظ نظرَ نٿا اچن. هونئن تہ اهڙن لفظن جو تعداد تمام گهڻو آهي، پر هتي نقط اهي لفظ پيش ڪجن ٿا، جن کي اصغر سائينءَ جي ٻين عقيدتمند شاعرن بہ پنهنجي شعر ۾ ڪم آندو آهي:

اُليل ڪرڻ = چوٽ چڙهڻ

"مُنيءَ هن معذور کي، عشق ڪرايئہ اليل" (اصغر)

"عشق ڪيون ايئن اليلان، جيئن مجنون هئو ليلان" (اصغر)

" عشق اليلان لايون وي، سر سڙيءَ جي راتو ڏينهان" (مولانا عبدالقادر عبدي)

" عشق اليلان دم دم ڪيتيان، محبت مچ مچايا، جِي" (مولانا عبدالقادر عبدي)

اور ڪرڻ • = حال ٻڌائڻ، حال ونڊڻ

" اوران ڪنديس عجيب سان، ڳالهين جا ڪري ڳاهہ" (اصغر)

" ڪيون اوران اڳيون، مست وتان مخمور". (ابوبڪر)

" آءُ تہ ڪريون اور، موٽي منجهہ پنيور" (ابوبڪر)

" آيو آيو " اور" ڪيائين، ساڻ نيٹن وهندو دل ڪسيائين،
چاتم عشق اِجاري (ابوبڪر)

برها= ورهہ وارا، عشق وارا

" ڀهري پوشاڪان ڪوڙين ڪروڙين، برهن کي بڪائين بڪ (اصغر)

• اورڻ ۽ اور آورڻ تہ هن وقت بہ ٻوليءَ ۾ رائج آهن، پر اور ڪرڻ يا اوورن ڪرڻ گهڻو ڪري ترڪ ٿي چڪو آهي.

" باب برھ جو پڑھن بيراڳي، برھا بھوت ڏسن ھڪ ساڳي
برھ بنا برباد، عاشق سمجھن اينئن اشارو" (رکيل- بياض اعظم شاھ)

پرت ۾ پوئجڻ = محبت جي سڳي ۾ پوئجڻ، ڦٿي ٿيڻ.
" اڄ نہ ڪلھ ڪؤن روز ازل ڪؤن، پرت ۾ آھيان توسان پوئي" (اصغر)
" محرم راز نہ ڪوئي ھم، درد دڪان ۾ دلبرسائين
پرت تمھاري پوئي ھم (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

پيل = جلھ، حملو
" جيتر مون سان محب تون ملندين، پورن ڪيون مون سان پيلون" (اصغر)
" پرٿيءَ کي پنھونءَ جي، پورن ڪني آھي پيل " (اصغر)
" صبر سڪوت دور ٿيو دليئون، پورن ڪيون مون تي پيلان" (اصغر)
" جذب جوش خروش ۾، ڪيئن پتنگ سي پيلي پيا" (ابوبکر)
" گھمن ناز غماز سان، ڪيو پتن ۾ پيل (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)
" اڇن ڪرڪر پيلان، سورن جون سر سيلان
غم ڪيس غرقان ڙي، بحر برھ جو برسر آيو(مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

ٽولڻ = رولڻ ، ٽولاڪن ۾ وجھڻ.
" سرتيون سڪايل کي ويا، ٽڪرين اھي سي ٽوليون" (اصغر)
"ڏونگر ڏاڍا جبل ووڙيا، وچ ٽڪر دي مين ٽولي" (شاعر نامعلوم- بياض اعظم شاھ)

جھوئڻ= جيئن جنڊ ھلائڻ سان لاڳيتو گجگوڙ جھڙو آواز ٿئي ٿو، تيئن ڪڪرن جي گجگوڙ جو لاڳيتو آواز .
"چشمان چيٽ ڪڪر جيان، ھردم جھوئي بيئيون جھم جھام" (اصغر)
" اکيون ٺاٽيون ڪاڻ اوھان جي، راتيان ڏينھان منجھ راڙي
جھونيون بيئيون جھڙ جھوئي" (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاھ ص 194)

چَسڻ = سواد وٺڻ
" گھورن سان گھائي گھوٽ ويو، تنھن جون چسان ھيءَ ٿي چَسي" (اصغر)
" وارث پنھنجي وصل جون وھلو، چسان يار چسايو (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

چنئون چڙڻ = ھڪ چِن يا پل چڙڻ
" چنئون چڙ نہ "عاشق اصغر" کي، لوڪ آھيان توسان لوئي" (اصغر)
" اشرف، چوي ايندا ، دلاسو ڏيندا ، چنئون نہ چڙيندا ، وٺي نال نيندا " (اشرف)

چوڪراٽي= باراٽيون ڳالھيون

" قدم ڪٽين سو وجهج نہ پونتي، ڇوڪراٺي ڇوڙ" (اصغر)
" ڇوڪراٺيءَ تي ڇو پوين، ڇو راند ۾ ڇاڪي رُوين
جي نظاري نيست ڪيا، سردار سوريءَ سي سنوان" (ابوبڪر)

سيلان = ڇرون، پوڏون، سيلاب
" پؤ نہ بارش جو آهي تنهن کي، سڪ جون لنگهيون جنهن تون سيلان" (اصغر)
" راتو ڏينهان تار وهن ٿيون، سڪ جون سوزنون سيلان (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

غافر ساتر = بخشيندڙ ۽ پردو رکندڙ.
" ووءِ ووءِ واٺي آهي ولهيءَ کي، ٿيلهہ نہ ڀهڳڻ هن ٺَلهيءَ کي
غافر ساتر تنهنجو خطاب" (اصغر)
" ڪڏان ساتر، غافر ڪڏهين، ڪڏان رب قهار" (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

غرقان = غرق ٿيل، ٻڏل
" مَني جا ميري آهيان سنديس ، روئي رت جبل سي ڪنديس
غم ڪؤن گازر آهيان غرقان" (اصغر)
" اچن ڪري ڪري پيلان، سورن جون سرسيلان
غم ڪيس غرقان ڙي، بار برهہ جو برسر آيو" (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

قط . ڪَٽُ (ع قطع = وڍ، جدائي
" دلڙي ديوانيءَ جي کي سهتا سائين، ڳڻن جون وجهي ڳاريون
کر نہ قرب جو قط سائين" (اصغر)
" آيل عشق عليل ۾، شال نہ پوي قط" (مولانا عبدالقادر عبدي رحہ)

ڪار ڪمائڻ = پورهيو ڪرڻ
" ڪمائينديس در ڪيچين جي، ڪنيزڪ ٿي ڪار" (اصغر)
" ٻانهي ٿي مين ڪار ڪميسان، سڻ تون سانول پيارا" (ابوبڪر)

ڳوڌ = متارو ڍڳو
" ياري لائي يار ٿئين ياکي، سَمر وڏءِ ڪو سُرڪ ۾ ساقي
ڳاهہ ڳاهيڻ سندا ڳوڌ" (اصغر)
" پورن آهُ پائمال ڪئي هان، درد فراق بي حال ڪئي هان
ڏکن ڳاهيو جيئن ڳوڌن ڳاهہ" (عبدي رحہ)

" محبت جو مورجڻ = محبت جو نئين سر وڌڻ
" وهہ ورهہ جي ڪؤن آءُ ڪا وران ٿي، محبت اجا ٿي موري" (اصغر)

" ٻارڻ جو اوهان ٻاريو، وسمي نہ يار وساريو
عشق اوپڙ ٿو اوپاري، محبت آهي هاٿي موري" (عبدي رحہ)
"عبدالقادر" کي آريءَ جي، محبت مس موري " (عبدي رحہ)
موز = تيز و تند شراب *
" سرڪ ساقي ڏي اصغر کي، ماڻ پرياموڻ مَوز" (اصغر)
" صورت تيڏي ڪعبہ قبلا، موزان مت پيتوئي" (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاھ ص 40)
نوئي = نَئين، نَو آموز
" واڪا ڪريان ٿي وره ۾ تيلهان، نينهن ۾ آهيان آءُ نوئي" (اصغر)
" رمز حقيقت يار سيڪار، هوئيان نينهن ۾ نوئي هر" (شاعر نامعلوم)
نولي = مالڪ کان سواء، بي واهي
" اڪي نہ واقف عشق جي، اوچتي آيم اپار
مجي آزي آءُ تون، سيد سائين سردار، انهيءَ نوليءَ جي" (اصغر)
" مون کي ڇڏي هليا ، جيڪس هيڙيس نولي" (شاعرنامعلوم، بياض اعظم شاھ ص 127)
نيران = نار جو جمع، باهيون
" باھ برھ جي ٻارينہ تن ۾، مچ محبت جو مچاينہ من ۾
نرمل نينهن سندء نيران" (اصغر)
"نينهن سندوَ نيران، پاٿي پاء وصال جو" (عبـــدي رحہ)

اصغر جي شاعريءَ جو اثر:

عظيم شاعرن جو سمورو ڪلام دل ۽ دماغ جي ولوڙ ۽ نچوڙ جو نتيجو هوندو آهي.انهن جو ڪجهہ ڪلام تہ سندن حياتيءَ ۾ ئي زبان زدِ عام ٿي ويندو آهي، پر باقي ڪلام بہ ورهين بلڪ صدين بعد، ايندڙ نسلن جي سوچ ۽ جذبن کي متاثر ڪندو رهي ٿو. اصغر سائينءَ جي ڪلام .لاءِ بہ ساڳيءَ ڳالهہ چئي سگهجي ٿي. اصغر جي ڪن مصراعن کي تہ سندس همعصر شاعر تضمين طور ڪم آڻڻ کان سواءِ رهي نہ سگهيا ، يا ٿوري گهڻي مٽ سٽ سان انهيءَ نگيني کي پنهنجي شاعريءَ جي زيور ۾ جڙي ڇڏيائون، پر سندن گهڻو ڪلام هيڏي وڏي عرصي گذرڻ بعد بہ موجوده ادب کي متاثر ڪري رهيو آهي. اصغر جي شاعريءَ جو سڀ کان وڌيڪ اثر مرحوم مولانا عبدالقادر سولنگيءَ جي شاعريءَ تي نظر اچي ٿو. حالانڪ مولانا مرحوم اصغر سائينءَ جي رحلت وقت ٿن چئن سالن جو مس هو. اصغر جي ڪلام جي اثر پذيري ڏيکارڻ خاطر هتي فقط اهڙن لفظن جو ذڪر ڪجي ٿو، جي اول اصغر جي ڪلام جي زينت بڻيا ۽ پوءِ سندس پوئلڳن پنهنجي شاعريءَ ۾ ورجايا:

* شمس العلماء داؤد پوٽي پنهنجي مضمون " بارانِ رحمت " ۾ شراب جي معنيٰ ۾ " مز " لفظ ڪم آندو آهي .

ڏاريو توڙي لوڏاريو :

" ايندي‌س ايڏهين ورهنون ورنهه، وک نه پونتي واريون
ڏاريو توڙي لوڏاريو" (اصغر)

گولي ٿي گذران ڪنديس، ڏاريو توڙي لوڏاريو
ماريو توڙي جياريو (شيخ محمد)

صفت ڪيم سليمان:

" ذات ڇپائي ٿيڙس ظاهر، صفت ڪيم سليمان" (اصغر)

" برقعا بشري پايم، پنهنجي ذات ڇپايم
صفت ڪيم سليمان، ڪل يوم هو في شان (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاهه ص 78)

حُب جون هوليون:

" عاشق اصغر، ڪي آهن، حب جون هنئين ۾ هوليون" (اصغر)

" اڄي اچانڪ تنهنجي سيرين، حب مچائي هولي" (ابوبڪر)

پنڌ پولا ڪرڻ:

" نحن اقرب آهي تنهن لئه، پنڌ جنهن ڪيا پولا" (اصغر)

- مست مولا نون جي نه جاڻن، پنڌ تنهان داپولا" (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاهه ص 156)

ڇن ڇڻڻ:

" ڇنئون ڇن ڇڻڻ جا ناهن، گهورن ڪيا جي گهانئي" (اصغر)

" ڇن ڇڻڻ جو ناهي، گهور تنهنجي جو گهاءُ " (ابوبڪر)

گاريون گل پائڻ:

" گاريون گلن ڪئون اگريون، اوڳڻ پانيان ڳڻ" (اصغر)

" سُخن سيباڻا ساهه منهنجي ڪي گُل پانيان ٿي گار" (اصغر)

" گهوري جيءُ جهان جي، گل پريان گاريون "(شاعر نامعلوم ، بياض اعظم شاهه ص 106)

گوڏي هڏي گاهه ڪرڻ:

" ڪندي ڪرهن جو ڪُني، گوڏي هڏي گاهه" (اصغر)

" سيڻن ڪارڻ سرتيون، گاهه ڪنديس هڏي گوڏي" (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاهه ص 106)

گهورن جون گهليون:

" حسن هادي داسڻو سياليان، گهلي گهوران ديان گهلان" (اصغر)

" ڏِهن سندا ڏڄ تا ڏين، حُب ڪئن ايندي‌لي حَب مئون هليون.
گهائن ٿيون گهوريءَ ڪي مڪر، ير گهوٽ گهورن جون گهليون" (ابوبڪر)

اصغر جي ڪلام جو تبصرو :

مولانا عبدالقادر " عبدي" سولنگي رحه اصغر سائينءَ جي عاشقي ۾ سڀ ڪان مٿانهون مقام تو رکي. پاڻ وڏو

شاعر ٿي گذريو آهي. سندس ڪلام ۾ اصغر سائينءَ جون تضمين طور ورتل مصراعون تمام گهڻي تعداد ۾ آهن، عبدي رحه اصغر سائينءَ جي اصطلاحن کي ۾ گهڻو استعمال ڪيو آهي. انهيءَ مان اندازو لڳائي سگهجي ٿو تہ قريبي زماني تائين ۾ شاعرن اصغر جي ڪلام جو تتبع پڻ ڪيو آهي. هتي اهي مصراعون يا اصطلاح درج ڪجن ٿا، جي ٿوري ڦير گهير سان مولانا عبدالقادر رحه پنهنجي ڪلام ۾ سموهيا آهن:

" لنگهڻ آيا لوڻيءَ ڪي، لڪ لڪيون پاتون پات" (اصغر)

" لنگهڻ آيا لالڻ لئہ، لڪ لڪيون پاتون پات " (عبدي رحہ)

" ڏهگ ڏنئہ جنهن ڏينهن ڪوُن، سيڪو ڏينم ٿو ڦيٽ" (اصغر)

" ڏهگ ڏيئي ويو جنهن ڏينهن ڪوُن، دل اندر ڏمچر
آهم اوراتو" (عبدي رحہ)

" پتڪو ڪريان پرينءَ لئہ، چائي پائي ڇڄ" (اصغر)

" پتڪو ڪريان پنهل لئہ، چائي پايو ڇڄ" (عبدي رحہ)

" پيچ ڪا رات پنيور ۾، منت منٺيءَ جـي مڄ" (اصغر)

" منت منٺيءَ جي مڄ، رهـ ڪا رات پنيور ۾" (عبدي)

" ٿيو آهي سورن ڪوُن، ولـهـيءَ سر سو وبال" (اصغر)

" سورن سندو سيج ۾، ولهيءَ سـرسـو وبـال" (عبدي)

" لوٽ لـڪـن ۾ لُـوڻـيءَ جـي، ڪرم ڪجانءِ ڪوهيار
لطفئون منهنجو لوڙهہ لٽيندين" (اصغر)

" لوٽ لـڪـن ۾ لـوڻـيءَ جـي،ڪري ڪرم ڪوهيار
اڄي لطفئون لوڙهہ لٽيندو" (عبدي)

" چون سيـيئي سرتيون،ههڙي ڪانہ ڪري ڪا" (اصغر)

" سيئي چون سـرتـيـون، ڪـنـيءَ ڪي ڪـوهيارل !
ههڙي ڪانہ ڪري" (عبدي)

" آئي مون سر اوچتي، برهہ سندي پري ڪا" (اصغر)

" عـبـدالـقـادر سـر آئـي آهـي،سـونـهـن پريا سانول !
ڏاڍي برهہ پري" (عبدي)

" جيءُ نہ منهنجو جاءِ،جـتـن ڏاران جيـڏيون" (اصغر)

" جـتـن ڏاران جيـڏيـون، جـيءُ نہ آهـم جـاءِ" (عبدي)

" تولئہ نيڻ نهاريون، ڳوڙها ڳاڙن ڳاڙهارت جا" (اصغر)

" هوت ٻاروچي لاءِ، آءُ ڳوڙها ڳاڙها تـي ڳاڙيان، جيڏيون" ! (عـبـدي)

" اصغر عاشق سان ڪڏهن ٿينديون، وير وصل جون سـو ويلان" (اصـغر)

" محب مٺا سائين ڪڏهن ٿينديون، آن جي وصال جون ويلان" (عبدي)

" اصغرعاشق" نون ڏار ڏيرڻ تڙون، گهارڻ گهر وچ گهڙيان
ٿڪڻ زهر ديان ڦڪيان" (اصغر)

" لاتقنطوا" ويندس ملنديس، ڦڪيو زهر سنديون ڦڪيون
ڳلي ڳلي ڳڻ ڳايون" (عبدي)

" ديدن وڏيس ڏڳي ڙي ڏڳي ڙي، پلر دلبر دوست پنهل جي" (اصغر)

" ميڏي نال سڄڻ دل لڳي آهه وي لڳي آهه، ديدن ڏڳي آهه وي" (عبدي)

" نحن اقرب نيڙي وسي ٿو، وڇان وار نہ سند" (اصغر)

" نحن اقرب وفي انفسڪم، وڇان وار نہ سند" (عبدي)

" ساربو سانگين ڪي نہ مران نہ جيان" (اصغر)

" مارن ري منجهہ ماڙيين، نہ جيان نہ مران" (عبدي)

" ماروئڙن جا ماڳ، ساريو ويٺي ٿي ونجهلان" (اصغر)

" گولاڙا ۽ گاهہ، ساريو ويٺي ٿي ونجهلان" (عبدي)

ساڳئي قافيي ۽ رديف ۾ اصغر جا مختلف مضمون:

اصغر جي زبان سنڌي ۽ سرائيڪي ٻولين جي لغت تي ايترو تہ حاوي آهي، جو مذڪوره ٻولين ۾ شعر گوئي اصغر لاءِ ڄڻ تہ هڪ ٻاراڻي راند آهي. هو سنڌي ۽ سرائيڪي ٻولين جو دادلو ۽ اربيلو شاعر آهي. قافيا ڄڻ تہ هن لاڏڪوڏ سان پاليا آهن، جي سندس مرضي مطابق پيا قوس قزح وارا رنگ بدلائن.

عام شاعرن کي ساڳيءَ زمين ۾ شعر چوڻ ڏکيو لڳندو آهي، پر اصغر ساڳيءَ زمين ۾ ساڳين قافين کي نت نوان ۽ نرالا مضمون ڏيئي، پيو شاعريءَ جي آسمان ۾ اُڏائي. سر سهڻيءَ ۾، ٻن لاڳيتين ڪافين جو تلهہ بالڪل ساڳيو آهي:

" ميهر منهنجو مون ساڻ، چوليون مون کي چا ڪنديون"

پر مضمون جي لحاظ کان ٻيئي ڪافيون هڪٻئي کان بنهہ نياريون آهن. اهڙيءَ طرح ڪلام اصغر جي سرڪلياڻ ۾، ابتدائي ڪافيءَ جو تلهہ آهي:

"ڏنارن ڪوُن ڏار، درد پري دل منهنجي"

انهيءَ ساڳئي تلهہ سان " سُر گهاتوءَ" ۾ بہ هڪ ڪافي آهي، جنهن ۾ جذبن جو اظهار بالڪل مختلف انداز سان ڪيو ويو آهي.

سر سهڻيءَ ۾ بہ ڄاڙيون ڪافيون آهن، جن جو تلهہ ڄڻ تہ ساڳيو ۽ مضمون عليحده آهن:

" ميهر تان نہ مٽي، ڇاجي لوڪ مٽي ويو"

"ميهر تان نہ مٽي، ڇاجي لوڪ مٽيندو"

اهڙيءَ طرح رڳو هڪ لفظ جي تبديليءَ سان ، سُر ڪوهياريءَ ۾ بہ لاڳيتون ڪافيون ساڳئي ٽلهہ واريون آهن:

1- " گهوري مون گهوري، پاڻ نہ ڇاتو پرينءَ تان"

2- " گهوري مون گهوري، پاڻ نہ ڇاتو پنهل تان"

" سر وهاڳڙو" ۾ رڳو هڪ لفظ "سرور" جي اضافي سان ٻن مولودن جا ساڳيا ٽلهہ آهن، پر مضمون ٻيا ٻيا اٿن:

1- " مير محمد ڄام، آهيان تنهنجي سام، ماڙڪجو مسڪين تي"

2- " مير محمد ڄام، آهيان "سرور" تنهنجي سام، ماڙ ڪجو مسڪين تي"

سر بلاول" ۾ بہ ڪافيون بالڪل ساڳئي ٽلهہ ۽ جدا مضمونن واريون گڏوگڏ درج آهن. سندن ٽلهہ هن طرح آهي:

" سونو بازو بند، مون ڏي سڄڻ موڪليو"

اصغر جي ڪلام ۾ ٻن قافين وارين ڪافين جو هڪ جوڙو اهڙو بہ آهي، جنهن جا پهريان قافيا تہ جدارا آهن، پر پويان قافيا ساڳيا آهن:

1- " ڪل ڪانگل اچي " ڏي ڪا،" سڌ سڄڻ جي ساري"

2- " ڪل ڪانگل اچي " ڏيندو،" سڌ سڄڻ جي ساري"

اهڙيءَ طرح سرسامونديءَ ۾ بہ بہ ڪافيون مٿي بيان ڪيل نموني جون آهن :

1- " وڻجارن جو " وَري" ساٿ سلامت آيو"

2- " وڻجارن جو "وَتي" ، ساٿ سلامت آيو"

ساڳيءَ طرح سرحسيني ۽ سر لوڙائوءَ جون ساڳيءَ زمين ۾ بہ ڪافيون آهن، جن جا ٽلهہ ذري گهٽ ساڳيا آهن:

1- " مات ڪري ويا مٺيءَ ڪي ماري ويا، ڏير ڏکيءَ وٽ هتا مهمان"

2- " ڄاڙ ڪري ويا جيءَ سان جيڏيون، هوت مٺيءَ وٽ هتا مهمان"

اصغر جي ڪافين جا مثالي ٽلهہ هيٺ ڏجن ٿا، جن جي قافين، ردیفن، وزن ۽ لفظن ۾ هڪجهڙائي آهي:

1- " پنهنجي محب جي ميٺ، ڪونہ ڏسان ٿي ڪاٿهين"

2- " محبن سندي ميٺ، ڪونهي ڪاٿي ڪنهن ملڪ ۾"

1- " ليو لِئي مان پاتڻ جو، گھايم تنھن سو گھور"
2- گھايو ھن گھايل کي ، گھوٽ ڻ تنھنجي گھور"

1- " ساجن تنھنجا سور، چٽي سٽايان ڪنھن کي"
2- " ساجن تنھنجي سور، ڪٽي ساڙيو ساھ سڙيءَ جو"

1- " مھٽا ٻڌم موڙ، ڪري پھرين رات پنھل جا"
2- " پھرين رات پنھل کي، مرڪي ٻڌاسون موڙ"

1- " سڪ ري ساھيم نہ سگَ ، رولي مون کي روھين ونين چو" ؟
2- " ساھيم نہ ڪو سگَ، تو سان آھي نياز نذر جو"

1- " فراقن ڪني " ڦاڪون" ، دلبر دلڙي دردونديءَ جي"
2- " دلڙي ڦُٽي تي سا " ڦاڪون" ، لاھہ فراق تون سھٽا
آءُ ھلي من موھٽا"

اصغر آھي ھر قافيہ لفظن جو بادشاھہ. ڪنھن قافيي کان متاثر ٿيو تہ ان زمين ۾ ھڪدم نئين ڪافي جڙي ويندي، مثلاً، " سُر ھير" جي ھڪ ڪافي آھي:

" جھوڪ رانجھن دي ضرور، ويسان ويسان مول نہ رھسان"

ان ڪافيءَ جي ھڪ مصرع آھي:

"ڪر ڪيڙي نال مول نہ نھسان، " ماھي ڪتينان مخمور"

اصغر کي " ماھي ڪيتينان مخمور" جا لفظ جو وڻي ويا تہ ان تي نئين ڪافي جڙي وئي:

" ماھي ڪتينان مخمور، نِي، ميريان سنيان"

ساڳيءَ طرح ٻيءَ ھڪ ڪافيءَ ۾ اصغرسائينءَ چيو آھي تہ:

" وسرين ويل نہ ڪنھن ۾، جيءَ سان جڙينھ جڙ جنھن ۾
ڪيچي ڪيئہ مون سان ڪارون "

" ڪيچي ڪيئہ مون سان ڪارون" جھڙا ترنم ڀريا لفظ، جو اصغرسائينءَ جي زبان تي چڙھيا ۽ دل کي پاڻہ پيا، تہ بي ساختہ سندن زبان مبارڪ تي ٻيءَ ڪافي اچي وئي:

" ڪيچي ڪيئہ مون سان ڪارون، اکڙيون روئن تنھن لئہ رت سائين"

اهي ڳالهيون ڏيکارين ٿيون تہ اصغر اقليمِ سخن جو سلطان آهي. هن سنڌي ڪافيءَ ۾ ڪي نيون راهون بہ تلاش ڪيون آهن. ڪن ٻن ڪردارن جي گفتگو سنڌي بيت ۽ غزل ۾ تہ رائج هئي، پر اصغر اهڙيءَ گفتگو کي ڪافيءَ ۾ بہ رائج ڪيو آهي. اصغر جي هڪ ڪافي آهي، جنهن ۾ اهڙي گفتگو سسئي، هن جي جيڏين ۽ سندس ماءُ جي وچ ۾ ٿي آهي. سسئي جي مُنهان نڪري ٿو تہ:

" جيءُ نہ منهنجو جاءِ، جتن ڏاران جيڏيون"

ان بعد سوال جواب آهن:

1- ٿي سياڻي سسئي، لقب اسان ڪي نہ لاءِ

2- مادر ڏيم مَ مهڻا، تنيءَ هِن ڪي نہ تاءِ

3- هوت چڏي ويہ هيڪلي، وڃين ڪهڙي ساءِ

4- پنيءَ وڃان حق پانهنجي، چوريون اوهان جو چاهہ

5- جوءِ نہ پانيہ جتن ڙي، مِٽي مُنهن ۾ پاءِ

6- آهيان پانهي پروچ جي، حجت نہ ٻي آهہ

7- نار نڪري ڪا هيڪلي ، پيءُ جي لڄ نہ لڄاءِ

8- ڏيءُ نہ آهيان ڏوہڻ جي، سامڻ جو آءٌ وياءِ

اصغرسائينءَ ۽ سنڌي صرف و نحو:

ضميرمتصل جي عجيب صورت :

ضميرمتصل جو استعمال سنڌي زبان ۾ گهٽبو پيو وڃي. ضمير متصل جوڙڻ لاءِ، ضمير خالص (متڪلم، حاضر ۽ غائب) جون ڪي علامتون اسم، فعل ۽ حرف جي آخرَ ۾ ملائبيون آهن، جن کي ضميري پڇاڙيون بہ سڏبو آهي. ضمير غائب واحد جي نشاني " س" آهي، جا اسم جي حالت ۾ رشتيداري ظاهر ڪندڙ لفظن سان لڳندي آهي، جهڙوڪ: پڻس، پٽس، مائس وغيره. اصغر سائينءَ کان اڳ اها ضميري پڇاڙي ٻي جان اسمن سان رڳو هڪ هنڌ ڪم آيل آهي :

" چوڏهين ماهہ چنڊ جيان، پڙ ۾ " پاڳڙياس"

سنڌي ادب جي هڪ پوري دؤر گذرڻ کان پوءِ، اصغر ني پهريون شاعر آهي، جنهن اها علامت، " س" ٻي جان اسم سان لڳائي، انهيءَ مثال کي ورجايو آهي. ڏني جو جمع " ڏيا" آهي. اصغر سائينءَ " ڏيا" لفظ سان " س" ضمير متصل ملائي، " ڏياس" لفظ جوڙيو آهي، جا سنڌي گرامر کي نئين سر جيارڻ واري ڳالهہ آهي . اصغر چوي ٿو تہ :

" لکن تي لالڻ جا، ڏسان آءٌ ڏياس"

ضمير متصل متڪلم واحد اضافي:

سنڌي زبان ۾ گرامر جي اڳوڻن توڙي هاڻوڪن ڪتابن ۾، " ضمير متصل متڪلم واحد اضافيءَ" جي اهڙي ڪابہ صورت بيان ٿيل نہ آهي، جنهن ۾ اسم سان واسطو رکندڙ اضافي " م" فعل سان متصل هجي. اصغر سائينءَ جي ڪلام ۾ اها صورت نمايان طور تي هن ريت آيل آهي:

1- " ڏيو جي ڏک ڏکيءَ کي جانب شال جيوم " (منهنجا جانب شال جيو)
2- " مون ويچاريءَ ڪڙن ويسلي، سانول سنجهہ ويوم" (منهنجو سانول سنجهي ويو)
3- " پانڌي پار پنهونءَ جي، ڪٿي خط نيوم" (منهنجو خط ڪٿي نيو)
4- " ريهي روح نيوم، رمزن رانول جي اديون" (منهنجو روح ريهي نيو)
5- " جيڏيون جت ويوم، پرهہ ڦٽي پريات جو" (منهنجو جت ويو)
6- " مقصد منهن ڏسڻ سان، سهڻا سڀ سڌوم " (منهنجو سڀ مقصد سڌ ٿيو)
7- " جيئڙو جاڙ وڌوم، سيد سڪ اوهان جي" (منهنجو جيئڙو جاڙ ۾ وڌو)

منفصل مفعول جو استعمال

شاعر ڪلام کي سونهن سوڀيا بخشڻ لاءِ، شعر ۾ جاتي ٻجهي کي پيچيدگيون پيدا ڪندا آهن. اهڙين پيچيدگين ۾ منفصل مفعول جو استعمال سرِ فهرست آهي. اصغر جي هيٺ ڄاڻايل شعر ۾ " چار" لفظ منفصل مفعول آهي، جنهن کي فاصلي تي رکڻ لاءِ هيٺينءَ مصرع ۾جملہ معترضہ (جيتر مٺيءَ کي پاڻ ملائين) کي وچ ۾رکيو ويو آهي:

" سدا وسايان سِر تي سائين، جيتر مٺيءَ کي پاڻ ملائين
چوري آهِ لٹہ تنهنجي چار"

ساڳيءَ طرح هيٺ ڄاڻايل شعر ۾ " تنهنجي سڪ" فاعل کي وچ ۾ آڻي، " ڳڻن جي ڳاني" مفعول کي منفصل ڪيو ويو آهي:

" وڏي وَرنهہ مون نماڻيءَ جي، سهڻا تنهنجي سو سڪ ، ڳلِ ڳڻن جي ڳاني"

ٻئي هنڌ اصغرسائينءَ منفصل مفعول هن ريت ڪم آندو آهي:

"ڏاج ڏنائون ڏڪڙا ، پڙ نہ پيم سڪڙا
سورن جا ڍڪي ڍاڪون"

اصل ۾ شاعر چوڻ گهري ٿو تہ " مون کي ڏاج ۾ ڏڪڙا ۽ سورن جا ڍاڪون ڍڪي ڏنائون" ، پر ڪلام ۾ زور پيدا ڪرڻ لاءِ هڪ مفعول ڏڪڙا پهريان پيش ڪري، ان جو عطفي مفعول " سورن جا ڍڪي ڍاڪون" فاصلي تي رکيو ويو آهي، ۽ ڪلام جي حسن وڌائڻ لاءِ، درميان ۾ " پڙ نہ پيم سڪڙا" جملہ معترضہ استعمال ڪيو ويو آهي.

ٻئي هنڌ اصغرسائينءَ چيو آهي تہ:

"ري جنگ جهيڙي ملڪ مڙيئي، چمن جا وجهي چڪ
ڏاڍا! ڪيئہ پنهنجا ڏاني"

هن شعر ۾ جيتوڻيڪ مفعول "مُلڪ" آهي، پر "ڏاني" لفظ ۾ بہ مفعوليت سمايل آهي، جن جي وچ ۾، "چمن جا وجهي چڪ" جملہ معترضہ ڪم آئي، ٻنهي مفعولن ۾ فاصلو پيدا ڪيو ويو آهي. ياد رهي تہ چمن جو لفظ جيتوڻيڪ بلوچي زبان جو لفظ آهي، پر سنڌيءَ ۾ بہ ڪم ايندو آهي.

اصغر سائين منفصل مفعول ڪان مفعول جي صفت متعلقہ کي بہ فاصلي تي رکڻ جو تجربو ڪيو آهي، مثلاً:

" منڙيون ڳالهيون ڪين وسرن، پانهون ڳل ڏيئي
تو جي مون سان ڪيون" •

" تو جي مون سان ڪيون" ڳالهين جي صفت متعلقہ آهي، جنهن کي " پانهون ڳل ڏيئي" جي لفظن مفعول ڪان منفصل ڪري ڇڏيو آهي.

تابع مصرع جو استعمال:

اصغر سائينءَ سنڌي ڪافيءَ جي سلسلي ۾ ڪي نوان گس ۽ پيچرا بہ جوڙيا آهن، مثلاً تابع شعر يا "تابع مصرع" جو رواج سنڌي ڪافيءَ ۾ بالڪل نہ هئڻ جي برابر آهي، ۽ ڪافيءَ جي هر مصرع پنهنجي پيرن تي بيهي ٿي، پر اصغر سائينءَ جي ڪلام ۾ اسان کي تابع مصرع جا مثال بہ ملن ٿا. دراصل ٻن مصراعن مان جيڪڏهن هڪڙي مصرع صرف ونحو جي لحاظ ڪان مڪمل آهي ۽ ٻيءَ مصرع کي اصل يا ڪامل مصرع ڪان اوڌاري طور (عاريةً) ڪجهہ وٺڻو آهي تہ اهڙيءَ مصرع کي تابع مصرع چئبو. اصغر جي هڪ ڪافيءَ جي ڪامل مصرع آهي:

" پيرين پانڌين جي پوان، چامن جا چاٽيون"

يعني مان پانڌين کي چامن جا قاصد سمجهي، سندن پيرين ٿي پوان، هن مصرع جي پوئتان ايندڙ مصرع هن طرح آهي:

" ڪيانتل جي سو خبرن لئہ، ڏني ٿو جو آئيون"

هيءَ مصرع "تابع مصرع" آهي، ڇو تہ "ڪيانتل جي"لفظ ڪان پوءِ، "پيرين پوان" جا مخفي لفظ اصل يا ڪامل مصرع ڪان اوڌاري طور ورتل آهن، ۽ شاعر جي مراد آهي تہ ڪيانتل جي پيرين انهن خبرن جي ڪري ٿي پوان ٿي، جيڪي هو چامن وٽان کڻي ٿو اچي. ٻئي هنڌ آهي تہ:

" طاقت پنڌ جي هئي نہ هيٺيءَ کي، هيترو حب هلائي"

هيءَ اصل مصرع آهي، جنهن جي تابع مصرع آهي:

• سرلان عبدالقادر اصغرسائينءَ کان متاثر ٿي چيو آهي تہ:
" عبدالقادر سير آئي آهي، سوڍهن پريان سانول، ڏاڍي برهہ پري "

" وِک جي وسعت هڏ نہ هئي کا، چاهہ ڏاڍي سو چلائي"

مٿين مصرع تابع مصرع آهي، جنهن " هيٺيءَ کي" جا لفظ پهرين مصرع کان مستعار ورتا آهن.

اصغرسائينءَ جي هڪ ڪافيءَ جي اصل مصرع آهي:

" آرِي ناهہ آرام ڪو، جدا ٿئين تون جانڪون"

ان سان لاڳيتي مصرع، اصل مصرع جو سهارو وٺي، اهڙو تاثر قائم ٿي ڪري، جو ڄڻ ٻيءَ مصرع پهرينءَ مصرع جو لازمي حصو آهي. اها تابع مصرع هن طرح آهي:

" سُورِ سَجهايو سَنجرڻ ۾، تتيءَ کي تانڪون"

اصغر سائينءَ وٽ ٻيءَ هڪ اصل يا ڪامل مصرع آهي:

" ڏِسي تنهين عجيب آريءَ کي، نيڻ نمائيءَ جا بيحد ٺرندا"

ان جي تابع مصرع آهي:

" رڪ رقيب روازي ريذالا گڏ گوليءَ سان پسيو گرندا"

هتي تابع مصرع اصل مصرع کان " تنهين عجيب آريءَ کي " جا لفظ اوڌارا ورتا آهن.

اصغر سائينءَ هڪ ڪافيءَ ۾ رقيبن کي رَڪ ڪوٺي، اصل مصرع ۾ سندن حسد جو ذڪر ڪيو آهي، تہ تابع مصرع ۾ وري سندن ساڙ ۾ سڙڻ جي نشاندهي ڪئي آهي. اصل مصرع هن طرح آهي:

" جم جانب سان ڏسي ڏکيءَ کي، رَڪ رقيب ڪن راڙون"

تابع مصرع ۾ رقيبن جون ڳجهو تصور ذهن ۾ رکي اصغر سائينءَ چيو آهي تہ:

" اصغر عاشق سان محب مليا اچي، سڙيا وڃن انهيءَ ساڙون"

هڪ ڳالهہ جي وضاحت ضروري آهي تہ ڪافيءَ جي ٿلهہ سان هر ڪنهن مصرع کي تابع ٿيڻ جو حق حاصل آهي. اهو ضروري نہ آهي تہ ڪافيءَ جي ٿلهہ سان تابع مصرع لاڳيتي هجي. اصغرسائينءَ جي هڪ ڪافيءَ جو ٿلهہ آهي:

" اکيون اتي وڃين اٽڪيون، جاءِ وڃڻ جائي ناهي"

هن ڪافيءَ جي انهيءَ ٿلهہ سان غير مسلسل تابع مصرع آهي:

" روز روحن جي ڪڙن هن هيٺيءَ جون، هٽڪيي ڪنهن جي نہ هٽڪيون
لوڪنون ڇڏيانون لاهي"

هتي ٿلهہ مان " اکين" جو مخفي تصور اوڌاري طور ورتو ويو آهي.

پنهنجي ٻر ۾ اصغر سائينءَ سنڌي ٻوليءَ کي گهڻو ڪجهہ ڏنو آهي. سندس ڪلام جي مطالعي مان ٻوليءَ جي قاعدن قانونن بابت گهڻي ڄاڻ ملي سگهي ٿي، پر اهو ڪم ڪو

مضبوط دل جو مالڪ ٿي ڪري سگهي ٿو، رقتِ قلب جا حامل ته اصغر جي درد ڀريـن ڳالهين ۾ ايڏو مستغرق ٿي وڃن ٿا، جو قاعدن قانونن سهيڙڻ واري ڳالهه ڪانئن وسري وڃي، ۽ سائن اها حالت ٿئي ٿي، جيڪا شيخ سعدي رحه بيان ڪئي آهي :

" بوءِ گل چنان مست کرد کہ دامن از دست رفت"

اصغر ڪنهن ٻئي شاعر ڪان متاثر نہ آهي:

شاعريءَ جي سلسلي ۾ اصغر سائين سنڌ جي ڪنهن وڏي شاعر ڪان به متاثر نظر نٿو اچي. جيڪڏهن ڪنهن شاعر جا لفظ ۽ خيال پنهنجي شعر ۾ ڪم آندا اٿس ته محض انهن لفظن ۽ خيالن ۾ اضافي ڪرڻ ۽ منجهن رنگ ۽ خوشبوءِ ڀرڻ لاءِ ايئن ڪيو اٿس. پنجاب جي بزرگ شاعر " شاهه حسين" جي ڪلام پران، اصغر سائينءَ هڪ ڪافي چني آهي. پڙهندڙ پاڻ اندازو لڳائي سگهندا ته اصغر سائينءَ شاهه حسين جي خيالن ۾ ڪيڏي نه سونهن ڀري آهي. شاهه حسين جي اها ڪافي سنڌ ۾ عام مقبول آهي ۽ گنج (شاهه جو رسالو) ۾ سر ڏنا سريءَ ۾ آيل آهي:

ٿلهه: آپ سڏاوين فقير، تينون لڄ نهيں آندي
1- ساري رات غفلت گذري، ڏينهان سڏاوين پير
2- لوڪان ليکي ان نهين ڪاوندي، چوري پيوين ڪير
3- آپنا بار وي چا نه سگهسين، ڏيين پيان نون ڏير
4- "شاهه حسين" فقير الله دا، نت نت، رووي نير.

اصغر سائينءَ جي چيل ڪافي هن طرح آهي:

ٿلهه: دل ۾ دنيا جي دوستي، ظاهر چوين تارڪ آءُ پير
1- توڪل نه ٿيِ تر جيتري، طامع نه ٻيو سندو صدق سير
2- ڪاڄ نه ڪائين خلق ۾، پاسي پنين تون ڪوتا ڪير
3- نيهن ري ناحق ڇاڪي، نت نت واهين نيڻون تون نير
4- سڏ نه توڪي سور جي، سامين سندو ڪن ڏي نه چير
5- عارف چوائين عام ۾، بڪڙا بڪي ڇانئين بشير
6- ڏوتا ڏتارين ڊروهه ڪيون، ڊروها ڊڄي ڪر ڪو تون ڏير
7- جيڪي ڏسين محبوب ري، هڻ ترڪ جو تون تنهن کي تير
8- محبت سندي ميدان جو، مهمير اڪبر ٿئين تون مير
9- موڳا مُثل آن مجاز جو، چوين، برهه جو آهيان آءُ بير
10- " اصغر عاشق" معشوق ري، واقف نه هوندا وار وير.

سچل سرمست رحہ جي هڪ ڪافيءَ جو ٿلهہ آهي:

" رهبر روز بروز اچڻ مون ڏي يار جا"

سچل سائينءَ جو چوڻ آهي تہ يار ڏانهن رهبري ڪندڙ قلبي وارداتون مون تي مسلسل روزانو وارد ٿين ٿيون ۽ اينءَ درجات ۾ اضافو ٿيندو رهي ٿو. انهن لفظن ۽ خيالن ۾ اضافي رنگ ڀرڻ لاءِ، اصغر سائين چوي ٿو تہ:

" رهبر راتو رات، اچڻ مون ڏي عشق جا ٿا ڙي"

سچل سائينءَ جي خيال موجب، يار ڏانهن رهبري عشق ڪري ٿو، پر اصغرسائينءَ جي خيال مطابق عشق جي موجودگيءَ ۾ عاشق ۽ معشوق جو وجود بہ غير معلوم بلڪ معدوم ٿي وڃي ٿو، تنهنڪري اصل اهميت عشق جي آهي، ۽ عشق جا رهبر روز بروز اچڻ بدران هڪ ئي وقت، سو بہ " راتو رات" وٽس پهچي ٿا وڃن، ۽ تجليات نوريءَ جي اثر هيٺ سڀ مدارج هڪ ئي وقت طئي ٿيو وڃن . بهرحال اصغر جي شاعريءَ جو گهرڙهو مطالعو ظاهر ڪري ٿو تہ سندس سخن گوئي غيبي وارداتن ۽ الهامي اثرن کان سواءِ ٻئي ڪنهن جي مرهونِ منت نہ آهي.

اصغرجي اختصار پسندي:

اصغر مختصرگو شاعر آهي. هن لاءِ رڳو هڪ سٽ ئي ڪافي آهي، جنهن ۾ هو هڪ انتهائي جامع مضمون پوري وضاحت سان ادا ڪري سگهي ٿو. اهوئي سبب آهي، جو هن ڇاپي هيٺ آيل اصغرسائينءَ جي ڇهہ سو ايڪيتيهہ ڪافين مان پنج سؤ ٻاويهہ ڪافيون اهڙيون آهن، جن جي هر مصرع رڳو هڪ سٽ واري آهي. اصغر سائينءَ کان سواءِ ڪنهن بہ ڪافي گوشاعر هڪ سٽ تي مشتمل مصرع واريون ڪافيون، ايڏي وڏي تعداد ۾ نہ چيون آهن. مختصرگوئيءَ ۾ اصغر کي ڪمال حاصل آهي. هو چند لفظن ۾ معنيٰ جا سمنڊ سمائي ٿو ڇڏي. اينءَ چوڻ ۾ ڪو وڌاءُ نہ ٿيندو تہ سندي ڪافيءَ جي واديءَ واري " طور" تي " بہ حرفے مي توان گفتن تمنائے جهانے را "* جي دعويٰ اصغر ئي ڪري سگهي ٿو. هتي اصغر جي تخفيف پسنديءَ جا هڪ ٻہ مثال پيش ڪجن ٿا:اصغر چوي ٿو تہ محبوب جي صفت لکڻ لاءِ، هيءَ ڌرتي ۽ سڀ آسمان ڪاغذ ٿي پون، سموري نباتات جا قلم ٺاهجن ۽ سمورو پاڻي مس ٿئي تہ بہ اها پوري نہ ٿيندي (قرآنيءَ آيات جو ترجمو). اهو سمورو بيان اصغرسائينءَ هڪ سٽ ۾ سميٽيو آهي:

" اُب پُون ڪاغذ، قلم وڻ، جر مس، صفت تہ ٻي نہ ٿئي پوري"

اڪثر وڏن شاعرن جي خيالات ۾ يڪسانيت نظر ايندي آهي، پوءِ ڀل سندن ٻوليون مختلف هجن. ميرزا اسدالله " غالب" جو هڪ شعر آهي :

---

* " بہ حرفے مي توان گفتن تمنائے جهانے را

من از ذوق حضوري طول دادم داستانے را " (علامہ اقبال رحہ)

" قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھون
مین جانتا هون جو وه لکهین گے جواب مین "

غالب مرحوم نهايت سهڻو خيال پيش ڪيو آهي، پر ان ۾ اجا تخفيف جي گنجائش آهي اردو زبان جو هڪ ٻيو شعر آهي :

يان لب پہ لاکھ لاکھ سخن اضطراب مين
وان ايک خامشي تيري سب کے جواب مين

انهيءَ ساڳئي خيال کي اصغر سائينءَ رڳو هڪ سٽ ۾ ادا ڪري ڇڏيو آهي:

" هرگز هو لکندو نہ ورندو، لک لکان ڪاغذ"

يعني آءُ لک خط ڪٽي لکان، پر محبوب " ورندو" يا جواب هرگز نہ لکندو.

اصغر وٽ ذو- معنيٰ لفظن جو استعمال:

اعليٰ پايي جي شاعري صنايع بدايع جي محتاج تہ نہ هوندي آهي ،پر ان ۾ لفظي خواهہ معنوي صنعتن ۽ تجنيسن جي موجودگي ڪنهن نہ ڪنهن حد تائين ضرور محسوس ٿيندي آهي. ڏنو وڃي تہ شاعري جو زيب ۽ زينت آهي ئي انهيءَ ۾ تہ هر سٽ بلڪ هر لفظ ڪنهن ڪاريگريءَ ۽ صنعتگريءَ کان خالي نہ هجي. لغات تي عبور رکندڙ شاعرن جي شعر ۾، ٻي صناعيءَ کان وڌيڪ ذو- معنيٰ لفظن جو استعمال جڳهو هوندو آهي. اصغر انهيءَ فن ۾ طاق آهي. ذو- معنيٰ لفظن جي استعمال ۾ ، اصغر جو نہ مٽ آهي نہ ثاني . عام ماڻهن جي خيال ۾ ، جن لفظن جي ٻيءَ معنيٰ ممڪن ئي نہ آهي، تن کي اصغر سائينءَ جڏهن نئين معنيٰ ٿو عطا ڪري، تڏهن سندس معجز بيانيءَ تي عقل دنگ رهجيو وڃي. هتي مثال طور "هيڪاريون" جو لفظ پيش ڪجي ٿو، اصغرسائينءَ ان کي هيئين طرح بيان ڪيو آهي.:

" گهرجي نہ هيئن هيڪاريون ، ڏينہ ڏک ڏکين کي"

ايئن سمجهڻ قطعي مشڪل آهي تہ " هيڪاريون" لفظ بہ ڪو ذو- معنيٰ ٿي سگهي ٿو، پر اصغر سائين جڏهن چوي ٿو تہ :

" راتيان روائڻ، ڏينهان ڏکائڻ، هوت نہ ڪر " هي ڪاريون"
دلبر تن دکين کي"

ڪاريون ڪرڻ جي معنيٰ آهي ظلم ۽ زيادتيون ڪرڻ ۽ ان جي اڳيان " هي" (هِي جو اتراڏي تلفظ) ضميري صفت وجهي، " هيڪاريون" جو هم آواز لفظ پيدا ڪيو ويو آهي. اصغر ٻئي هنڌ چوي ٿو تہ:

" وندر وڻڪار ۽ هاڙهي حَب ۾، گهوري تنهنجي سا گهوري"

هن مصرع ۾ بہ ٻيرا گهوري لفظ ڪم آيو آهي. پهرين لفظ گهوريءَ جي معنيٰ آهي ڳولهائو يا تلاش ڪندڙ ۽ ٻئي لفظ گهوريءَ جي معنيٰ آهي قربان يا صدقي.

اصغر سائينءَ جي ٻيءَ هڪ ڪافيءَ جي مصرع آهي:

" ڏني آهي ڏکيءَ جي، سڄڻ ساهه کي ساهه"

هتي پوئين ساهه جي معنيٰ آهي ڇڪ يا ساهڻ. جيئن مڇيءَ کي ڪُنڍيءَ ۾ ڦاسڻ کان پوءِ ڇڪ ايندي آهي. تيئن سڄڻ به ڏکيءَ جي ساهه کي ڦاسائي، ڇڪيون ڏيئي عذاب ٿو ڏئي.

سواري ذو- معنيٰ لفظ آهي، پر ان جي ٻيءَ معنيٰ آسانيءَ سان سمجهه ۾ نٿي اچي. سواريءَ جي هڪ معنيٰ ته ڌسواري آهي ۽ ٻيءَ معنيٰ آهي سوير پرو. اصغر سائينءَ اهي ٻئي لفظ هن طرح ڪم آندا آهن:

" ننڊ نه ڇڏيو نيڻن کي، ڪيائون تياري سواري" (سواري = سوير پرو)

" اصلئون عاشقن تي، سورن ڪيڙي سواري" (سواري = ڌسواري)

ساڳيءَ طرح سرير به ذو- معنيٰ لفظ آهي، جنهن جي هڪ معنيٰ ته آهي جسم ۽ ٻيءَ معنيٰ آهي " تخت". اصغر سائينءَ چيو آهي ته :

" سورن منجهه سرير، سڙيو آهي ساهه سڙيءَ جو"

مالڪ ٿيڙيس سڪ ڪڻ، سنڌي سڪ سرير"

ٻيءَ سٽ جي معنيٰ آهي، آءٌ شوق کان سڪ يا عشق جي تخت جي مالڪ ٿيس.

ذات لفظ ذو- معنيٰ آهي، جنهن جون معنائون آهن پنهنجي ذات ۽ محبوب حقيقي جي ذات. اصغر سائينءَ اهي لفظ هن طرح ڪم آندا آهن:

" ذات ڇڏي ٿيا ذات، جوڳ جوڳين جو جدا آهي جڳ ڪڻ"

هڪ سرائيڪي ڪافيءَ ۾ اصغر سائين چوي ٿو ته:

" وچ آوڻ دي طرف اساڏي، گهوٽ نه گهتين گهاري گهارِي"

" مين، ڪَني ماهي سڻ ڙي سنيان، گهڙي هڪ نه گهاري گهارِي"

هتي پهرينءَ مصرع ۾ گهاري لفظ وٺيءَ جي معنيٰ ۾ ڪم آيل آهي، ۽ ٻيءَ مصرع ۾ گهارِي، گذاريءَ جي معنيٰ ۾ ڪم آيل آهي.

اصغر سائينءَ جي هڪ ٻيءَ سرائيڪي ڪافيءَ جي ٿلهه ۾ " ڪون" جو لفظ انتهائي حيرت انگيز طور معنيٰ خيز آهي:

" ايوين ڪون سٽي دو ڪون، بنا برهه ماهي دي سنيان"

يعني محبوب جي عشق کان سواءِ، ڪير ٿو ٻئي ڪون" (جهان) ڦتا ڪري؟

اصغر سائينءَ جي هڪ سرائيڪي ڪافي جو ٿلهه آهي:

" چُور ڪيتا مينون چاڪي، چاڪي چشمان جو چوري چوري"

يعني چاڪ (عبد) سڏائيندڙ رانجهي دزديده نظرون ڪٽي (چاڪي) مون کي چُور چُور

ڪري ڇڏيو آهي. هتي پهرين " چاڪي" جي معنيٰ آهي" چاڪ آهي" ۽ ٻئي " چاڪي" جي معنيٰ آهي " ڪٽي ڪري". اصغر سائينءَ جو ڪلام صنايع بدايع جي هيرن جي هڪ کاڻ آهي، ضرورت رڳو محڪ جيان رَند هٿي پرکيندڙ صاحب جي آهي.

اصغر جي شاعريءَ ۾ انفراديت:

شاعريءَ ۾ جيڪڏهن ڪا نئين ڳالهه، ڪو نئون خيال يا خيالن جي ادائيگيءَ ۾ ڪا انفراديت ۽ ندرت نه آهي ته اها ڪنهن جي دل ۽ دماغ کي متاثر ڪري نه سگهندي. ٻين جا سوچيل ۽ اچاريل لفظ نه شعر کي زينت بخشي سگهن ٿا ۽ نه وري روح جي گهراين تائين سندن رسائي ٿي سگهي ٿي. اهوئي سبب آهي، جو شاعريءَ جي معيار مقرر ڪرڻ لاءِ، جدت پسنديءَ کي خاص طور تي نظر ۾ رکيو ويندو آهي. جدت شاعريءَ جو جوهر آهي. شاعريءَ ۾ خيال ۽ لفظ نفيس ۽ نازڪ نه آهن، ته اها تڪ بنديءَ کان سواءِ ٻيو ڪجهه به نه آهي. اصغر انفراديت پسند شاعر آهي، تنهنڪري سندس ڪلام ۾ پراڻا يا پرايا خيال آهن ئي ڪين. هن وٽ هر شيءِ نئين ۽ پنهنجي آهي. جيڪڏهن اڳ استعمال ٿيل ڪنهن خيال کي پنهنجي ڪلام ۾ جاءِ ڏني اٿس، ته ان ۾ ڪنهن گنجائش جي پورائي لاءِ ائين ڪيو اٿس. اهڙيءَ طرح خيالن جي تڪميل ادب ۾ اضافي جو باعث بڻي آهي. هتي انهيءَ سلسلي جا ڪجهه مثال پيش ڪجن ٿا:

برسات جي آمد لاءِ تازو تنوارِيندو آهي. اها ڳالهه سنڌي زبان جي گهڻن ئي شاعرن ۽ اديبن ورجائي آهي، پر ايئن ڪنهن به نه ٻڌايو آهي ته تازو ڇو ٿو تنواري؟ سندس تنوار پاڻيءَ ٻوند لاءِ آهي يا موسم جي موج ۽ مستي ڪيس ٻود ۾ آڻي ڇڏيو آهي؟ ان کان سواءِ عام طرح ايئن سمجهيو ويندو آهي ته تازو رڳو هڪ ئي سُر ۾ ٿو تنواري، يعني سندس آلاپ جون لهرون مختلف سرن ۾ دائرا نٿيون ٺاهن، پر اصغر تي اهي سڀ راز افشا ٿي چڪا آهن. هُن انهن سيني ڳالهين جي وضاحت ۽ تشريح رڳو هڪ مصرع ۾ ڪري ڇڏي آهي. اهو برابر آهي ته متقدمين جي تشنه خيالن جي تڪميل، بعد ۾ ايندڙ شاعر ڪندا رهن ٿا، پر تمام ٿورڙن لفظن ۾ هيترين ڳالهيون سمائي ڇڏڻ سچ پچ اچرج جوڳي ڳالهه آهي. اصغر جي نظر ۾ وسڪارو ميلاپ جي مند آهي. هر ذي حس ان مند ۾ وصال جو پياسو هوندو آهي. بس بادل آسمان تي اُسري آيا ۽ جهڙن جهڪور لاتي ته تازي پنهنجي محبوب جي وصال لاءِ تنوارڻ شروع ڪيو. اصغر جو مشاهدو اجا به اڳيرو آهي. هو چوي ٿو ته تازو ڪنهن هڪ سر ۾ نه بلڪ جدا جدا سرن ۾، سو به طرحين طرحين نمونن سان ٿو آلاپي. اصغر انهن سرن جي لئه ۽ تار مان واقف آهي، تڏهن ته چوي ٿو:

" مند ملڻ جي، جهڙن جهڪوران، طرحين تنواري ٿو تازو"

صرف ونحو جا ڄاڻو پلي پت ڄاڻن ٿا تہ طرحين طرحين، قسمين قسمين، ونڪين ونڪين وغيره " مڪرر مرڪب آهن." رنگارنگي، پٽا پٽي: پيٽا پيٽي، گوناگون وغيره بہ مــڪرر مرڪبن ۾ شمار ٿين ٿا، پر ظاهر آهي تہ اهي مرڪب بہ شروع ۾ تہ " مفرد مطلق" هوندا، جي ٻوليءَ جي ٽڪسال ۾ گهڙجي، موجوده صورت اختيار ڪري سگهيا آهن. اصغر سـائينءَ " طرحين طرحين" بدران رڳو " طرحين" (مفرد مطلق) ڪم آندو آهي، جيڪو صرف ونحو جي ماهرن لاءِ پڻ حيرانگيءَ جو باعث بڻيو آهي.

اصغر سائينءَ موسم ۽ ميلاپ بابت هڪ ٻيو بہ سهڻو مثال پيش ڪيو آهي. موسم تي سَر نِسرن ٿا، ۽ ڪانهن جو ٻوڙو ڪڪورجي لال سنگ ڪيي ٿو. سرخ رنگ جي شاديءَ سان نِسبت سنڌ واسين جي لاشعور ۾ سمايل آهي، تنهنڪري ڪانهن جي ڪڪورجڻ کي اصغر "ميلاپ جي منڊُ" جو ڪرشمو ٿو سمجهي. سندس سوچ موجب هن منڊ ۾ قدرت جي هر شيءِ تي عشق سـوار آهي، تڏهن تہ ڪانهن جا ٻوڙا ڪوڏ مان ڪـڪورجي لال ٿيا آهن:

" مندان آيون ميلاپ جون، ڪوڏ ڪڪوريا ڪانهن"

عشق جڏهن عقل جون حدون اورانگهي ٿو وڃي ۽ جذبا جڏهن جنون وٽ اچي دنگ ٿا ڪن، تڏهن لوڪ جي ٽوڪ ۽ ماڻهن جا مهڻا عاشقن کي ڪلي خوش ٿي سهڻا ٿا پون. اها ڪيفيت اصغر سائينءَ بہ بيان ڪري ٿو:

" طعنا ڏيو جي تهمتان ، آءٌ مهڻن ۾ مسرور"

مهڻن ۾ مسرور ٿيڻ جو اصغر سبب بہ ٻڌائي ٿو. هو چوي ٿو تہ:

" مَرڪان مهڻن ۾، ٽهڪان ٽوڪن ۾، اهو دؤر ڪيم سان ديدار تنهنجي"

ماڻهو مهڻن کي مَرڪ سمجهي ۽ ٽوڪن تي ٽهڪ ڏئي، سو تہ شايد ٻين شاعرن بہ چيو هوندو، پر اصغر جي نگاهہ ۾ اجا پراڻهان پنڌ آهن. اصغر سائينءَ مٿي ڄاڻايل خيال ۾ هڪ لطيف اضافو ڪيو آهي، جنهن جو مثال ملڻ مشڪل آهي. اصغر جي خيال موجب عاشقن تي مهڻي ملامت ۽ ٽوڪن ٽهلن جو وسڪارو تہ ٿئي ٿو، ۽ ڪين " چريو چريو" چئي، مٿن سنگباري بہ ڪئي وڃي ٿي، پر اصغر جي ديوانگيءَ جون سرحدون ڪجهہ اڳيرِيون آهن، جو خود چريا بہ مٿس چهرون ٿا ڪن:

" ٽوڪان، ٽهلان، مهڻا، ملامت، چرين تن جا ڪيا چهرا"

شاعر انسانن جي قلبي ڪيفيتن جا ترجمان ٿين ٿا. عشق ۾ ماڻهوءَ تي جيڪي وهي واپري ٿو، تنهن جو صحيح عڪس جيڪڏهن پيش نہ ٿيو تہ پوءِ ڪهڙي شاعري آهي! اصغر جي شاعرانہ عظمت آهي ئي انهيءَ ۾ تہ هو عاشقن جي دل جي آنڌ مانڌ کي ذري پرزي

محسوس ڪري، ان جي عڪس کي لفظن جي لڪيرن سان اهڙيءَ طرح ٿو چٽي، جو تصور هوبهو تصوير بڻجي ٿو وڃي. اصغر شاعر آهي، ۽ شاعر نه رڳو فطرت جي هر ڪنهن شيءِ کي ذي حس سمجهن ٿا، پر انهن جا ڏک سور به انساني جذبن جهڙي صورت ۾ سندن آڏو اچن ٿا. اصغر ته آهي ئي سرتا پا درد، سو سندس هڪ هڪ لفظ مان تاب ۽ تابش جلوه نما آهي. اهوئي سبب آهي، جو ٻين دردمندن سان به ڪيس فطري همدردي آهي. هو جڏهن ڏسي ٿو ته "صبا" پنهنجا سور سيني ۾ سانڍي نه سگهي آهي ۽ ڪين مڪڙين جي مڪڙي تي لڙڪن جي صورت ۾ چڍي ويٺي آهي، تڏهن ڪيس پنهنجا ڳوڙهن پريا ڳل ياد پون ٿا، ۽ صبا کي سڏ ڪري چوي ٿو ته "تون ۽ مان پل ڪيترو به پنهنجا سور لڪايون، پر اسان جا اشڪ ازل کان ئي اسان تي چغليون هڻندا رهن ٿا:

"توتي مون تي اشڪ صبا ٿيا، توڙئون آهن غماز"

پيار ۽ محبت جي پنڌ ۾ جڏهن پير چيو نٿا ڪن، تڏهن پاسن پر رڙهي به اڳيرو ٿيڻو پوندو آهي. اهو مقام عشق جي انتها جو آهي. سسئيءَ جي باري ۾ گهڻن ئي شاعرن خصوصًا شاهه عبداللطيف عليہ الرحمۃ اها ڪيفيت بيان ڪئي آهي. اصغر سائينءَ انهيءَ خيال ۾ هيءُ اضافو ڪيو آهي، ته پيار جا پهاڙ لتاڙيندي نه رڳو پير پٿون ٿيا آهن، پر پاسي پر رڙهڻ ڪري،پاسن ۾ به ريش يا زخم ٿي پيا آهن. اصغر جي تخفيف پسنديءَ جي حد اها آهي، جو اهو سڄو مضمون صرف ائن لفظن ۾ ادا ڪيو اٿس:

"پيرن ۽ پاسن ۾ روهه وڌا هِن ريش"

سسئيءَ جو داستان جڏهن دهرائجي ٿو، تڏهن شاعر اڪثر چوندا آهن ته روهه ۽ راتي جي پنڌ ۾ اوڻين کي پيرين پيادا ڪيئن ٿا پهچي سگهن! بس هڪ آرزو هوندي آهي ته توڏن جون تريون ترڻجن يا مَيَن ۾ "مَري" پوي ته پوءِ ڪين پهچڻ ممڪن آهي. اصغر سائينءَ اول ته چئي ٿو:

"ڪاڏهون پچان ڪرهن کي مُنا هِن مَتار"

مهڙن متارن ڪرهن کي ڪئان پهچجي! پر سعيي ۽ ڪوشش ڏاران انسان پيو چا ٿو ڪري سگهي ؟ جيترو ٿي سگهي، تيز رفتار سان هلڻو آهي:

"بلوچن جي سواري بغدن تي، ڪڍ تنين ڪيئن هلان هوربان"

انهن بغدي ائن ۾ پنهونءَ جي سواريءَ وارو اٺ ته پهاڙن جي پنڌ جو ڪو وڏو تجربورڪندڙ يا "ڪاڙيو" هو:

"ڪرهو ڪيچيءَ جو "اصغر" چئي، ڪرن نيو ڪاڙيو"

اهڙيءَ حالت ۾ بيوسيءَ مان انسان کي چوڻو پوي ٿو ته:

"پهتي هوند پنهونءَ کي، پرئيءَ جي پرّ ها"

پر پاڻي پهچڻ ۽ اڏامي رسڻ جهڙيون عام ڳالهيون تہ گهڻن ئي شاعرن ڪيون آهن. پرخاص ڳالهہ جا فطرت جي بنهہ قريب آهي، تنهن جو اظهار اصغر جي حصي ۾ آيو آهي. اصغر جڏهن شاعريءَ جي آخري بلندين کي ڇهيو آهي، تڏهن ئي ڪانئس هيئين مصرع موزون ٿي آهي:

" رسان رانول کي راهہ ۾، پيرين پاڻي پُر"

پيرن ۾ پر پائڻ هڪ محاورو آهي، جنهن جي معنيٰ آهي پکين جهڙي رفتار سان هلڻ. مگر ۾ يا کنڀ پائهن بدران پيرن ۾ هجن ، اصغر مٿينءَ مصرع چئي، حقيقت نگاريءَ جو حق ادا ڪري ڇڏيو آهي.

ڪي ناگهاني حادثا انسان کي مڪمل طور تي هوش و حواس کان بيگانو تہ نٿا ڪن، پر ڪيس اهڙيءَ مايوسي ۽ نراسائيءَ ۾ مبتلا ڪري ٿا ڇڏين، جو ڪانئس ضبطءِ برداشت جون قوتون بالڪل کسجيو وڃن. اهڙيءَ حالت ۾ انسان کي پنهنجو پاڻ تي اختيار نہ رهندو آهي، ۽ ڪانئس اهڙا عمل سرزد ٿين ٿا، جي سندس حواس باختگيءَ تي دلالت ڪن ٿا. سسئيءَ سان بہ ساڳي ويڌن آهي. جڏهن کيس خبر پوي ٿي تہ ڪيچي ڪيچ ڏانهن روانا ٿي چڪا آهن، تڏهن سندس حالت چريائيءَ جي ليکن کي لتاڙڻ شروع ڪري ٿي، ۽ هوءَ روئندي رڙندي گهر جا نڪر نوڙ ۽ ٽانو ٽپا پوڻءَ تي پيري اچلي پوري پجي، پنهنجي غيض و غضب جو اظهار ڪري ٿي. انهيءَ منظر کي اصغر هن طرح چٽيو آهي:

" پجي پيري بلوچ ري، رڙيون روبون رچ"

عشق عاشقن کي مختلف مرحلن مان اڪاري پار ڪري ٿو. انهيءَ وچ ۾ ڪو اهڙو مقام بہ ايندو آهي، جڏهن عام فطري حالتن جي برعڪس تڪليف ۽ تصديع ۾ راحت ۽ لذت محسوس ٿيڻ لڳندي آهي. اهڙيءَ ڪيفيت کي لفظن جو لباس رڳو شاعر ۽ اديب ئي پهرائي سگهن ٿا. انهيءَ مقام ماڻڻ بعد اصغر چوي ٿو تہ:

" سولو پانيان سک کان اوکو روهہ جو راهہ"

روهہ ۾ جڏهن ماڻهو راهہ وڃائي ويهي ٿو، تڏهن پير چنندڙ پهاڙن ۾، بنا پيچري هلڻ کيڏو نہ ڏکيو ٿو لڳي، پر عشق ۾ اهي پينڊا ۽ ڪشالا " رَت" ڦڄي شاهي سواريءَ کان بہ سهنجا معلوم ٿين ٿا:

" رستا روهن جا رُج - رُليءَ لئہ، سهنجا هِنِ ڪوُن رت"

هن ڳالهہ کي اجا بہ آسان ۽ عام فهم بڻائڻ لاءِ، اصغر سائين چوي ٿو تہ:

" پالڪيءَ ڪوُن پيارو اٿم، پيرين پرينءَ ڏي پنڌ"

ٻئي هنڌ اصغر چيو آهي تہ:

" ويتر ويندي لس "اصغر عاشق"، پير پهاڙين جي گسيو گسندا"

گسڻ لفظ ۾ لسي ٿيڻ جو تصور آهي، تنهنڪري اصغر سائين انهيءَ مناسبت سان لس جو لفظ استعمال ڪيو آهي.

تڪليفون ۽ صعوبتون پلي جيئن پوءِ تيئن وڌنديون وڃن، پر عاشق انهن کان ورچجي نٿو، بلڪ سندس شوق وڌيڪ وڌندو ٿو وڃي:

" ڪيو آهي ڪينڪي، روح روهن کان رچ"

جناب ڊاڪٽر نبي بخش خان بلوچ جي تدوين ڪيل شاهه جي رسالي جي ڏهين جلد ۾، (شاهه جو رسالو، رسالي جو ڪلام) هڪ بيت جون ٻه سٽون آهن:

" سي پسي سرهي ٿي، جي مين لنگهيا مس"

" تت تنبين کي ناهه ڪو، لڪ مڙيوئي لس"

يعني اهي لڪ، جي ميا متارا ان ٻه لنگهي نٿا سگهن، تن کي ڏسي، سسئي ڏاڍي سرهي ٿئي ٿي، ۽ ڪيس انهن نظر اچي ٿو ته انهن لڪن ۾، لاهيون چاڙهيون ته ناهي ماتر به نه آهن. اهي ته بالڪل لس لڳا پيا آهن.

محسوسات ۾ ايڏي تبديلي رڳو حضرت عشق جي طفيلي ئي ممڪن آهي. اصغر سائينءَ انهيءَ خيال ۾ جيڪو اضافو ڪيو آهي، ان جو قدر اهلِ علم ئي پوري طرح محسوس ڪري سگهن ٿا. اصغر خود مجسمه عشق آهي، تنهنڪري سندس احساس به نيزي جي نوڪ تي نظر اچن ٿا. سندس هڪ هڪ لفظ روح ۾ چيندو ٿو وڃي. هو چوي ٿو ته جيئن جيئن سسئيءَ جا پير " پٻ جبل" جي پهڻن سان لڳي، ڦٽون ٿا ٿين، تيئن ڪيس وڌيڪ سرهائي ٿئي ٿي، ۽ هيڏي ساري پيڙا ۾، وڌيڪ مشڪي ۽ ڪشڪي ٿي. هوءَ رت ڳاڙيندڙ پيرن ڏانهن نهاري خوشيءَ منجهان ڪپڙن ۾ ئي نٿي ماپي:

" پٻ ڦٽون ڪيا پاهڻ پٻ جي، مُرڪيو خوشيءَ ۾ نه ماني"

اصغر جي تمثيل فقط سسئيءَ تائين محدود نه آهي، پر هو عشق جي عروج ۽ ڪمال جي وضاحت لاءِ سهڻيءَ جو دليل به ڏئي ٿو، ۽ چوي ٿو ته دهشت ڀرئي درياءَ جي سير جا هيانوَ ڏاريندڙ سڙڪا ۽ ڪنن جا ڪڙڪا جنهن وقت سهڻيءَ جي ڪنن تي پون ٿا، ۽ هوءَ جڏهن ڀيڙن ڄڄيڏيون چوليون ۽ لهرون ايرنديون پسي ٿي، تڏهن سندس اکين ۾ جيڪا خوشي ٿي سمانجي، تنهن جو ڪاٿو ڪرڻ مشڪل آهي. ان وقت سندس چشمن ۾ پيدا ٿيل چمڪ ۽ دمڪ ڏسڻ وٽان آهي:

" سئي سڙڪا سير جا، چشمان ٿيون چهريون"

اصغر عشق آهي، عاشق آهي يا سراپا سوز و گداز آهي، تنهنڪري ته سندس ڪلام ٻڌڻ سان اهلِ دل جي اندر جا ڦٽ اڪلي ٿا پون. اهوئي سبب آهي، جو جهنگ جهر هجي، يا شهر بحر، محراب و منبر هجي يا بزرگن جون خانقاهون، جتي عشق آهي، اتي اصغر جي ڪلام جو پڙلاءُ ڪنن تي ضرور پوي ٿو.

سسئي پنهونءَ جي تمثيل ڪم آڻيندڙ شاعرن مان، ڀانئجي ٿو ته ڪنهن به ايئن نه چيو

آهي تہ " چگو ٿيو جو ڏير سسئيءَ تي ناراض ٿيا ۽ پنهونءَ کي کيچ کڻي ويا" . اصغر سائينءَ سسئيءَ کان چوائي ٿو تہ :

" موٽي نينهن نئون ٿيو، پلي ڏمريم ڏير"

يعني پنهونءَ جي وصال بعد عشق ۾ آيل مائار سندس وڇوڙي سان ختم ٿي ۽ نينهن کي نوان نيش حاصل ٿيا. اصل مقصد بہ اهوئي آهي، جو تہ عشق جي موجودگيءَ ۾ عاشق ۽ معشوق ٻئي غير اهم آهن. انهيءَ ڪري عاشق عشق جي سلامتي گهرندا آهن.

اصغر جي انفراديت جو هڪ ٻيو مثال بہ نهايت توجہ طلب آهي. عاشق آرزومند هوندا آهن تہ محبوب جي در تي سجده ريزي ڪجي، پر اصغر محبوب حقيقي (حضور صلي الله عليہ وسلم) جي وصال لاءِ مالڪ حقيقي جي در تي ڪيهہ ڪري، اچي ٿو ڪري:

" در داور جي دوست لئہ، ڪري ڪيهہ ڪيون"

اصغر سائينءَ جي هڪ سٽ جا ڪنهن نسبت سبب راقم جي زبان تي بار بار اچي ٿي، تنهن کي هتي پيش ڪرڻ آهي تہ ذاتيات ۾ شمار، پر مٿان اها ورهہ جي واردات ڪنهن ٻئي تي بہ وارد ٿي هجي :

" ٻوناٺي ٻولي آهي تہ فلاڻو ڪي فلاڻو اٺ ڪتابن جا پڙهيل آهي، اڳي ڪتاب توڙي دفتر ان تي ڪجي ايندا هئا. معشوقن جي سرڪار بہ " ڏاڍي سرڪار" آهي، عاشقن تان سندن عتاب لهي ئي ڪونہ. اهڙن عتابن لاءِ دفتر درڪار آهن، جي ان تي ئي ڪجي سگهن ٿا. اصغرسائينءَ اهڙو اظهار هڪ مصرع ۾ ڪيو آهي. خلق خدا جي تہ خبر ناهي، باقي هن فقير جي حالت اها آهي، جو هوڏانهن اها سٽ سامهون اچي ٿي، ۽ هيڏانهن لڙڪن جي لار ڳل والارڻ شروع ڪري ٿي. اصغر جي هن سٽ شايد ڪيترن کي تڙقايو هجي . هو چوي ٿو تہ:

" معشوق عاشق ڏي مڪا، اٺڙا عتابن جا ڀري"

<u>اصغر سائينءَ جي سرائيڪي شاعري:</u>

سرائيڪي سنڌ جي ثانوي زبان آهي . سنڌي زبان جا اُهي شاعر ، جي سرائيڪي زبان جا ۾ چار جملا بہ ڳالهائي نہ ٿي سگهيا ، تن بہ سرائيڪيءَ جي دلڪشيءَ کان سحرزده ٿي، هن ٻوليءَ ۾ گهڻو شعر چيو آهي ، ايئن چو آهي ، سا ڳالهہ لسانيات جي ماهرن لاءِ اڄ بہ معمو بڻيل آهي . اصغر سائينءَ جي مادري زبان سنڌي هئي ، پر سندس ڪلام ۾ سرائيڪي ڪافين جو وڏو انگ آهي . اصغر سائينءَ سرائيڪي ٻوليءَ ۾ اٺونجاهہ ڪافيون چيون آهن ، جن جي وڏي خوبي اها آهي تہ اُهي سرائيڪي علائقي جي مرڪزي معياري محاوري ۾ چيل آهن ، هونئن تہ اُهي ڪافيون ٻين سرن ۾ بہ چيل آهن ، پر " سُر هير" ۽ " سُر جوڳ" ۾ ، سندن تعداد وڌيڪ اهي . سُر هير کي سنڌ ۾ تمام گهڻو ڳايو ويو آهي . ان جو وڏو سبب هن سُر جي واضح تمثيل آهي : " تخت هزاري جو مالڪ جيڪڏهن جوڳين وارو خاڪ نما، لباس پهري ، الست آواز واري ٻين اچي وڃائي تہ عاشقانِ رسول پنهنجي آلا پن ۾، " هير " جي زبان ڇونہ استعمال ڪندا ! " سُر جوڳ" بہ

آهي ته " چگو ٿيو جو ڏير سسئيءَ تي ناراض ٿيا ۽ پنهونءَ کي ڪيچ ڪڍي ويا". اصغر سائينءَ سسئيءَ کان چوائي ٿو ته :

" موڙي نينهن نئون ٿيو، ڀلي ڏمريم ڏير"

يعني پنهونءَ جي وصال بعد عشق ۾ آيل مانار سندس وڇوڙي سان ختم ٿي ۽ نينهن کي نوان نيش حاصل ٿيا. اصل مقصد به اهوئي آهي، ڇو ته عشق جي موجودگيءَ ۾ عاشق ۽ معشوق ٻئي غير اهم آهن. انهيءَ ڪري عاشق عشق جي سلامتي گهرندا آهن.

اصغر جي انفراديت جو هڪ ٻيو مثال به نهايت توجه طلب آهي. عاشق آرزومند هوندا آهن ته محبوب جي در تي سجده ريزي ڪجي، پر اصغر محبوب حقيقي (حضور صلي الله عليه وسلم) جي وصال لاءِ مالڪ حقيقي جي در تي ڪيهه ڪري، اچي ٿو ڪري:

" در داور جي دوست لئه، ڪري ڪيهه ڪيون"

اصغر سائينءَ جي هڪ سٽ جا ڪنهن نسبت سبب راقم جي زبان تي بار بار اچي ٿي، تنهن کي هتي پيش ڪرڻ آهي ته ذاتيات ۾ شمار، پر متان اها ورهه جي واردات ڪنهن ٻئي تي به وارد ٿي هجي :

" ڳوٺاڻي ٻولي آهي ته فلاڻو کي فلاڻو اڻ ڪتابن جا پڙهيل آهي، اڳي ڪتاب ٺوڙي دفتر اٿن تي ڪجي ايندا هئا. معشوقن جي سرڪار به " ڏاڍي سرڪار" آهي، عاشقن تان سندن عتاب لهي ني ڪوڻه. اهڙن عتابن لاءِ دفتر درڪار آهن، جي اٺن تي ني ڪجي سگهن ٿا. اصغرسائينءَ اهڙو اظهار هڪ مصرع ۾ ڪيو آهي. خلقِ خدا جي ته خبر ناهي، باقي دن لار ڳل والارڻ شروع ڪري ٿي. اصغر جي هن سٽ شايد ڪيترن کي تڙقايو هجي . هو چوي ٿو ته:

" معشوق عاشق ڏي مڪا، اٺڙا عتابن جا ڀري"

اصغر سائينءَ جي سرائيڪي شاعري:

سرائيڪي سنڌ جي ثانوي زبان آهي . سنڌي زبان جا اُهي شاعر ، جي سرائيڪي زبان جا ٻه چار جملا به ڳالهائي نه ٿي سگهيا ، تن به سرائيڪيءَ جي دلڪشيءَ کان سحرزده ٿي، هن ٻوليءَ ۾ گهڻو شعر چيو آهي ، ايئن ڇو آهي ، سا ڳالهه لسانيات جي ماهرن لاءِ اڄ به معمو بڻيل آهي . اصغر سائينءَ جي مادري زبان سنڌي هئي ، پر سندس ڪلام ۾ سرائيڪي ڪافين جو وڏو انگ آهي . اصغر سائينءَ سرائيڪي ٻوليءَ ۾ اڻونجاهه ڪافيون چيون آهن ، جن جي وڏي خوبي اها آهي ته اُهي سرائيڪي علائقي جي مرڪزي معياري محاوري ۾ چيل آهن ، هوندن ته اُهي ڪافيون ٻين سرن ۾ به چيل آهن ، پر " سُر هير" ۽ " سُر جوڳ" ۾ ، سندن تعداد وڌيڪ اهي . سُر هير کي سنڌ ۾ تمام گهڻو ڳايو ويو آهي . ان جو وڏو سبب هن سُر جي واضح تمثيل آهي : " تخت هزاري جو مالڪ جيڪڏهن جوڳين وارو خاڪ نما. لباس پهري ، الست آواز واري ٻيــن اچــي وڃــاني ته عاشقانِ رسول پنهنجي آلا پن ۾، " هير " جي زبان ڇونه استعمال ڪندا ! " سُر جوڳ" به

" واڳو ويڙهي ڪاوڻ آون ، گندڻ گانڪٽ گوجان ، جي "

جوين ۽ جواني عيش وطرب جو نالو آهي ،پر جڏهن عشق لڳي ٿو ، تڏهن نہ جوين جا ناز ياد رهن ٿا ۽ نہ عيش جا انداز ،ماڻهو پنهنجي حال کان بہ بي خبر ٿيو وڃي. انسان جي اهڙيءَ بيحالي ۽ بيوسيءَ جي نقش ۾ اصغر سائينءَ جيڪي رنگ پريا آهن،تن جي رعنائي ۽ رنگينيءَ کان متاثر ٿي ، خود سرائيڪي ٻولي قزح جي پينگهہ تي جهوتا پئي کائي . عشق جي انهيءَ واردات کي اصغر سائين هيئن چٽيو آهي :

" جنهن ڏينهن ساڏا عشق جو لڳڙا ،ڇُڪ ڳئي سڀ تال"

زبان و بيان جي خيال کان " ڇُڪ ڳئي سڀ تال " جي قيمت جو ڪاٿو ڪير ، ڪري سگهندو !

اصغر سائين هڪ هنڌ چوي ٿو تہ : اي دوست ! نيڻن جي نوڪن دل ۽ جگر ۾ جيڪي زخم ڪيا آهن ، تن تي پٽيون ٻڌي ، ڪين ميساري نہ ڇڏ، ڇو تہ اهي زخم تہ تنهنجي نازڪ ناوڪ جون نشانيون آهن ، تنهنڪري ڪين نشانبر رهڻ ڏي :

" ٻَڌ نہ پَٽيان هِنم نشانيان ، رهن نشانبر نوڪان ،جي "

خواجہ غلام فريد رحہ سرائيڪي ٻوليءَ جو بي بدل شاعر تسليم ڪيو وڃي ٿو . سندس هڪ شعر آهي :

ٻُڏّنا تي ول تڙ ڪيا پُڇنا، ڏُو ڪيتم درياءِ "

لڳ ڀڳ اهڙو مضمون اصغر سائينءَ هن طرح ادا ڪيو آهي :

" پار دريانون جهوڪ رانجهن دِي ، تانگهہ نہ پڇديئان تار

وچ ڳِهر پئييان

خواجہ صاحب درياءَ ۾ ڏُو ڪرڻ جو سبب نہ ٻڌايو آهي .سندس خيال آهي تہ جيڪي ڪرڻو آهي ، سو ڪري ڇڏجي ، دل هٹڻ ڪٽڻ مان ڪهڙو فائدو ؟ پر اصغر سائينءَ وٽ تانگهہ ۽ تار نہ پڇي ، جتان آيو تتان ڳِهڙي پوڻ لاءِ سبب موجود آهي. " رانجهن جي مينهن جي جهوڪ ۽ پوک درياءَ جي پار آهي،انهيءَ ڪري سوچڻ ۽ سمجهڻ جي ضرورت ني ڪانهي، بس ڳهڙي پوڻو آهي

مٿي ذڪر ڪيل مصرع سان گڏ هڪ ٻيءَ مصرع آهي ، جنهن جو ذڪر نہ ڪرڻ پڙهندڙن جي حق تلفي ٿيندي :

" جنهن تڙ ميڏا رانجهن وسدا ، سو تڙ باغ بهار

ڪلديان لئيان"

رانجهن جي جهوڪ درياءَ جي اهڙي تڙ تي آهي ،جتي درياءَ جي چڙيل رءُ ۽ لَٽ تي پلجي جوان ٿيل لَيون جڻ تہ ڪوثر ۽ تسنيم سان ڌوپجي اچيون اُجريون پيون لڳن. رانجهن جي موجودگيءَ سبب ، اهو تڙ " هير " لاءِ بجنسہٖ باغ آهي ، بلڪہ باغ بهار آهي . اصغر سائينءَ هتي "ڪِلديان ليان " جا لفظ استعمال ڪياآهن . عام طرح ڪنهن ماڻهوءَ جي مُنهن تي سَرهائيءَ جون ريکون پسي چئبو آهي تہ " اج تہ هن جا ڪپڙا بہ پيا ٽا ڪلن . " ڪپڙن جو ڪِلڻ تہ عام محاورو آهي ، پر "لين لاٽن جو ڪِلڻ " اصغر سائينءَ جي تخليق آهي . اُميد تہ سرائيڪي ادب جا محافظ سنڌ وارن طرفان " ڪِلديان لَيان " جو پيش ڪيل بي بها تحفو سَاهہ سان سانديي رکندا.

ڪوُنس ڪي سرائيڪي زبان توڙي اتراڊي سنڌي محاوري ۾ ڪَننس چئبو آهي، جنهن جو جمع سرائيڪيءَ ۾ ڪَننسان آهي . اصغر سائينءَ اهو لفظ قافيي طور ڪم آندو آهي . ڪننسان قافيي سان متعلق مضمون جي تلاش ڪيڏي ڪٺن هئي ،پر اصغر سائينءَ جي لاءِ اها پاراٿي راند آهي . هو چوي ٿو تہ :

" ماءِ ڏيوي مَد يان ، پيٺين بدّيان ،کر ڪيڙا ڪري ڪَننسان
سرتيان مارن ٺوڪان"

اصغر سائينءَ سنڌي شاعري ۾ تہ فلسفيانہ ۽ عالمانہ زبان استعمال ڪئي آهي ،پر سرائيڪي شاعريءَ ۾ سندس ڪلام عامي لهجي ۾ آهي ، تاهم فصاحت توڙي بلاغت جي خيال کان اهو سنڌي ڪلام کان ڪنهن بہ حالت ۾ گهٽ نہ آهي . اصغر سائينءَ آسان ۽ عام فهم لفظن جي وچ ۾ ڪو هڪ اڌ سحرانگيز لفظ اهڙيءَ طرح جَڙي ٿو ڇڏي ،جو پڙهندڙ ان ۾ ئي مست ٿيو وڃي . اصغر سائينءَ "مذڪور" لفظ ڪهڙي نہ پرڪشش انداز ۾ استعمال ڪيو آهي ؟

" مَن اساڏي مول نہ پاوندا ، ڪيڙيان دا مذڪور "

سرائيڪي لغات تي اصغر سائين ءَ ڪي ڪيڏي دسترس آهي ، سا ڳالهہ هيٺ ڄاڻايل بن سٽن مان پلي پت پروڙي سگهجي ٿي .

" ڏوڙ پلا ڪي دوڙ جو ڪيتس ،ڦَٽ ڦَٽي انهين ڦُٽي هان "

يعني ڪيرپياري، مون سان دوڙ يانگي ڪئي اٿس ، مون کي تہ ڏونري جي انهي ءَ ڦُٽي (ٿورو ذرو) ڦَٽي ڇڏيو آهي .

" ماهي مَهِي ڏِتي ماهِي مينون ،گُهٽ تنهين جو مَين گُهٽي هان "

يعني دوست (ماهِي) مون کي مينهن جي (ماهِي) لسي پياري آهي. آءٌ تہ

انھيءَ ڳھٽ (ڏُک) ۾ ٿي ڳھٽجي ويٺي آھيان. علم صنايع بدايع جا ڄاڻوني دُوڙ دوڙ ،ڦٽ ڦٽي ۽ ڦٽِي ، يا ماھِي ، مَھي ، ماھِي ، ڳھٽ ۽ ڳھٽي جھڙن لفظن کي ھڪ ٿي ھنڌ رکڻ تي داد ڏيڻ لاءِ مجبورآھن.

وِرھہ جي وسڪاري جو ذڪر اصغر سائينءَ ھڪ سنڌي ڪافيءَ ۾ بہ نھايت سھڻي نموني ڪيو آھي: " ڳھرڳھاريندين ڪيترو، جن تي ورھہ وٺو ھو" ،پر سرائيڪي ڪافيءَ ۾ ان جو رنگ اڃا بہ وڌيڪ نمايان آھي:

" مَين نماڻي تي ورھہ جو وسدا ، ڪالي ڪرڪي غمام "

اصغر سائينءَ جو چوڻ آھي تہ " ورھہ تہ مون تي وَسي ٿو ، پر اُن جا غمام يا ڪَڪر انتھائي پريھو يا ڳھرا ڪارا آھن .

اصغر کي پنھنجي عشق تي ناز آھي . ھو چوي ٿو تہ منھنجو عشق ڪومخفي يا لڪل ناھي ، اھو تہ نقاري تي چوٽ مثل آھي :

" اصغر عاشق " عشق ميڏي دي ، وڄدي دھل دمام "

زلفن کي نانگن سان تشبيہ تہ اڪثر شاعرن ڏني آھي ، پر ڪنھن بہ ايئن نہ چيو آھي تہ :

" زلفان ظالم ديان ، ڏنگيان ڪاڻ ڏنگڻ دي "

يعني محبوب جي زلفن ۾ ور آھن ٿي انھيءَ ڪري ،جو ھو ڏنگڻ لاءِ تيار بيٺا آھن.

اصغر سائينءَ جي سرائيڪي شاعريءَ کي ڏسي ، حيرانگي ٿئي ٿي تہ جنھن شاعر جي مادري زبان سرائيڪي نہ آھي، سوھڙي معياري ٻوليءَ ۾ شعر ڪيئن ٿو چئي سگھي ! سچ پچ اصغر جو اندازِ بيان ئي اور آھي :

" اصغر عاشق " چاون ملامت ، مَين پي چا سر چيسان
ڪيا وڃايا ھي لوڪان "

" ڪيا وڃايا ھي لوڪان " جو جيڪڏھن سنڌي ٻوليءَ ۾ ترجمو ڪبو تہ ٿيندو " ماڻھن جو ڇا ويجي ؟ " " ڇاوجي " جي معنيٰ چڱن ڀلن صرفين کي بہ سمجھہ ۾ نہ ايندي ، ڇوتہ اھي "وڃي " کي وڃائڻ بدران "وڃڻ " مصدور ۾ ڳوليندا . اصغر سائينءَ سندن اھا مشڪل آسان ڪري ڇڏي آھي

اصغر سائينءَ جي سرائيڪي ٻوليءَ جو لھجو ٻين سنڌي شاعرن کان نہ رڳو نرالو آھي ، پر اھو سرائيڪي ٻوليءَ جي معياري لھجي کي وڌيڪ ويجھو آھي.

اصغر سائينءَ پنھنجي ٽيھن سالن جي مختصر عمر ۾ جبل جيڏا منصبي فرائض نباھيندي ، ھيترو ڪلام ڪيئن چئي سگھيو آھي ! آخر ڪيس شاعري ڪرڻ لاءِ ماحول ڪٿان مھيا ٿيو ھوندو ۽ واندڪائي ڪٿان ميسر ٿي سگھندي ھوندي؟ اھو ھڪ راز آھي ، جنھن تان ٿي سگھي ٿو تہ اصغرسائينءَ جي شعر جي ھڪ ستت پڙھو کلي سگھي !

" سور پريان جا سانڻ ، چوريان سرتيون چاڪ چڪن ٿا "

انيني پهر جنهن وٽ پريءَ جا سور هڪيا حاضرهجن ۽ رڳو انهن جي چورڻ سان چاڪ چڪي پون، ته پوءِ عشق جا آلاپ شعر جي صورت ڇو نه اختيار ڪندا هوندا ! اهو به راز آهي ته اصغر جي شاعري ۾ ايڏو درد ڪٿان پيدا ٿيو ؟ اصغر وٽ درد جو اٿاهه سمنڊ آهي ، جنهن جو ٿاهه لهڻ ڏاڍومشڪل آهي . تاهم اصغر جي هڪ سٽ شايد ڪجهه رهنمائي ڪري سگهي :

" پني پهرتين پني ۾ ، فراقن جي فال "

سمجهجي ٿو اصغر سائينءَ جي ڇولي ۾ اجا عشق جي چٽنگ ئي مس پني ته مٿان فراق جي طوفان اچي مچ مچايا .اصغرسائينءَ عاشقيءَ ۾ پهريون قدم رکي، "عاشق" نام ته ڌرايو ، پر سندس ذات جي شمع ڪي جن لکن پتنگن پنهنجو مرڪز بڻايو هو. تن جي احساس ڪيس مجبور ڪيو ته پنهنجي تڙڦندڙ دل تي ضبط جو پٿر رکي ۽ پنهنجي پروانن جي بيماردلين جي مسيحائي ڪري . اصغر وٽ جيتوڻيڪ اڻ تکيو اڻ توريو درد آهي ، تڏهن به ان ڪي اجا عشق جي ابتدا ٿو سمجهي ، انتها ته الاجي ڪهڙي هوندي ! هو چوي ٿو ته :

" عشق " اصغر" جي جا پرين ، اجا آهن آغاز "

اصغر بولي جو بادشاهه آهي. سنڌي صرف و نحو تي سندس اڻ ڳڻيا احسان آهن . سنڌي لغت لفظن توڙي محاورن جي لحاظ کان سندس مرهون منت آهي . اصغر سائينءَ اهڙا لفظ به محفوظ ڪياآهن ، جي غلط العوام آهن . يعني جن کي رڳو اڻ پڙهيل ئي استعمال ڪندا آهن . مثلاً حق عربي ٻوليءَ جو لفظ آهي ، جنهن سان فارسي زبان جو "نا" لفظ ڳنڍي ، " ناحق " بڻايو ويو آهي . لغت جي علم کان غير واقف عوام انهيءَ " نا" تي اڪتفا نه ڪندي ، ٻئي ناڪاري لفظ " بي" کي اڳياڙي طور ڳنڍي، ڪيس " بي ناحق " بڻائي ڇڏيو آهي . اصغر سائين اهو لفظ هن طرح محفوظ ڪري ٿو :

" بي ناحق بيبيءَ تي ، ڏلهيون پڌن ڏاهه "

اهلِ علم کان وڌ اصغرسائينءَ جو احسان اهلِ درد ۽ اهلِ دل انسانن تي آهي، جن لاءِ اصغر جو ڪلام سندن دلين ۾ رقت پيدا ڪندي، عشق ۾ اڳيري وک اٿلائڻ لاءِ مهميز جو ڪم ڏيندو رهي ٿو . اصغر جا اهي ٿوهه . احسان ۽ ٿورا لاهي ته نٿا سگهجن، پر ڳائڻ لاءِ به اصغر سائينءَ جي هڪ مصرع ۾ ٿوري تبديلي آڻي ، چوڻو پوندو ته :

" ڪوڙين ڪيڙه ڪرم ڪوهيارا ، آءٌ ڪا پڇان تنهنجي توهين!"

پروفيسرشيخ محمد فاضل ؒ

[1] استفاده " اصغرسائينءَ جو ڪلام "

ڪافي -1

ٿلهه : ڏتــارن ڪـــؤن ڏار، درد پـــري دل مـــنـــهـــنـــجي

1- ســاربــو ســانگـيـنـڙن ڪي، نـيـڻـين وهـايـان ٿـي نـار

2- ڪـــانـين ٿـــا [1] ڪـــيـــت ري، ويـــس وڳا هـــي هـــار

3- ابـــاڻـــن ســـــــان آءُ وجي، ڏونـــرن چونـــديـــان ڏار

4- ســاعـت ســاعـت ســاهـ ڪـي، ســرتـين جي آهـي ســار

5- پــانــر پـــيـــنـــن پـــلـــر جي، تَن ۾ تِن جي آهــي تــار

6- فالان وينـي ٿي آءُ وجهان، " ويڙهه وينديس ڪنهن وار"

7- ســڪ سـنـگـهــارن جي ســاهـ ۾، عـــمـــر! اٿـم اپـار

8- ڪـدي مــون ڪـي ڪـوٽ مـؤن، جهــانـگـي مــيـل جبــار !

9- جيـنــري جيـڏيـن ڪـي ڏســان، ڪـرڪـو تـوهـ [2] تـبــار !

10- آجڙيـن لـئـهـ " اصــغـر" ســو، نـيـڻـين واهـيــان ٿـي نـار.

1- ڪانين ٿا= سـاڙين ٿا 2- توهـ = ٻاجهه، احسـان

ڪافي -2

ٿلهہ : پُڄ نہ پنئي ڪنهن پار، تو ۾ ديرو دوست جو

1. هوت اهوني هڪڙو، چاڻ نہ پيي ٿيي چار
2. ووڙي ڏس تون وجود ۾، وهم وڇوڙي جو وار [1]
3. من محبت مچ ۾، ٻارڻ ڪري ٻار
4. ملين تان پڻ مچيءَ جيان، " سانول سانول" ڪيو سار
5. "اصغر عاشق" ڪي اندر ۾، آهي پريتہ جي تہ پچار.

(1) وهم وڇوڙي جو وار = وڇوڙي يا فراق جو گمان ڪڍي ڇڏ.

ڪافي-3

ٿلهہ: نازن ساڻ نہ مار، نمائيءَ کي

1. نيڻ ڪشي تون يار ننگيلا، نڌر ڏي تہ نهار
2. رحم راحم ڪر ڪنيز تي، گڏ گوليءَ سان گذار
3. پريتہ پارج قول " قالوا" جا، ساڻ نڌر نادار
4. فالان پائي هيءَ فراقڻ، ايندين تون ڪنهن وار؟
5. " اصغر" تو لاءِ آهي اداسي، تنهن کي يار تنوار. [1]

(1) تنوارڻ = سڏ ڪرڻ

• ڪافي -4

ٿلهه : نيڻ ڪٿي تون نهار، نماڻيءَ ڏي

-1 ڪمانينديس در ڪيچڻ جي، ڪنيزڪ ٿي ڪار [1]

-2 سخن سيباڻا ساھ منهنجي کي، گل پانيان ٿني گار [2]

-3 نوڪان نيڻن يار تنهنجن جون، سيني مون ويون پار

-4 پنهنجي وڙان سو دوست پيارا، سڪايل کي سنيار

-5 "اصغر عاشق" يار پنهنجي جي، جڏي جان جيار.

(1) ڪار ڪمائڻ = پورهيو ڪرڻ

- پانهي ٿي منن ڪار ڪميان، سن تون سانول سياڻا -(شاعر ابوبڪر) بياض اعظم شاھ ص 135)

(2) گل پانيان ٿي گار = گارين کي بہ گل ٿي سمجهان

- گهوري " جيءُ" جهان جي گل پريان گارين - (شاعر نامعلوم، بياض اعظم شاھ ص 606)

ڪافي -5

ٿلهہ: سهڻي [1] پر ڏيڪار، سهڻا صورت سُهڻي

-1 سدا سڪي ٿي صورت تنهنجي لئہ ، ناميا! هيءَ نڪار

-2 ڪرتون ڪرم هن هيڻيءَ سان، پرين چڏ پيڪار

-3 نذر نواز ينہ ننڊ پر نوري ! براهمڻ بيڪار

-4 قول " قالوا" جا ڪيئہ جي ڪيچي، پرتيءَ [2] سان سي پار

-5 سهڻي سانول لئہ عاشق عاقل، هاريا ! تون هنجهون هار

-6 " اصغر عاشق" کي يار تون ياور، تار منجهنون اچي تار.

(1) سهڻو = سپنو، خواب (2) پرتي = ڏوهن

هيءَ ڪافي مولانا عبدالقادر رحہ جي بياض پر ص 273 تي ۽ اعظم شاھ جي بياض پرص 442 تي آهي.

اصغر کی فارسی شاعری

ایسی روایات تو بہت ملتی ہیں کہ شاعر نے طبع آزمائی کے دوران آگے چل کر اپنا تخلص تبدیل کر لیا۔ اس کے لیے غالب کی مثال ہی کافی ہے، جنھوں نے ''اسد'' سے ''غالب'' تخلص اختیار کیا۔ ایسی مثالیں بھی ہیں کہ شاعر نے اپنی نسبت الگ الگ ظاہر کی کبھی استاد کے حوالے سے اور کبھی علاقوں کے حوالے سے مثلاً: فارسی کا مشہور شاعر عمادی شہریاری تھا، جو عمادی غزنوی کے نام سے بھی پہچانا جاتا تھا۔ اسی طرح چند مثالیں ایسی بھی ہیں کہ شاعر نے اگر دو زبانوں میں شاعری کی ہے تو دونوں میں اپنا تخلص جدا رکھا۔ ''اصغر'' نے سندھی اور سرائیکی میں اپنا تخلص ''اصغر'' رکھا ہے۔ جب کہ فارسی شاعری میں اپنا تخلص ''اپنے نام کے رعایت سے ''گوہر'' اختیار کیا ہے، اس کے لیے ان سندھی کافی کا ایک شعر دیکھیں:

لا مکاني ۽ کي کيائون مکاني ، قلب اندر کٹي پير

،،اصغر،، عاشق، عشق ۾ کونهي ڏاڏو نه ڏاڍي ڏير

پھر ایک فارسی غزل کا مطلع دیکھیں:

''گوہر'' از بہاران پری رخسار

بہ گریبان دریدہ می آید

یعنی اصغر نے ان دونوں زبانوں کے کلام میں اپنا تخلص الگ الگ استعمال کیا ہے۔ ان کی فارسی غزل کا معیار بہت بلند ہے، اور بعض جگہ ایسے نکات اور اشارے واضح طور پر نظر آتے ہیں جیسے بہادر شاہ ظفر کی اردو غزل میں نمایاں ہیں جن میں بادشاہ کی حاکمیت نام نہاد ہونے کا تاثر ہے یا پھر اپنی مجبوری، وفاداروں کی وفاداریاں تبدیل ہونے کے حوالے وغیرہ، اسی طرح ہمارے شاعر کے یہاں بھی ایسے ہی تاثر ہے کیوں کہ اُس دور میں انگریزوں نے اِن کے خلاف جو محاذ آرائی کی تھی جس کے تحت انھوں نے اپنے قریبی لوگوں کی بدلتی ہوئی وفاداریاں دیکھیں تھیں، ان کا بیان فارسی غزل میں بڑا رچاؤ رکھتی ہے، جس کو سامنے رکھتے ہوئے ہمارے شاعر کے سیاسی حالات کو بہت آسانی سے مرتب کیا جاسکتا ہے۔

جہاں تک فارسی لفظیات وتراکیب کا ذکر ہے ہمارے شاعر نے بڑے سلیقے سے ان تراکیب ولفظیات کو برتا ہے اور بعض جگہ ایسے عمدہ الفاظ کا استعمال کیا ہے جس سے رعایتِ لفظی کی اعلیٰ مثال قائم ہوتی ہے۔ ہمارے شاعر کے یہاں بعض تراکیب کا استعمال کثرت سے ہے جس سے دو باتیں واضح ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ خود الفاظ سے متاثر ہے اور دوسری یہ کہ وہ ان تراکیب کو زیادہ بہتر انداز اور امکانات کے ساتھ نظم کرنے پر قدرت رکھتا ہے جس میں سے ہم یہاں صرف ایک لفظ ''چشم'' سے متعلق چند تراکیب کو بیان کر سکے گے جس کی روشنی میں ہمارے بیان کو سمجھا جا سکتا ہے۔

ہمارے شاعر نے اس لفظ کو مختلف انداز اور امکانات کے ساتھ تراکیب کے ساتھ پیش کیا ہے جن میں، تیغِ چشم، خمارِ چشم، چشمِ نم، چشمِ دل، چشمِ من، جیسی تراکیب کا خوب استعمال ہوا ہے۔ اور ایسے چند لفظ اور ہیں جن کی تراکیب میں شاعر نے کمالِ ہنر دکھایا ہے، لیکن صرف چشم سے متعلق ان تراکیب میں سے دو مثالیں ملاحظہ فرمائیں:

دل زِ دردِ عشقِ او رنجور شد
از خمارِ چشمِ او مخمور شد

ایک اور مثال دیکھیے:

چشمِ من مانندِ ابر نو بہار افشاندہ است
چوں صدف در گوش کن این در ہا شہوارِ خود

شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب ''موج کوثر'' میں لکھا ہے:

مولوی سید نصیر الدین دھلوی اپنے رفقا کے ساتھ ۲ تاریخ اپریل ۱۸۳۵ء دھلی سے روانہ ہوا آپ کا قافلہ ٹونک اجمیر جیسلمیر اور خیر پور سے حر جماعت کے مرکز ''پیر جو گوٹھ'' پہنچا تو ان کو اطلاع ملی کہ پیر سید علی گوہر اصغر تبلیغی دورے پر سورت اور احمد آباد کی طرف گئے ہیں اس لیے مولوی صاحب کی ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔

نامور محقق ڈاکٹر نبی بخش بلوچ کا خیال ہے کہ غالباً اس دور میں پیر سائیں محمد راشدؒ کا خلیفہ نبی بخش بھی ان کے ساتھ تھا، ان کے علاوہ پیر علی گوہر اصغر نے ایک عرصہ خلیفہ محمود نظامانی اور خلیفہ

عبداللہ اور خلیفہ گل محمد کے ساتھ گزارا تھا، جو پیر محمد راشدؒ سے فیض یاب ہوئے تھے۔

خلیفہ محمود نظامانی کو یہ شرف حاصل ہوا تھا کہ آپ نے ملفوظات روضے دھنی کو مرتب کیا تھا۔ خود بہت بڑے عالم تھے اور مثنوی مولانا روم کا عمیق مطالعہ کیا تھا، جب کہ خلیفہ نبی بخش نے سید علی گوہر اصغر کو پیر سائیں صبغت اللہ شاہؒ کے ملفوظات جمع کرنے میں مدد دی تھی۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ سے روایات جمع کیں تھیں۔

خلیفہ نبی بخش سندھی اور سرائیکی زبان کے بہت بڑے شاعر تھے، آپ کا کلام سندھ کے ممتاز ادارے سندھی ادبی بورڈ نے شایع کیا ہے جس کو ڈاکٹر نبی بخش خان بلوچ نے مرتب کیا ہے، خلیفہ نبی بخش کے کلام میں وہی رنگ جھلکتا ہے جو یونانی شاعر ہومر (Homer) کے کلام میں نظر آتا ہے۔

چناں چہ ہم آسانی سے سمجھ سکتے ہیں کہ جس شمع محفل کے اردگرد خلیفہ محمود نظامانی اور خلیفہ نبی بخش جیسے قادرالکلام شاعر دائیں اور بائیں بیٹھے تھے، اس شمع محفل کا اپنا جمال اور جلال کیا ہوگا!

آپ علم، فضل، فیض، سخاوت کی بدولت پورے سندھ اور ہند میں مقبول و مشہور ہیں۔ آپ کے پاس لوگ دور دراز سے علم و فیض حاصل کرنے آتے تھے۔ ہر وقت محفلیں جمیں رہتی تھیں۔ علمأ شعراء اپنی ذوق سے لوگوں کو دین کے علم سے مالامال کرتے تھے۔ لوگوں میں اتنا شوق تھا کہ لوگ محفل میں بیٹھ کر فیض حاصل کرتے تھے اور کئی لوگ مدہوش ہو جاتے اور اتنا اثر لیتے تھے کہ زندگی ہی بدل جاتی تھی پھر ایسی باتوں پر ''عمل'' کرتے تھے۔ صرف اس حد تک نہیں کہ کہتے تھے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِی الدُّنیَا حَسَنَۃً وَّفِی الا ٰخِرَۃِ حَسَۃً وَّ قِنَا عَذَاباً النَّارِ

دین کے ساتھ آپ کے پاس دنیا کے بھی دریا بہتے تھے۔ اللہ پاک نے بھی قرآن پاک میں فرمایا ہے: کہ نیک لوگوں (تقویٰ) کی دین دنیا میں بہتر اجر یا ثواب ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ دنیا کو چھوڑ کر صرف دین اپناؤ۔

حضورؐ نے بھی تمام دینوی کام انجام دیے۔ انسان پر لازم ہے کہ دنیا میں رہتے ہوئے تمام کام جائز طریقے سے انجام دے اور جن باتوں کو چھوڑنے کو کہا ہے۔ (شریعت کے مطابق) پھر انسان کا ہر کام عبادت میں شامل ہوتا ہے چاہے

سونا، کھانا، پڑھنا، گھومنا وغیرہ۔

قرآن پاک میں سورۃ فرقان میں ہے خدائے پاک کے بندے زمین پر عاجزی سے چلتے ہیں غرور نہیں کرتے اور لڑتے جھگڑتے نہیں۔ پوری زندگی میں اگر رائی کے دانے برابر فخر کیا تو ساری عبادتیں ضایع ہو جاتی ہیں۔

لیکن آپ ''پیر گوہر علی شاہ'' فقیری پر فخر کرتے تھے۔ یہی عبادت ہے آپ سادہ اور درویشانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کے کلام سے آپ کے نظریات، جذبات اور احساسات کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

گوہر علی شاہؒ نے اپنی شاعری کے ذریعے بھی نیکی اور نیکوکاری کا درس دیا اور اسی فلسفہ کو بیان کیا جو ہمیں درد کے یہاں نظر آتا ہے، یعنی متصوفانہ شاعری ایسی شاعری جس میں پوشیدہ محبوب، حقیقی ہے اور عشق کا اظہار جو صادق عشق کہا جاسکتا ہے۔ اگر ہم غور کریں تو وہ زمانہ وہ تھا جب تقریباً ہر علاقے میں شاعری عام تھی، بل کہ شعر و ادب کی تعلیم تربیت کا حصہ ہوتی تھی اس تعلیم کے بغیر کوئی خاندان اور کوئی فرد باعلم یا تہذیب یافتہ نہیں کہلاتا تھا، لہٰذا آپ نے بھی اس علم کو حاصل کیا اور اس میں طبع آزمائی بھی کی لیکن عام روش اور عام رویے سے ذرا مختلف، لہٰذا ان کی شاعری میں ہمیں عشقِ حقیقی کا جوہر کارفرما نظر آتا ہے۔ اور یہ اس لیے ہے کہ شاعر یا کوئی بھی تخلیق کار ایک سچا تخلیق کار جب بھی کہلاتا ہے جب اس کے احساس اور شدتِ جذبات اور تخلیق میں دوئی نہ ہو، یعنی جیسا وہ محسوس کرتا ہو، سوچتا ہو، فکر رکھتا ہو، وہی اس کی تحریر میں نظر آئے یعنی تخلیق، وجدان کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اب اگر علی گوہر شاہؒ کی شاعری ہم دیکھتے ہیں تو یقین ہو جاتا ہے کہ ان کا باطن، ان کا وجدان، اس عشق سے روشن اور نسبت سے منور تھا۔ جسے عشقِ حقیقی کہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ آپ کا سندھی کلام عموماً حر جماعت کے لوگ محفل میں گایا بھی کیا کرتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی کتاب ''مقدمہ شعر و شاعری'' میں واضح طور پر ایسے کلام کی تعریف کی ہے بلکہ شاعروں پر زور دیا ہے کہ وہ ایسی شاعری کریں جو سننے والوں میں انقلاب پیدا کر دے۔ وہ اپنے ملک، ملت اور اپنے مذہب کی پاسبانی اور فروغ کے لیے تیار ہو جائیں اس لیے کہ شاعری سننے والوں کے دل اور ذہن پر بیک وقت اثر انداز ہوتی ہے۔ تکمیلہ مقالات الشعراء کا مصنف مخدوم ابراھیم خلیل لکھتے ہیں ''ٹھٹھے کے پاک عظیم مخدوم عبدالکریم بن مخدوم غلام حیدر کی صحبت کے بعد ایک بیرونی سیاح نے کہا کہ: میں نے سندھی میں ایسا داناء اور بلند پایہ فکر کا حامل ''پیر علی گوہر شاہ'' جیسا نہیں دیکھا۔

آپ کی وفات سے متعلق ایک قطعۂ تاریخ اس طرح ملتا ہے:

جناب پیر علی گوہر آن کریم و رشید
چوں رمز ''ارجعی'' ز درگہ فراز شنید
گذاشت جسم درین دام گاہِ نا سوتی
بہ سوئے گلشن لا ہوت مرغ جانش پرید
بتافت رخ ز ظہورات آن سراپا نور
بیافت معنی وسیرغ وش نہان گردید
دلم چون سال وصالش جست ہاتف گفت
چو بودہ در طلب رب قریب رب برسید

۱۲۶۳ھ

جس طرح ہم نے سندھی شاعری کا ایک مختصر انتخاب شاملِ مقالہ کیا ہے، لہٰذا مناسب ہے کہ ہم یہاں گوہر (اصغر) کی فارسی شاعری کا بھی ایک مختصر انتخاب پیش کردیں۔ یہ تو ہم عرض کر ہی چکے ہیں کہ پیر گوہر شاہ صاحبؒ کو نہ ہی طویل عمر عطا ہوئی اور نہ ہی سازگار ماحول ملا، اس وقت میں انگریزوں کی سازشیں اپنے عروج پر تھیں اس لیے گوہر شاہ پگارا کی مصروفیت کا زیادہ حصہ ادبی نوعیت اور اس میں بالخصوص شاعری پر مشتمل ہے۔

غزل

نرگسِ شہلاش را تیرافگن وخونی خطاب — از تبسم می کند با خستگان ہردم عتاب
نیست از امروز یا دیروز دلِ من مبتلا — شد اسیر این دل بدامِ زلفش از عہدِ شباب
اے دلا کے می رہی از پیچہائے زلفِ یار — کرہ اند انبوہ ہچون زنگیان با پیچ و تاب
صبر کن یکچند تا زلفش سرِ بالش رسند — بارفاقت حاجیان تو می شوی ہم کامیاب

''گوہرا'' از پیچ وتابِ زلفش درتابم چنان
مالک اندر شعلہ ہائے آتشم شد درعذاب

غزل

دلِ من برد ماہرو امشب   بُرد آرام تند خوامشب
در ہم محفل و ہمہ مجلس   بودش از حسن گفتگو امشب
دلم از درد آن مہِ پارہ   گشت دوار کو بکو . امشب
بہرِ دیدار آن پری رخسار   تگ و دو بود سوبہ سو امشب
از سرِ لطف آمدہ برمن   حال پر سید موبہ مو امشب
اے دل از آبِ صل دلبرِ خود   دفترِ درد ہا بشو امشب
حالِ دل را بآن شہِ خوبان
"گوہرا" گو تو رو برو امشب

غزل

یادِ سنبل عنبر افشان در برم آمد عجیب   از قدومِ رشکِ گل پر عطر شد خانہ غریب
دی بہ چشمِ لعل گون آمد برم آن صف شکن   باکمان و خنجر و شمشیر با شکلِ مہیب
دی شنیدم کان شہِ خوبان بسیرِ باغ رفت   چون روان گشتم چو سایہ در قفا آمد رقیب
ہست در قانون الشفا امر عشاقانِ وصال   کن علاج از وصلِ خود اے دردِ دلہا را طبیب
چند قطرہ شربتِ دیدار در حلقوم ریز   اے مسیحا در رسیدہ وقتِ جان کندن قریب
"گوہرا" در حلقۂ آن سیمبر گرمی رسی
طرفہ آن بخت اقبال است لیکن یا نصیب

غزل

بُردم ز غمش ہر گز نامد بعیادت   خوش قاتل پید است بیابید شہادت
وان کعبہ عرب است واین کعبۂ عجم شد   رندان بیائید در این خاص عبادت
ہر کس کہ بہ میخانہ در آمد و می خورد   واین طرفہ سیادت وہمان طرفہ سعادت
از سلطنتِ دہر بود افضل واعلیٰ   رندانِ صفا را کنی از صدق خدامت

"گوہر" تو بیا از صدفِ پستی بیرون
در تاجِ شرِ آفتی براین خطِ کرامت

غزل

مستان صبوحیم تکلف ز شرع نیست   از روزِ ازل بر من کارے زِ ورع نیست
واعظ بسکوت آنکہ عنم رند خرابات   جسمِ ز وجود است سرشتم زفرع نیست
از سروِ بصورت منگر صوفی پر کین   کاین سروِ سہی با کلہ کج زرع نیست
آمد چو طبیبے بسرم بہر دوائی   گفتم کہ غمِ عشقت علت زصرع نیست

"گوہر" چو یتیم است بود لائقِ آن شاہ
در تاجِ شہ افتاد اورا خوف و ورع نیست

غزل

دل زِ دیدارِ بتِ آن کافری در گردش است   در پے سلطان بتان چون چاکری در گردش است
چون صفائی آن مئے بینش در آمد در ظہور   ہر ملائک بر فلک نیلوفری در گردش است
زہد و تقویٰ و ورع بگزار زاہد نا بکار   در خراجات کہ دورے ساغری در گردش است

صورتِ آن ساقیِ گلفام چون آزر بدید　　　ازطفیلِ یک نظرآن بتگری درگردش است
قطرۂ عرق از رخِ آن گلرخ دریم فتاد　　　گردشِ گرادب ہم چون اختری درگردش است
مادرِدوان چون آن مہ روئے رازائیدہ است　　　ازنشاطِ آن پری دین مادری درگردش است
''گوہر'' گران مایہ گران قیمت شدہ درِ یتیم
پئے حقیری وے یتیم آن عزوری درگردش است

غزل

رخ آن سرو قد چون ماہتاب است　　　غلط گفتم قمر را دل کباب است
بہ کاکل بستہ چون گیسوئے خمار　　　چون لبلابِ دلم در پیچ و تاب است
چو مادرِ گیتی زادہ (این) پری را　　　سماع از عود با چنگ و رباب است
سر افگندۂ نرگس در چمن عیش　　　زشرمِ چشم آن شہ گربہ خواب است
کجا ''گوہر'' ز عشقت ہست خالی
زشوقت والۂ شیخ و شباب است

حواشی

(۱)　''مخزنِ فیضان''،صفحہ ۳۰۷-۳۰۹
(۲)　''مکتوبات حضرت مجدد الف ثانیؒ''اردو ترجمہ اور انتخاب
(۳)　''اصغر سائیں جو کلام''،تحقیق: پروفیسر شیخ محمد فاضل،ادارہ جمیعت علماء سکندریہ جامعہ راشدیہ،درگاہ حضرت پیر صاحب پاگارا(پیر جو گوٹھ)مطبوعہ:۱۹۹۹ء

پیر سید حزب اللہ شاہؒ (م، ۱۳۰۸ھ) پیر پگارا، سوم
المعروف بہ ''تخت دھنی''
المتخلص، مسکین

پیر سید حزب اللہ شاہؒ ۱۸، شوال ۱۲۵۸ھ کو پیدا ہوئے۔ انھوں نے ''جیسلمیر'' سے ایک سنگِ مرمر کا تخت بنوایا اس کے ان کا لقب ''تخت دھنی'' ہوا، اس کے معنی صاحب تخت ہے اسی لیے آپ کو 'مسند دھنی' (صاحبِ مسند) بھی کہا گیا۔ اور آپ ترتیب کے اعتبار سے اس خاندان کے تیسرے پیر پگارا ہیں، آپ بچپن ہی میں اپنے والد سے بیعت ہوئے اور کہا جاتا ہے کہ ابھی ان کی عمر طفلانہ تھی یعنی صرف پانچ برس کے تھے کہ سایۂ پدر سے محروم ہوئے اور یوں انھیں جانشین وسجادہ نشین بنایا گیا۔ جیسا کہ اس سے قبل عرض کیا گیا کہ گوہر شاہ پگاراؒ کو انگریزوں کی چال بازی اور جال سازی کا سامنا تھا اور انھوں نے زیادہ وقت اسی کی سرکوبی کے لیے صرف کیا، لیکن زیادہ عمر نہ پائی۔ مگر اس کے مقابلے میں پیر حزب اللہ شاہؒ نے اپنی حر جماعت کو زیادہ بہتر انداز میں منظم اور فعال کیا۔

ان کے والد خود بھی عالم، فاضل، خطیب، عاشق، عارف، اور شاعر تھے انھوں نے اپنے بیٹے کی تربیت اس وقت شروع کی جب بیٹے کی عمر چار سال تھی، انھوں نے خود سبق دیا۔ جب آپ کو سجادہ نشین کیا گیا تو آپ کے چچا حیات تھے اور جماعت ان پر جان فدا کرنے پر تیار تھے، بڑے خلیفہ جو علم وفضل میں یگانہ روزگار کہے جاسکتے تھے وہ بھی زندہ تھے، اور سب نے سجادہ نشینی کے لیے آپ کو انتخاب خوشی کے ساتھ کیا۔ خلیفہ نبی بخش لغاری جو بڑے فاضل آدمی تھے انھوں نے ایک دن دیکھا کہ صاحب زادے اور دوسرے نوکر ایک ساتھ بلبلوں سے کھیل رہے ہیں۔ خلیفہ نے با آوازِ بلند کہا ''اے نمک حراموں تم لوگ پر سائیں کو چھوٹا بچہ سمجھ کر کھیل رہے ہو لیکن اس پگارے میں وہ لیاقت اور ذہانت ہے کہ جو زندہ ہوں گے وہ دیکھیں گے۔''

خلیفہ نبی بخش جیسے دور اندیش اور صاحب علم شخصیت کے ہوتے ہوئے بھی پیر حزب اللہ شاہؒ کی تعلیم وتربیت کا انتظام اخوند میاں محمد بخش عرف ملاں مموں کے سپر ہوا یہ اخوند لاڑکانہ سے تعلق رکھتے تھے، بعد میں درگاہ سے واسطہ رہا۔ پیر صاحب پگارا سے ان کا مخلصانہ ومریدانہ تعلق تھا۔ روزانہ پڑھائی کے سلسلے میں پیر صاحب کے چچا میاں علی حیدر شاہ نے بھی

بھرپور توجہ رکھی اور ہر طرح سے اپنے بھتیجے کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہے کہتے ہیں کہ وہ اپنے بھتیجے پر عاشق تھے، بہرحال پیر پگارا کی پڑھائی کا سلسلہ جاری رہا اخوند صاحب کے پاس مکتبی تعلیم مکمل ہوئی اور اس کے بعد مولوی محمد عیسیٰ ٹھاروشاہی نے مزید فارسی تعلیم دی اور پندرہ سال کی عمر تک پڑھاتے رہے مکتبی علم سے فارغ التحصیل ہونے کے بعد آپ نے مطالعے کے شوق کو برقرار رکھا اور متعدد علوم حاصل کیے اور کئی زبانوں پر عبور بھی حاصل کیا، اپنی خداداد صلاحیت سے فارسی میں تو اعلیٰ درجے کی قابلیت حاصل کی۔ منتہیان کرام، علماء کرام، اہلِ قلم، اہلِ نظر، اہلِ دل اور شاعروں کی صحبت نے آپ کے علمی ذوق اور ادبی رجحان کو خوب فروغ دیا یعنی مکتوبی علم کے بعد ملفوظی علم یا مجلسی علم بھی آپ کو خوب حاصل رہا جس کے نتیجے میں آپ فارسی کے ایک اعلیٰ شاعر کی حیثیت سے پہچانے گئے۔

''مخزنِ فیضان'' کے مصنف نے آپ کی بابت لکھا ہے:

''باوجود بر صغیر سن ہونے کے آپ نے اپنی کثیر التعداد جماعت پر مؤثر کنٹرول قائم رکھا اور معاملات بڑی دانشمندی سے چلاتے رہے۔

آپ کے والد ماجد کے غیرت مندانہ رویہ کے باعث حکمران انگریزان کی جانب سے بھی غیر مطمئن تھے، وہ آپ کو اپنے اقتدار کے لیے ایک خطرہ تصور کرتے تھے، چناں چہ انگریزوں نے آپ کو اپنے زیر اثر لانے کے لیے متعدد تدابیر اختیار کیں، لیکن بے سود رہیں، جب آپ کسی چال میں نہ آئے تو انگریز حکام نے آپ کو نظر بند کرنے کا فیصلہ کیا، تاہم ان کے لاکھوں سرفروش مریدوں کے جذبۂ جاں نثاری کو دیکھتے ہوئے ان کو یہ جرأت نہ ہوئی کہ ان پر ہاتھ ڈالیں۔ پیر صاحب حزب اللہ علیہ الرحمہ بدستور اپنی آن پر قائم رہے۔ انھوں نے انگریزوں کی جانب توجہ تک مبذول نہ فرمائی، ہر وقت اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت اور جماعتی معاملات میں منہمک رہتے تھے۔ انہی حالات میں بیس برس گذر گئے۔ بالآخر ۱۲۸۴ھ میں انگریزوں نے آپ پر قابو پالینے کی خاطر ایک گھناونی سازش تیار کی، انھوں نے میر مراد علی خان والی ریاست خیر پور سے آپ کے خلاف قتل کا ایک جھوٹا مقدمہ خیر پور کی عدالت میں دائر کرایا، تا کہ آپ کو ہراساں کر کے اپنے سامنے جھکایا جا سکے یا عدالت سے سزا دلوا کر قید کیا جا سکے، آپ نے انگریزوں کی اس سازش کا بھی مردانہ وار مقابلہ کیا، چوں کہ مقدمہ جعلی اور

گواہ مصنوعی تھے۔انگریز اور میر مراد علی خان یہ مقدمہ ہار گئے، پیر صاحب پاگارا کامیاب و سرخرو رہے۔

انہی دنوں انگریز سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قابض ہو چکے تھے، سندھ اور پنجاب میں آمدورفت کا سلسلہ بہ حال ہو چکا تھا، پیر صاحب حزب اللہ نے اپنے چند سر برآوردہ مریدوں کو پیر کوٹ سدھانہ بھیج کر درگاہ مبارک پیر سید عبدالقادر آخرینؒ کے سجادہ نشین پیر سید امیر الدین شاہؒ جیلانی کو اپنے یہاں دعوت پر مدعو کیا۔انھوں نے یہ دعوت بہ خوشی قبول فرمائی، اور اپنے بڑے فرزند پیر سید محمد شاہ ثانیؒ کو دعوت میں شریک ہونے کا حکم فرمایا۔اس وقت پیر سید محمد شاہ ثانی جیلانی کی عمر تقریباً بارہ برس تھی۔آپ اپنے والد ماجد کے حکم کی تعمیل میں پیر گوٹھ پہنچے۔حضرت سید حزب اللہ شاہؒ آپ کی تشریف آوری سے نہایت مسرور ہوئے اور بڑے ادب و احترام کے ساتھ ان کا شایانِ شان استقبال کیا۔پیر سید محمد بقا شہیدؒ کے بعد مرشد خاندان سید عبدالقادر آخرین اور مرید خاندان راشدیہ کی یہ دوسری ملاقات تھی، صاحب زادہ سید محمد جیلانی شاہ ثانیؒ نے پیر گوٹھ میں ایک مرتبہ نمازِ جمعہ بھی پڑھائی اور حاضرین کو نہایت فصیح و بلیغ انداز میں خطاب فرمایا، اس سے حاضرین بے حد محظوظ اور مستفیض ہوئے۔"(۱)

سیاسی صورتِ حال بھی کچھ اچھی نہ تھی جیسا کہ ۱۸۴۳ء میں تالپور حکومت کے خاتمے اور سندھ پر انگریزوں کے قبضے کے بعد یہاں کہ سیاسی ماحول میں ایک افراط و تفریط نمایاں تھی ہر طرف انارکی کی کیفیت واضح تھی ہندوؤں نے وفاداریاں تبدیل کر لیں تھی انتظامی سلطنت میں تبدیلی کی وجہ سے مسلمان شدید متاثر تھے، جس کی وجہ سے بہت زیادہ متفکر بھی تھے۔اور اس طرف چند مسلمانوں کی سازشوں سے بھی نقصان کا اندیشہ تھا۔اس بات کو تبسم چودھری نے اس طرح بیان کیا ہے:

"(۱) انگریزوں نے سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد شمالی مغربی سرحدی علاقے کے بااثر اور حریت پسند طبقہ کو زیادہ نقصان پہنچایا تھا، اور پنجاب اور افغانستان کا خوف دلا کر اس علاقے پر اپنے مکر و فریب سے قبضہ کر لیا تھا، پھر اس کے بعد جیکب آباد اور شکار پور میں اہم چھاؤنیاں قائم کر دی تھیں، جس کا

مقصد یہ تھا کہ یہ حریت پسند طبقہ انگریزوں کے خلاف قدم نہ اٹھا سکے، لیکن جب برصغیر میں انقلاب آرزادی کی لہر اٹھی تو اس علاقے کے غیور اور بہادر لوگوں نے انگریزوں کے خلاف سب سے پہلے اعلانِ جنگ کیا۔

(۲) خان گڑھ (جیکب آباد) شکار پور، کراچی اور حیدرآباد، انگریزوں کے قبضے سے پہلے بہت بڑی تجارتی منڈیاں تھیں لیکن انگریزوں کے منحوس قدم پڑنے کے بعد شکار پور اور جیکب آباد کی حیثیت ان کے سیاسی اغراض کی وجہ سے بالکل ختم ہوگئی اور انگریزوں کی سر پرستی میں ہندوؤں نے ساری تجارت پر قبضہ کرلیا، چناں چہ یہی بات انگریزوں کے خلاف نفرت کا باعث بنی، اب جہاد آزادی میں شمالی مغربی سندھ کے لوگوں نے بھر پور حصّہ لیا۔

(۳) سندھ پر قبضہ کرنے کے بعد انگریزوں نے اپنے سیاسی مفادات کی تکمیل کے لیے ہندوؤں کی بے جا سرپرستی شروع کردی، اس سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی حق تلفی کا شدت سے احساس پیدا ہوا اور انھوں نے انگریزوں سے بدلہ لینے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

(۴) سید احمد شہید کی تحریک مجاہدین کا ایک بہت بڑا مرکز پیر گوٹھ تھا، چناں چہ اس تحریک کے اثرات جو مذہبی اور سیاسی دونوں حیثیتوں سے مسلمانوں کے عین مزاج کے مطابق تھے۔ وہ بدستور زندہ تھے، اور حضرت پیر صاحب پگارا کے خاندان کے معزز افراد اس کی پرورش کررہے تھے۔ چناں چہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ان اثرات نے بہت بڑا کام کیا۔'' (۲)

ہم نے اپنے زیرِ نظر مقالے میں ان بزرگوں کے حالات و واقعات ضبطِ تحریر میں لاتے ہوئے سیاسی حالات کا بالخصوص تجزیہ پیش کیا ہے اگر چہ ہم نے ان بزرگوں کی دینی خدمات کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ دینی خدمات میں سیاسی حالات کا پیش کرنا طوالت یا غیر ضروری بحث نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ اقبال نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یعنی سیاست میں دین کو اور دین میں سیاست کو بڑا دخل ہے۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب صلح حدیبیہ کا معاہدہ کیا تو یہ خود ایک سیاسی فیصلہ تھا۔ جس کے اثرات بہت جلد ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے، اس لیے سیاست کو دین سے اور دین کو سیاست سے علیحدہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس ضمن میں شاہ حزب اللہ شاہؒ کی محنت، قربانی، اور جذبۂ دین و وطن کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جن کی سرپرستی میں حروں کے رجحان نے انگریزوں کے خلاف ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی تھی اور انگریزی حکومت نے بھی پیر پگارا کے خلاف منظم طور پر سازشیں اور کاروائیاں شروع کر دیں تھیں۔ اس دور میں مذکورہ جماعت کے ہر فرد کو بڑے امتحانات سے گزرنا پڑا انگریزوں کی شرط یہ تھی کہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول کے احکامات کی تبلیغ کو ترک کر دیں اور انگریز کو بہ حیثیت حاکم قبول کر لیں لیکن یہ شرط اس جماعت اور اس کے سربراہ کے لیے قابلِ قبول نہیں تھی، چناں چہ انھوں نے اس شرط کو تسلیم نہ کرنے کی بہت بھاری قیمت ادا کی کہیں مختلف اذیتوں کو برداشت کیا۔ کہیں جلاوطن ہونا پڑا۔ کہیں گھربار سے دور رہ کر جنگلوں اور ویرانوں میں گزارا کرنا پڑا۔ اعجاز الحق قدوسی نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے:

> ''حر جماعت کے بہت سے افراد کو جلاوطنی کی صعوبتیں جھیلنا پڑیں۔ حر جماعت کے با اثر افراد کو دیسا پور ضلع احمد نگر جلاوطن کر دیا گیا۔ آزمائشی کیمپوں کا سلسلہ جاری کیا گیا اور فوج اور دوسری ملازمتوں میں سندھیوں کا تقرر بند کر دیا گیا۔'' (۳)

لیکن سارا انصاری نے اپنی تصنیف میں (صفحہ:۸۶) پیر حزب اللہ شاہؒ کی عادت و اطوار، رہن سہن، اندازِ گفتگو، نشست و برخواست، پر کسی قدر تنقیدی پیرائے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ لیکن اس تحریر کے پس منظر میں پیر حزب اللہ شاہؒ کی تحریک کو بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ نیز گدی نشین کے لیے خطرات و خواہشات پر بھی ایک رائے قائم کی جا سکتی ہے، لہٰذا ہم مذکورہ مصنف کی کتاب سے استفادہ کرتے ہیں:

> ''پیر پگارا کی آمدن کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک عالیشان مزار تعمیر کیا گیا دو بڑی مسجدیں 'آبائی' گاؤں پیر جو گوٹھ میں کئی قلعہ نما رہائش گاہیں یا محلات، پیر حزب اللہ شاہؒ کا لباس بھی شاہانہ ہو گیا، انھوں نے 'کلونگی' پہننا رائج کیا اور پیروں کی طرح ایک تاج نما ٹوپی بھی۔ ان کے شوق اور دل چسپی میں دنیاوی اثر دکھائی دینے لگا۔ مثلاً: ہاتھی کی سواری، شکار، تیر اندازی، وغیرہ۔ رفتہ رفتہ اپنے لیے ایک تخت بنوایا اور تخت دھنی کا لقب اختیار کیا گدی کی اس نئی شان و شوکت نے حروں کی

گدی سے وفاداری میں مزید اضافہ کردیا۔

جیسے جیسے حروں میں خوداعتمادی بڑھتی گئی اور ان کے عقائد پختہ ہوتے گئے وہ صوبے کے دیگر رائج العقیدہ مسلمانوں کی مخالفت اور تنقید کا نشانہ بننے لگے۔ رفتہ رفتہ پیر صاحب کے لیے یہ مسئلہ بن گیا۔ اور انھیں عوام کے اعتراضات کا جواب دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ لوگوں کے نزدیک حروں کا عام لوگوں کے ساتھ کھانے پینے سے انکار قابلِ اعتراض تھا۔ ان کی برادری کو بھی شک کی نظر سے دیکھا جا تا تھا، اور ایک نفرین آمیز افواہ یہ پھیلی ہوئی تھی کہ حروں کی مسجد کا رخ مکہ معظمہ کی بجائے پیر جوگوٹھ کی طرف تھا، نکتہ چینوں کی نظر میں اس سے بڑھ کر کوئی بدعت نہیں ہوسکتی تھی۔ حروں کے ایسے تاریکی میں گھر جانے پر پیر حزب اللہ شاہؒ کی ہمہ وقت ملاحت ہوتی رہتی۔ بالآخر انھیں سرِ عام حروں کے عقائد اور رسوم کی تردید کرنی پڑی، البتہ عملی طور پر اس تردید کا حروں پر کوئی اثر نہ پڑا، اور انھوں نے یہ ماننے سے انکار کردیا کہ پیر صاحب نے انھیں کسی طرح مسترد یا رد کردیا ہے اور یہ دلیل دی کہ پیر صاحب نے جو کچھ کہا ہے انگریزوں کے زیرِ اثر کہا۔ درحقیقت یہ ان کے دل کی بات نہیں لہٰذا یہ الفاظ ماننا ضروری نہیں۔ نیز نقصان رساں مریدوں کو غلط مشورہ دینے کا موردِ الزام ٹھہرایا۔ رفتہ رفتہ حر یہ محسوس کرنے لگے کہ صرف اور صرف وہی پیر صاحب کے مفاد سے واقف ہیں، ان کی (حروں کی) ذمہ داری ہے کہ انھیں نقصان رساں مشیروں کے اثر سے آزاد کرایا جائے۔ اس سلسلے میں کچھ غیر حر خلفاء قتل کردیا گیا، حر برادری ان قاتل حروں کو غازی اور مجاہد کا درجہ دینے لگی۔ اور ان کو گرفتاری سے بچانے کے لیے بھرپور کوششوں میں مصروف ہوگئی۔"(۴)

یہ تلخ بات ضرور ہے مگر حقیقی تصویر کا ایک رخ ہے۔ تحقیق میں ضروری ہے کہ تصویر کے دونوں رخوں کو پیش کردیا جائے سارا انصاری نے یہ بات بغیر حوالوں کے درج نہیں کی بلکہ ہر بات کی تصدیق کے لیے مآخذ کی نشاندہی کی ہے۔ دوسری طرف ہم یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ ۱۸۹۰ء کی دھائی میں انگریزوں کو یہ یقین ہو چلا تھا کہ حر خود گدی نشین یعنی پیر پگارا کے لیے خطرہ بن سکتے ہیں۔ پیر صاحب کا اثر رسوخ ان کے مریدوں کی حمایت میں تھا، اس کے باجود انگریزوں نے انھیں اپنے فرائض ادا کرنے پر مجبور کیا جس سے پیر صاحب نے بھی اندازہ لگالیا کہ حروں کی حرکات ایک ایسے مرحلے میں

داخل ہوگئیں ہیں جس سے انگریزوں کی ناراضی بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے، اس کی روک تھام کے لیے مذکورہ کتاب میں ایک ایسا اندازِ تحریر برتا گیا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ حزب اللہ شاہؒ کی حمایت اور وفاداری انگریزوں کو حاصل تھی۔

''افسران کا انحصار تعلقات پر تھا، جس کی بنیاد ۱۸۵۰ء میں اس وقت رکھی گئی، جب پیر جو گوٹھ کو ضلع روہڑی کا حصہ بنادیا گیا، یہ فیصلہ اس تنازعہ کا نتیجہ تھا جو پیر صاحب اور میر خیر پور کے درمیان فتح سندھ کے وقت اٹھا۔ اس وقت پر صاحب وہ ناجائز اور خلاف قانون حرکات منظر عام پر لے آ چکن کے ذریعہ میر خیر پور نے اپنے بھائی کے ریاست پر قبضہ کر یا تھا، پیر صاحب اس خدمت کے معاوضہ میں انگریز کی حفاظت میں رہنا چاہتے تھے اور خاص طور پر اپنے بالائی مسکن کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔'' (۵)

لیکن اعجاز الحق قدوسی نے اس خاندان کو متعدد جگہ ''مقدس خاندان'' لکھا ہے۔ مثلاً: تاریخ سندھ صفحہ ۱۶۱ پر بھی ہے ''ادھر سندھ کی عوام بھی انگریزوں کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے، اور خاندان پیر پگارا ان کی راہ نمائی کر رہا تھا اس لیے یہ مقدس خاندان انگریزوں کی نظر میں کانٹے کی طرح کھٹکتا تھا۔''

دینی خدمات

''مخزنِ فیضان'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ حضرت پیر سائیں حزب اللہ شاہؒ (تخت دھنی) علم وفضل میں بلند مقام کے حامل تھے۔ علمِ قرآن وحدیث میں مہارت تامہ رکھتے تھے، آپ نے سندھی زبان میں قرآنِ مجید کی تفسیر لکھوائی۔''

اس تفسیر کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ صرف آپ کے ایما پر ہی نہیں لکھی گئی بلکہ جب یہ تفسیر کمال وتمام ہوئی تو آپ نے اسے ازسرِ نو خود دیکھا اور ضروری ترمیم اور اضافے پر توجہ دلائی یہ تفسیر ''تفسیر کوثر'' کے نام سے لکھی گئی تھی۔ جو آپ کے فرزند پیر شاہ مراد شاہ اوّل نے شائع کی تھی اور مفت تقسیم کی تا کہ خاص وعوام اس سے استفادہ کر سکے۔

آپ کے والد نے اپنے دور میں ایک چھوٹی سی مسجد تعمیر کرائی تھی جو اپنی سادگی اور حسن میں نمایاں تھی۔ پیر حزب اللہ شاہؒ نے اس جگہ کو بڑھاتے ہوئے مسجد کو توسیع دی اور ایک خوبصورت جامع مسجد تعمیر کرائی۔ یہ مسجد فنِ تعمیر میں اپنی مثال آپ ہے جسے دیکھنے کے خواہش مند دور دراز علاقوں سے آتے ہیں اور دادِ فن دیتے ہیں جس پر گل کاری، پچی کاری، اور خطاطی سے در و دیوار، ستون ومنبر کو منقش کیا گیا ہے۔ اس کے لیے پتھر کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے ''جیلسیر'' سے پتھر

منگوایا گیا، اور قرآنی آیات کو ان پتھروں پر اس خوب صورتی سے منقش کیا گیا ہے کہ وہ اپنی مثال آپ کہے جاسکتے ہیں۔

اس مسجد میں آپ نے ایک مدرسہ بھی قائم کیا جو تعلیم و تربیت کے فروغ کے لیے خود ایک تاریخ کا حامل ہے، اس مدرسے کو تادیر پیر صاحب کی سرپرستی حاصل رہی جس کی وجہ سے اس کی تنظیم اور کام کو نہایت قدر کی نظر سے دیکھا گیا ہے۔ اس مسجد اور مدرسے کے تعلق سے آپ نے ایک خلقت سے رابطہ رکھا جس کے فیض سے لاکھوں بندگانِ خدا کو راہِ راست ملی اور جوق در جوق لوگ اس دائرہ ارادت منداں میں داخل ہوتے چلے گئے اور ان میں سے بہت سوں کی کایا پلٹ گئی۔

اب ہم پیر صاحب پگارا کی دینی خدمات کو نکات کی صورت میں پیش کریں گے۔

(۱) جیسلمیر کی سرزمین بھی آپ کے فیض روحانی اور نورِ ولادت سے بہرہ ور اور منور ہوئی ،وہاں کی ہندو برادری ''سلاوٹ'' کے تمام افراد نے آپ کے ہاتھ پر مسلمان ہو کر بیعت کی ،اس برادری کے بہت سے لوگ آج کل کراچی اور حیدرآباد میں موجود ہیں۔

(۲) مختلف مواقع پر اپنے مریدوں سے خطاب کرنا جس میں اسلام کی محبت اور اخوت کا درس دینا۔

(۳) باعلم مریدوں کو پابند کرنا کہ وہ دیگر مریدوں میں دینی تعلیم کو عام کرنے اور علمی نکات کو سمجھانے کے فرائض انجام دیں۔

(۴) دینی نقطہ نظر کے مطابق انصاف کے تقاضے پورے کرنے کے لیے اکثر خود لوگوں کی شکایات سنتے اور عدل کے ساتھ فیصلہ دیتے۔

(۵) روضے کی پہلی عمارت کچھ چھوٹی تھی اور جلدی بنی تھی آپ نے اس کی توسیع فرمائی اور سنہری گنبد کے ساتھ کشادہ روضہ تعمیر کروایا، جو ایک مدت قائم رہا مگر بعد میں دیواروں میں شگاف آگئے جسے موجودہ پیر پگارا نے ازسرِ نو تعمیر کرایا۔

(۶) آپ کو انتہائی سخی اور فراخ دل بتایا گیا ہے، سنت کے مطابق آپ کے پاس سے کوئی سائل

خالی ہاتھ نہ لوٹتا تھا، اگر کچھ موجود نہ ہوتا تو فوری طور پر کسی سے کچھ لیکر سائل کی حاجت پوری کر دیا کرتے تھے۔ اور پھر یہ رقم جس سے لیتے تھے اسے واپس کر دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ کے پاس مال کبھی جمع نہ ہوتا تھا۔ آپ اکثر اوقات یہ مسنون دعا پڑھتے رہتے تھے۔ "اللّٰھُمَّ احینی مسکینا وا متنی مسکیناً وا حشرنی فی زمرۃ المساکین"

(۷) آپ نے اپنی جماعت کو توحید اور توکل شرعی اطاعت اور دین کی خدمت کی تلقین دی جامع مسجد جب تیار ہوئی تب خود آ کر نماز پڑھاتے تھے ارادت مندوں کو ذکر کی تلقین کرتے تھے، اس تلقین سے بہت سے لوگ ذکر میں مشغول ہو گئے، اللہ اور اس کے رسول کے سچے عاشق کے طور پر سامنے آئے۔ کچھ فقیر جنھوں نے آپ سے ذکر کی تربیت پائی اور لمبی عمر پائی وہ آخری وقت تک آپ کے روحانی فیوض و برکات کے علم بردار رہے۔ ان پر آپ کی تربیت کا ایسا اثر تھا کہ جب یہ لوگ اپنے مرشد کا ذکر کرتے تو آپ دیدہ ہو جایا کرتے تھے، اس درسِ عام اور توجہ خاص کی وجہ سے جماعت میں بہت اضافہ ہوا اور یہ خطہ روحانی تعلیم و تربیت میں بڑا ممتاز رہا۔ آپ کی دینی خدمات میں سب سے افضل اور اہم یہ ہے کہ آپ نے انگریزوں کی درونِ خانہ مخالفت جاری رکھتے ہوئے حروں میں جہاد کا جذبہ بیدار کیا۔ اسلام میں جہاد کا مقام بڑا افضل ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی اور نیکی کیا ہوگی۔ قرآنِ پاک میں سورۃ آل عمران (آیت ۱۴۶) میں انبیاء علیہم السلام کے ساتھیوں کی مشکل پسندی اور تڑپ کا ذکر آتا ہے۔ جس میں جہاد کے بارے میں بھی فرمایا گیا ہے۔

وَ كَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ
فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا
ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ

ترجمہ: اور کتنے ہی انبیا علیہم السلام نے جہاد کیا، ان کے ساتھ بہت سے خدا والے تھے، تو وہ نہ سست پڑے ان مصیبتوں سے جو اللہ کی راہ میں انہیں پہنچیں اور نہ کمزور ہوئے اور نہ دبے اور صبر والے لوگ ان کو محبوب ہیں (یہاں صبر، ہمت اور عشق والوں کا ذکر ہے۔ ورنہ وہ علم حکمت یا فلسفہ جو صرف سوچنا سکھائے اور عمل کے لیے آمادہ نہ کرے، محض مردود ہے۔)

☆☆☆

آپ اپنے ارادوں اور منصوبوں میں کامل تھے اس لیے ہر مشکل وقت میں قدرت نے آپ کی مدد فرمائی اس سے متعلق ایک واقعہ ''مخزنِ فیضان'' کے صفحہ ۲۱۴ پر درج ہے۔

''اتفاقاً ایک ایسا افسوس ناک واقعہ رونما ہو گیا کہ انگریز حکام خوش ہو گئے، انہیں پیر سید حزب اللہ شاہؒ پر پگارا پر ہاتھ ڈالنے کا ایک بہانہ مل گیا۔ وہ یہ سوچ کر خوش ہوئے کہ اب یہ پیر ہماری گرفت سے بچ نہیں سکے گا۔ ہوا یوں کہ خاندانِ راشدیہ کی دوسری شاخ کے بانی پیر سید محمد یسٰین شاہؒ جھنڈے والے کے سجادہ نشین پیر فضل اللہ شاہؒ کو پیر صاحب پگارا کے دو مریدوں (غلام نبی لغاری اور احمد) نے اپنے طور پر قتل کر دیا۔ وقوعہ قتل کے بعد غلام نبی لغاری تو فرار ہو گیا مگر احمد کو گرفتار کر لیا گیا۔ جھنڈے والے پیر رشید الدین شاہ اور انگریزوں نے قتل کے اس مقدمے میں پیر سائیں حزب اللہ شاہؒ کو ملوث کرنے کی بڑی کوشش کی لیکن عدالت میں کا کوئی ثبوت پیش نہ کر سکے۔ پیر سید حزب اللہ شاہؒ اس مقدمے سے با عزت بری ہو کر سرخرو ہوئے۔ عدالت نے قاتل احمد کو سزائے موت سنائی اور اس کو پھانسی دے دی گئی۔ انگریز اس دفعہ بھی سید حزب اللہ شاہؒ کو پھنسانے میں ناکام رہے۔''

آپ ۴۵ برس سجادہ نشین رہنے کے بعد بعمر ۵۰ سال بتاریخ ۴ محرم ۱۳۰۸ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۹۰ء اس دارِ فانی سے عالمِ جاودانی کو رخصت ہوئے۔ آپ کے انتقال پر مولوی بہاؤالدین بھائی کا ایک قطعۂ تاریخ (فارسی) قابلِ مطالعہ ہے جس کا عنوان ''مردِ شوق خدا'' سے عدد ۱۲۵۵ برآمد ہوتے ہیں جو پیر صاحب کی سالِ ولادت کی طرف اشارہ کرتے ہیں لیکن اصل میں حضرت پیر صاحب کا سالِ ولادت ۱۲۵۸ھ ہے۔ اس کے علاوہ بعض نکات قطع کے حواشی (سندھی) سے ظاہر ہوتے ہیں، لہٰذا اب یہاں یہ قطعۂ دروفات حضرت پیر صاحب پیش کیا جاتا ہے۔

مولوي بهاءالدين ٻهائيءَ جو چيل قطعه تاريخ

قطعه بتاریخ در وفات حضرت پیر صاحب صاحبِ دستار
آں در روزِ وفات بحاضری دربار گفته شد

جناب صاحبِ دستار پیر حزب اللہ   ولیِ کامل و مردِ خدا و پیرِ جہان
سخی و صاحبِ سجّاده و سلیم القلب   و فیِّ و وافی و واقف ز رازہائے نہان
ہمه خصالِ حمیدهٔ ازو کمال گرفت   سخا و شرم و وفا و مروّت و احسان
چه صورتیکه ہزاران ہزار معنیٰ داشت   چو او نزاد نزاید ز مادرِ دوران
بدر کشید ہمه خلق از خودی بخدا   چو گشت ساقیِ جامِ محبتِ یزدان
به صبر و شکر و رضا و توکل و تسلیم   به عشق و شوق و محبّت مدام با وجدان
شده است وردِ زبان لا اله الا اللہ   بہر کجا که به بینی از و لبعا لمیان
جہان و ہر چه درو عاشقِ جمال شده   ز جان و دل دل و جان ساخته برو قربان
ز ملکِ سند چه گویم که تا ممالکِ ہند   اسیرِ دام کرمہائے اوست پیر و جوان
ز برقعِ بشری رُخ نمود شاہدِ غیب   ہزار غمزه ہمی زد بصورتِ انسان
چون شاعران نه در ینجا مبالغت کردم   بھائیا! سخنِ راست گفتم از دل و جان
قلم قصیر ز تحریرِ نیک اوصافش   ز صد ہزار یکی کم توان نمود عیان
پئی تولّدِ او سالِ "مردِ شوقِ خدا"[1]   بروز آزمهٔ شوال ہژدہم می خوان
بظہر چارمِ عاشوره نیک روزِ خمیس   ازین جہان بجہانِ جنان کشید عنان

[1] "مرد شوق خدا" جو عدد ۱۲۵۵ ٿين ٿا (؟)، حالانڪ حضرت پير صاحب جن سال ۱۲۵۸ھ ۾ تولد ٿيا.

زرویِ خود چو منوّر نمود جنّت را — بگفت سالِ وصالش خرد "چراغِ جنان"
جہاں ز نورِ رخش دور تیرہ تر گردید — کشید سر ز ملک صد ہزار آہ و فغان
چناں محبّتِ او جا گرفت در دلہا — کہ زار زار بہجرش گریست خرد و کلان
بہجر او دلِ زارم چہ خاک خاک شدہ است — چہ گویم از غمِ پنہاں خدا گواست بر آن

بھائیا! چو چنیں بود ارادتِ مولیٰ
خموش باش و صبوری گزیں، مشو نالان

هن ُقطعهُ جي عنوان واري عبارت مان معلوم ٿئي ٿو ته پير صاحب جن جي وفات واري ڏينهن 'ٻڪائي' درگاه تي موجود هونداتي شيهيءَ 'قطعهُ' منظوم ڪيا ٿين. وفات جو وقت اڳين نماز خميس ڏينهن تاريخ ڇهين محرم، ڄاڻايو اٿس. وفات جو سال "چراغ جنان" (جنت جو ڏيو) مان ١٣٠٨ھ نڪري ٿو.

علمی خدمات

پیر حزب اللہ شاہؒ روحانی تعلیم کے ساتھ ساتھ دنیاوی تعلیم میں یگانہ روزگار تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور میں اہلِ علم اور اہلِ قلم لوگوں کو خوب نوازا اور ان کی ہمیشہ دل سے قدر کی جس کی وجہ سے حلقۂ علم وادب میں پیر صاحب پگارا کو بڑی قدر کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ انھوں نے شعر بھی کہے اور مختلف علمی وادبی محافل میں شعر سنائے بھی اسی طرح اچھے شعر کو پسند کیا اور تخلیق کار کو داد اور تحسین سے اس طرح نوازا کہ گویا اسے سند مل گئی ہو۔ پیر صاحب کے اپنے اشعار میں بڑی پختگی، سنجیدگی اور عالمانہ نکات دیکھے گئے ہیں۔ انھوں نے ایک دیوان ''دیوانِ مسکین'' (فارسی) یادگار چھوڑا ہے، جو ۱۹۸۵ء میں جمعیت علماء سکندریہ درگاہ شریف پیر جو گوٹھ، ضلع خیر پور سے شایع ہوا ہے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اس دیوان پر ایک شاندار اور مفصل مقدمہ قلم بند کیا ہے جس سے ان کی زندگی کے بہت سے اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ قربان علی سکندری نے ۴ فروری ۱۹۸۵ء کو اس دیوان سے متعلق ''احوالِ واقعی'' کے عنوان سے ایک تحریر قلم بند کی ہے جس کا ترجمہ اس طرح ہے:

> ''طریقت شریعت کے سفیر حضرت پیر سائیں سید حزب اللہ شاہؒ مسکین (تخت دھنی) (تیسرے پگارا) کا فارسی کلام ترجمے کے ساتھ پیش خدمت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ۱۹۸۳ء میں جناب منشی محمد پریل صاحب اور فقیر خلیفہ عبداللہ کی ترغیب اور تائید پر جمعیت علماء سکندریہ، دیوان مسکین کی اشاعت کا فیصلہ کیا اسی وقت محترمی مترجم صاحب کے پیش نظر صرف ایک نسخہ جامع راشدیہ کا موجود تھا، بعد میں محترم ممتاز سومرو صاحب (روہڑی والے) کا نسخہ اور ڈاکٹر عباس علی صاحب گھمرو کا نسخہ ملا۔
>
> ممتاز صاحب والا نسخہ سادہ خط میں نسبتاً مکمل تھا جب کہ گھمرو صاحب کا نسخہ اچھا تھا مگر ناقص تھا، (غالباً شکستہ یا کرم خوردہ ہوگا) ان نسخوں کو سامنے رکھ کر جناب پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے پہلی بار دیوان مسکین کا متن تیار کیا جو کتابت کے لیے دیا گیا۔ خاصی کتابت مکمل ہونے

کے بعد جناب پیر علی شاہ لکیاری مرحوم کا نسخہ ان کے بیٹے سید عبداللطیف شاہ سے محترم پروفیسر شیخ محمد فاضل صاحب، عبدالرحمٰن صاحب مہیسر کی معارف ملا اسی موقع پر ملا الٰہی بخش سومرو (پیر گوٹھ والے) کا نسخہ بھی دریافت ہوا۔

پیر علی شاہ مرحوم کا نسخہ درگاہ شریف کے قدیم منشی محمد رحیم راجڑ کا لکھا ہوا تھا منشی صاحب محمد پریل کے بقول یہ نسخہ صحت کے اعتبار سے تمام نسخوں کے مقابلے میں اہم ہے۔ اسی لیے مفتی محمد رحیم صاحب اور پروفیسر شیخ محمد فاضل صاحب کی وساطت ست دوبارہ دیوان کے متن اور مختلف نسخوں کے درمیان تحقیق اور تقابل کے کام کو ضروری سمجھا گیا۔

چناں چہ دوسری دفعہ تحقیق و تقابل کے نتیجے میں چند نئی غزلیں سامنے آئیں دوسری طرف ان نسخوں کے مطالعے سے تصحیح میں مدد مل سکی۔ تاہم کاتبوں کی غلطیاں اب بھی اشعار میں موجود ہیں، دعا کریں کہ ان غلطیوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے صحیح متن حاصل ہو سکے۔

حسنِ اتفاق کہیے یا روحانی مدد کہ جب کتاب مطبع میں جانے کو تھی کہ ایک حمد اور مناجات پر مشتمل کلام دریافت ہوا، یہ کلام مفتی اعظم پاکستان، مفتی صاحب دادؒ کی ۱۳۶۳ھ کی ڈائری میں لکھا ہوا تھا۔" (۶)

پیر حزب اللہ شاہؒ ایک علم پرور اور ادب نواز شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے پاس نادر کتابوں کا ایک عظیم ذخیرہ تھا۔ اس کے علاوہ قلمی مخطوطات بھی بہت سے تھے، جو خود ادبی حیثیت کے حامل ہیں اور آج جمعیت علماء سکندریہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں ان کتابوں سے اور مخطوطات سے پیر صاحب نے اپنی پیاس علم کو خوب سیراب کیا یہی وجہ ہے کہ ان کا علم بڑا وسیع تھا جو ان کے کلام میں بھی جا بجا نظر آتا ہے۔ ان کی شاعری جو فارسی پر مشتمل ہے ظاہر کرتی ہے کہ پیر صاحب کو فارسی میں شعر کہنے پر ملکہ حاصل تھا۔ وہ نیچرل شاعری کے عادی تھے، ایسی نیچرل شاعری جسے فطری کہا جاتا ہے، جس کے بارے میں حالیؔ نے اپنی تصنیف "مقدمہ شعر و شاعری" میں اس طرح تفصیل بیان کی ہے۔

"بعض حضرات تو نیچرل شاعری اُس شاعری کو سمجھتے ہیں جو نیچریوں سے منسوب ہو یا جس میں نیچریوں کے مذہبی خیالات کا بیان ہو، بعضے یہ خیال کرتے ہیں کہ نیچرل شاعری وہ ہے جس میں

خاص مسلمانوں کی یا مطلقاً کسی قوم کی ترقی یا تنزل کا ذکر کیا جائے مگر نیچرل شاعری سے یہ دونوں معنی کچھ علاقہ نہیں رکھتے، نیچرل شاعری سے وہ شاعری مراد ہے جو لفظاً اور معنی دونوں حیثیتوں سے نیچرل یعنی فطر یا عادت کے موافق ہو، لفظاً نیچرل کے موافق ہونے سے یہ غرض ہے کہ شعر کے الفاظ اور ان کی ترکیب و بندش تابہ مقدور اس زبان کی معمولی بول چال کے موافق ہو جس میں وہ شعر کہا گیا ہے۔ کیوں کہ ہر زبان کی معمولی بول چال اور روز مرہ اس ملک والوں کے حق میں جہاں وہ زبان بولی جاتی ہے، نیچر یا سکینڈ نیچر کا حکم رکھتے ہیں۔" (۷)

۲۰۴ صفحات پر مشتمل بڑی تقطیع کے اس ضخیم دیوان کی وجد آور غزلیں اپنا کیف و سرور آپ رکھتی۔ آخر میں ایک
اردو نظم بھی ہے، جس کا مقطع ہے۔

جب آنکھ تیری آنکھ سے مسکین ملادی
آنکھوں سے میری بھل گیا آرام ہمارا

اس مقطعے میں آنکھ کی تکرار اور رعایتِ لفظی قابلِ داد ہے، مہر علیؒ کا ایک معروف شعر ہے:

کتھے مہر علی کتھے تیری ثناء
گستاخ انکھاں کتھے جالڑیاں

بہر حال بہت ضروری ہے کہ ہم یہاں دیوانِ مسکین کے چند صفحات کا مطالعہ سندھی ترجمے کے ساتھ ضرور دیکھ لیں کیوں کہ اس کے بغیر مطالعہ حزب اللہ شاہ" مکمل نہیں ہوگا۔ اس کا سندھی ترجمہ مفتی محمد رحیم سکندری نے کیا ہے جب کہ اس کام کی تحریک منشی محمد پریل صاحب نے دی اور مختلف دواوین کا تقابلی متن پروفیسر محمد فاضل شیخ نے کیا اور قلمی مخطوطات کی تصحیح نیز مخطوطات خانی کا اہم فریضہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب قبلہ نے ادا کیا۔ راقم الحروف کو احساس ہے کہ یہاں اس ضخیم اور عظیم دیوان کے چند صفحات کے مطالعے سے تشنگی دور تو نہیں ہو سکتی لیکن ہمیں طوالت کا احساس دامن گیر ہے۔ لہٰذا ہم ان چند صفحات ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔

ندانم از کجا آید همان غارتگرِ دلها — بیک غمزه سناں سازد ہزاراں جان بسملها

دریں وادیِ عشقش مے زنم آخر قدم امّا — چو نقش هر قدم باشند دریں راهِ منزلها

نمے دانی کہ در غفلت تُرا افتادهٔ برخیز — کہ راهِ کارواں دور است بربندید محملها

بیا اے ساربان بنگر بزیرِ محمل افتادم — کشم بر ناقهٔ چنداں کہ بسیارند محملها

بگردابی منم حیراں کہ داند حال ما امّا — کجا گیرند دستِ ما سبکسارانِ ساحلها

اگر ساقی بمے باقی اشارت مے کند مارا
بروئے عاشقِ مسکین نماید حل مشکلها

١- خبر نہ آھي تہ اھو دل لٽيندڙ ڪٿان ايندو؟ جنھن جي اک جي ھڪ اشاري سان ھزارين زخمي فنا ٿي وڃن.

٢- عشق جي ھن وادي ۾ آخر ڪيترو ھلندس جتي وات جي ھر وک منزل جي پري ھجڻ جو پتو ڏئي.

٣- تو کي خبر ڪانھي شايد غفلت ۾ پيو آھين. اٿي ڪجاوُ ٻڌي تيار ٿي چو تہ قافلي جو سفر پري آھي.

٤- او ساربان! اچي ڏس تہ مان ڪجاوي جي ھيٺان پيو آھيان. پاڻ ڪيترو نڪرڻ لاءِ چڪيندس جو ڪجاوا مٿان گھڻا آھن.

٥- دريا جي ڪن (سير) ۾ ڏاڍو پريشان آھيان، ساحل تي لطف وٺڻ وارا، اسان جو ھٿ ڪٿي وٺندا!

٦- ھائو جيڪڏھن ساقي، باقي شراب (عشق) سان اشارو ڪري تہ پوءِ مسڪين عاشق تي ھر مشڪل آسان ٿي پوندي.

معطر کن ببوئے نافہ کاخر دماغم را   زمینا بادۂ گلگوں بدہ پر کن ایاغم را
زگردش این فلک پرکین چراغم روشنی بگذاشت   زشمع خویش روشن شاز این مردہ چراغم را
بہ تسخیر شکار آمد چو یارم باکماں ابرو   بہ تیر غمزہ بر دوزید ہر یک پر زاغم را
منم خستہ ز تیرانم کہ در قوس قزح دارد   ولے از لب شفاجویم کہ مرہم قرح داغم را

صبا می گویمت بکشائے رازے بامن شیدا
کجا شد کو ببرد لجوئے از مسکین بلاغم را

١ - آخر منهنجو دماغ ڪستوريءَ جي خوشبوءِ سان پرُ گل جهڙي شراب سان منهنجو پيالو ڀر.

٢ - ساڙ ڪان ڀريل زماني جي چڪر سبب منهنجي زندگيءَ جو ڏيئو وسامڻ تي آهي، هن وسامندڙ چراغ کي پنهنجي شمع سان روشن ڪر.

٣ - منهنجو محبوب ابروءَ جي ڪمان سان جڏهن شڪار لاءِ آيو ته اک جي تير سان مون کي شڪار ڪري (ياتابو ڪري) ورتائين.

٤ - مان قوس قزح جي تيرن جو زخمي آهيان. پر چپن جي مرهم سان داغ ۽ ڦٽن کان شفا جو طالب ٿو آهيان.

٥ - صبا! تو کي گذارش ٿو ڪريان ته مون عاشق سان راز ظاهر ڪر ته مون مسڪين جو غم تارينڊڙ ڪيڏانهن ويو.

خطِ خوبی بگردِ گلعذارے کردہ ام پیدا	بہ تیرِ غمزہ اش جاں خود شکارے کردم پیدا
عجائب سلسلہ زلفش مسلسل وارمے باشد	کہ ہر یک تار مشکینش چو مارے کردہ ام پیدا
برائے آں مہ ظلمت زُدا پیرِ خرابا تم	دراں عین الیقین خود خمارے کردہ ام پیدا
بہ شیریں بجاں آریم با فرہاد فریادے	برائے عافیت کو غمگسارے کردہ ام پیدا
ولی اور اخدا خواند وتیرِ خویش فرمودہ	فتیٰ در شان اوچابک سوارے کردہ ام پیدا
زہجرِ آں گُلِ چو نم بمثلِ لالہ پر خونم	چو بلبل در قفس جاں بیقرارے کردہ ام پیدا
عجب کایں یارِ شوخ و شنگ و نازک طبع مے باشد	برائے آں گوہر باریک تارے کردہ ام پیدا
ہم از جور و جفائے کافرے دلبرتِ عیار	دو چشمے خوں فشاں واشکبارے کردہ ام پیدا
بتارِ زلفِ پیچ انداز دیدم خال ہندویش	تو گوئی نافہ مشکِ تتارے کردہ ام پیدا
خطِ خوبی کہ می دارد بحُسنِ جاوداں دلبر	بحلقہ وار گردِ مہ غبارے کردہ ام پیدا

بہر دم بلبلِ مسکین رُخِ گل را کند سجدہ
ہمے گوید کہ شاہِ تاجدارے کردہ ام پیدا

١:- محبوب جي ڳلن تي سهڻي ليڪ سمجهي اٿم، سندس نظر جي تيرسان پاڻ کي شڪار ڪيو اٿم.

٢:- محبوب جي زلفن جا پيچ عجيب آهن، سنديس زلفن جي هر ڪاري تار کي نانگ تصور ڪيو اٿم

٣:- روشن چنڊ جهڙي پنهنجي ميڪده جي پير لاءِ، پنهنجي عين اليقين ۾ خمار محسوس ڪيو اٿم.

۰۴. شيرين اڳيان، فرهاد سان گڏجي دل جي داڻهن پيش ڪريون، جو عافيت جي واسطي اهو غمخوار هٿ ڪيو اٿم.

۰۵. خدا تعاليٰ ڪيس پنهنجو ولي ۽ شير سڏيو آهي، انهيءَ چابڪ سوار مرد جي شان ۾ فتيٰ جو لفظ ڳولي لڌو اٿم.

۰۶. انهيءَ گل جي جدائيءَ ۾ لاله جي گل وانگر رت سان پريل آهيان؛ بلبل وانگر پڃري ۾ منهنجي جان بيقرار آهي.

۰۷. اهو شوخ و شنگ محبوب نهايت نازڪ طبع آهي، انهيءَ عجيب گوهر کي پوئڻ لاءِ نفيس تار هٿ ڪئي اٿم.

۰۸. ان بي پرواهه چالاڪ محبوب جي ظلم ۽ ستم کان ٻئي اکيون رت جا ڳوڙها وهائن ٿيون.

۰۹. سندس خالِ سياهه کي پرپيچ زلفن سان ڏٺم، ڄڻ ته تاتاري مشڪ جو ٻيڙو هجي.

۱۰. محبوب جي دائمي حسن تي جيڪا سهڻي ساوڪ آهي، سا ڄڻڪ چنڊ جي چوڌاري غبار جو حلقو آهي.

۱۱. مسڪين بلبل هر وقت گل کي سجدو ٿي ڪري، ۽ ان کي پنهنجو تاجدار بادشاهه سمجهي ٿي.

-

اے زنوشِ یک قدح از بس کہ بیہوشیم ما — ساغرِ صہبا بکف آریم و مدہوشیم ما

پند مارا در نمے گیرد کہ مستیم از اجل — از خمِ عشقِ بتاں دائم قدح نوشیم ما

نشۂ دیشب فرو گردید حالم شد تباہ — ساقیا! جامے بدہ تا در طلب کوشیم ما

بہر بخشیدن مئی اے ساقیِ گل فامِ من — ہر گدائے را بیاد آری فراموشیم ما

لب بہ بندیم از فغاں کے نالہ و زاری ہنوز — بس کہ در جور و جفائے یار خاموشیم ما

بس کہ بہر جرعۂ مے پیش اربابِ طرب — خرقۂ سالوس در مے خانہ بفروشیم ما

ہر کسے عیش و طرب در بزمِ عالی جاہ کرد — غفلتے ورزید کاندر خوابِ خرگوشیم ما

بر منِ مسکیں نگاہی از کرم انداز زود — ز آتشِ افلاس ہمچوں دیگ در جوشیم ما

١ - هڪ ئي پيالي پيئڻ سان بي انداز بيهوش ٿي ويا آهيون (محبت جي) شراب جو پيالو هٿ ۾ وٺندي ئي بيهوش ٿي ويا آهيون.

٢ - موت جي نصيحت اسان کي ڪهڙو اثر ڪندي اسان ته محبوبن جي عشق جي مٽ مان پيالا ڀري پيئي مست ٿي ويا آهيون.

٣ - ڪالهه رات جو نشو لٿو ته منهنجو حال هيٺو ٿي ويو. ساقي! پيالو ڀري ڏي ته طلب جي ڪوشش جاري رکون.

٤ - منهنجا گلن جهڙا ساقي! محبت جي شراب ونڊڻ وقت هر پينو ته ياد اٿيئي، وسريا به اسان آهيون.

٥ - آه و فغان کان چپ ڪيئن سبي ڇڏيون. هائي ڪهڙيون آهون ڪجن. يار جي جفاءِ ڏاڍي گهڻي ٿي خاموشي اختيار ڪئي سون.

٦ - ذوق وارن جي هٿان شراب جي هڪ ڍڪ لاءِ اسان ٺڳيءَ جي پوشاڪ وڪڻي ڇڏيندا سون.

٧ - محبوب عالي قدر جي محفل ۾ هر هڪ عيش ۽ مسرت حاصل ڪئي. پر اسان ڪان غفلت ٿي جو خواب خرگوش ۾ رهجي ويا سون.

٨ - مون مسڪين تي جلدي نگاهِ ڪرم ڪر. سڃائيءَ جي باهه کان ديگ وانگر جوش ۾ آهيون.

در مجلسِ مُلوکاں چہ بود گذر گدا را   رازے نہ فاش گوید بر غنچۂ صبا را

از من مدار پنہاں ایں قصۂ درازت   با مدعی مفرما ایں رازِ آشکارا

پنہاں تو چند سازی رویت کہ مہرِ آسا   بر عاشقاں تو بنگر اے ماہ نو نگارا

شیدائے دلبرانم گر رواز و بم بخشار بند   اے مدعی مگر داں ویں جور ویں جفا را

رو از رقیب گرداں بر عاشقاں نظر کن   گاہے روا نباشد با او چنیں مدارا

افسردہ ام نگارا ! در آتشِ فراقت
رحمے بحالِ مسکیں اے شوخِ من خدا را

١ ـ بادشاهن جي محفل ۾ گدا گر جو ڪهڙو گذر؟ "مکڙي" ڪنهن به قسم جو راز هر هوا سان نه ظاهر نه ڪندي.

٢ ـ مون کان نه پنهنجي ڏکي ڪهاڻي نه لڪاءِ، هامگر مدعي سان هي راز ظاهر نه فرماءِ.

٣ ـ چنڊ جهڙا محبوب! پنهنجو منهن مبارڪ ڪيترو لڪائيندين. اوره لقا محبوب عاشقن تي نظرِ ڪرم ڪر.

٤ ـ مان نه محبوبن جو عاشق آهيان. ڪڏهن به انهن کان منهن نه موڙيندس، مدعي خدا جي واسطي اهڙو ظلم نه ڪر.

٥ ـ رقيب کان منهن موڙ عاشقن تي نظر ڪر. رقيبن سان نه ڪڏهن به اهڙي نرمي ڪرڻ نه جڳائي.

٦ ـ سجڻا! تنهنجي جدائي جي باهه سبب پريشان آهيان. مٺا! خدا جي واسطي مسڪين جي حال تي ڪجهه ته رحم ڪر.

بیا تو ساقی بکشا ربند مینا را
بریز در قدحِ زر نگار صهبا را

شراب را بقدح ریختن بما دادن
چه فرصت است دریں کار ید بیضا را

شرابِ ناب بدورِ لبت اشارت کن
خبر دہیم ز لطفِ لبت مسیحا را

حضورِ ساقیِ خالص شرابِ انگوری
بود نصیبِ کم اندیشگانِ دنیا را

اگرچه زاهدے بکشاد دام پُر ز هوا
کجا بدست کند شاهباز دانا را

تو زاهد از سرِ سجدهٔ ریا بگذر
بدام مکر نگیرند مرغِ عنقا را

بصد هزار فسوں دستِ کوتهانِ جهاں
نمی رسد بخمِ زلفِ عنبریں سا را

شراب خواستن و روئے یارِ خود دیدن
کجا گذارد مسکین ایں تمنا را

١ - ساقي اچ ۽ شراب جي محفل قائم ڪر ۽ سونهري پيالي ۾ (عشق جي) شراب ڀرت.

٢ - پيالي ۾ شراب ڀرڻ اسان کي ڏيڻ جي محبوب يد بيضا جي مالڪ کي ڪهڙي فرصت.

٣ - پنهنجي (فرحت بخش) چپن سان صاف شراب عنايت ڪر،
جيئن تنهنجي لبن جي لطافت جي مسيح کي خبر ڏيون.

٤ - خالص انگوري شراب، ساقي جي بارگاه ۾ دنيا جي طالبن کي گهٽ نصيب ٿيندو آهي.

٥ - جيتوڻيڪ زاهد پنهنجي هوس ڀريل ڦاهي اڏي ۽ مگر هوشيار شهباز کي ڪٿي هٿ ڪري سگهندو!

٦ - زاهد! ريا جي سجدي کان متو مٿي ڪڻ، عنقا پکي مڪر ۽ فريب جي ڦاهي ۾ ڪٿي ڦاسندو؟

٧ - دنيادارن جو ڪوتاه هٿ لکين ٽڳين جي باوجود محبوب جي عنبر جهڙن زلفن جي ڪڙ تائين ڪٿي ٿو پهچي.

٨ - محبت جو شراب گهرڻ ۽ محبوب جي زيارت جي تمنا هي مسڪين ڪٿان ڇڏيندو؟

در بارگاهِ شاهی افتد گذر گدارا
تا کہ کفن نسازد ایں دلقِ بے ریارا

آں محرمِ حضور است وآں ستہ نشور است
ہر کس کہ واگذارد ہم حرص وہم ہوارا

آں ابجری بود، کو پندار وآں خمِ ابرو
ہمچوں کنشت کافر آں خانۂ خدارا

آں کو کہ رنگ دانہ چشمے دد کوردانی
رنگ دگر نباشد جامِ جہاں نمارا

صاحب نظر بود کو دارد در دیدہ برے
کے چشمِ کور بیند آئینۂ صفارا

از مجلسِ صفات وذات آں گذر کہ باید
ہم از فنا گذر کن یابی تو پس بقارا

ساقی بیار بادہ آں کو تبسم آرد
مسکیں زمستی او دردز تن قبارا

١ - شاهي دربار ۾ گدا گر جي حاضري ٿئي، ته پوءِ بي رياگودڙي کي ڪفن ضرور ڪري.

٢ - "حضور" (اقدس) جو محرم راز ۽ ميدانِ حشر ۾ آزاد اهوئي آهي جيڪو حرص ۽ خواهش جي پڃر صفا ڇڏي ڏئي.

٣ - يار جي ابرو جي مخصوص صورت کي سمجهڻ وارو ئي اڪين وارو آهي. ڪو ماهر مجسمه ساز هجي، جو يار جي ابروءَ جي گولائي کي سمجهي، ۽ ڪعبي ۽ مندر ۾ امتياز ڪري.

٤ - جيڪو نقط رنگ سچائي تهن کي (حقيقت ۾) انڌو سمجھ جامِ "جهان نما" جو ته ڪو رنگ ٿيندو ئي ڪونهي.

٥ - نظر ۾ اکين وارو اهوئي آهي جنهن جي يار تي نظر هجي ساف آئيني کي (ظاهر آهي) انڌو ته ڪونه ڏسي سگهندو!

٦ - سندس ذات ۽ صفات جي محفل کان گذر، مقامِ فنا کان به اڳتي لنگهڻ بعد بقا جو مقام ملندئي.

٧ - ساقي اهڙو ته خالص شراب عطا ڪر جنهن سان تبسم ئي تبسم حاصل ٿئي. جنهن جي مستيءَ مان مسڪين تميض ٿا ڏيئي جسم کان جدا ڪري ڇڏي.

حواشی

(۱) ''مخزنِ فیضان'' جمعیت علماء سکندریہ درگاہ شریف، پیر جو گوٹھ مطبوعہ: ۱۹۸۷ء، طباعت دوم ۲۰۰۱ء صفحہ ۴۱۲ تا ۴۱۴۔

(۲) تبسم چودھری ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' انڈس پرنٹرز، مطبوعہ: جولائی ۱۹۸۵ء صفحہ ۱۴۳ تا ۱۴۴۔

(۳) اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر ''تذکرہ صوفیۂ سندھ'' اردو اکیڈمی کراچی، ۱۹۵۹ء صفحہ ۱۶۱

(۴) سارا انصاری ''سندھی پیر اور برطانوی راج'' فکشن ہاؤس لاہور مطبوعہ: ۱۹۹۶ء صفحہ ۸۷ تا ۸۸

(۵) ایضاً

(۶) پیر حزب اللہ شاہؒ مسکین ''دیوانِ مسکین'' جمعیت علماء سکندریہ، فروری ۱۹۸۵ء صفحہ ۳

(۷) الطاف حسین حالؔی مولانا ''مقدمہ شعر و شاعری'' مرتبہ: ڈاکٹر وحید قریشی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ایڈیشن ۱۹۹۵ء صفحہ ۱۵۸

(انتخاب کلام پیر حزب اللہ شاہؒ مسکین کا استفادہ دیوانِ مسکین صفحہ ۶ تا ۴۷)

سید علی گوہر شاہ ثانیؒ (م ۱۳۱۴ھ) پگارا چہارم

الملقب بہ محفہ دھنی

آپ کا نام، آپ کے دادا پر رکھا گیا اس لحاظ سے آپ کو ''ثانی'' کہا گیا۔ سید علی گوہر شاہ ثانی پیر پگارا چہارم ۱۲۵۷ھ پیدا ہوئے، یہ آٹھ بھائی تھے۔

(۱) سید علی گوہر شاہ ثانی

(۲) سید علی مظفر شاہ

(۳) سید علی اصغر شاہ

(۴) سید شاہ مردان شاہ

(۵) سید علی سرور شاہ

(۶) سید محمود شاہ

(۷) سید غلام مصطفیٰ شاہ

(۸) سید عنایت شاہ

سید علی گوہر شاہ ثانیؒ بچپن ہی سے علیل رہا کرتے تھے اس لیے ان کے مریدوں نے سفر کے وقت یعنی دور دراز مقیم مریدوں تک جانے کے لیے ایک ''محافہ'' (یعنی ڈولی) تیار کرائی تھی۔ جس پر سوار ہو کر یہ سفر کیا کرتے تھے اسی رعایت سے ان کا لقب ''محافے'' دھنی مشہور ہو گیا۔ انھوں نے اپنے والد کے حکم کے مطابق پیر سید محمد گیلانی شاہ ثانیؒ (چناہ والے) کے دست مبارک پر بیعت کی اور روحانی تعلیمات سے مستفیض ہوتے ہوئے سلوک کی منازل طے کیں۔ ویسے تو آپ خود ایسے خانوادے تھے جہاں روحانی تعلیم اور دینی ماحول بچپن ہی سے میسر تھا۔ یعنی ان کے والد پیر حزب اللہ شاہؒ خود صاحب علم اور صاحب دل بزرگ تھے لہٰذا انھوں نے اپنی نگرانی میں اپنے فرزند ارجمند کی تعلیم و تربیت فرمائی جس میں دینی تعلیم اور مذہبی رنگ نمایاں تھا۔

والد صاحب کی وصال ۴ محرم ۱۳۰۸ھ مطابق ۲۱ اگست ۱۸۹۰ء کے بعد سجادہ نشین ہوئے آپ سے متعلق

معلومات کے لیے ہمیں مخزنِ فیضان ہی سے رجوع کرنا پڑتا ہے:

''آپ کے وقت میں حر فقیروں نے گورنمنٹ برطانیہ کے خلاف منظم عَلَم بغاوت بلند کیا۔اور آزادی حاصل کرنے کے لیے مسلح جدوجہد شروع کی ان مجاہدین آزادی کی قیامت کرنے والے حسبِ ذیل سرفروشوں کے نام سرِ فہرست ہیں جنہوں نے اپنی متواصی حکومت قائم کر لی تھی۔

(۱) بچوبادشاہ، ولد دریام خاصخیلی

(۲) پیروفقیر وسان وزیر

(۳) گلوفقیر موچی کوتوال

(۴) بھلوفقیر گاہو

(۵) مصری فقیر گانگھرد

(۶) تیگوفقیر چانگ

(۷) عثمان فقیر ہنگورو

(۸) خمیسو فقیر وسان

(۹) دسندِ فقیر کزاک

(۱۰) عیسیٰ فقیر ڈاہری

(۱۱) قائم فقیر موچی (گلوکا بھائی)

(۱۲) دریا خان فقیر نظامانی

ان بارہ مجاہدین نے مکھی جھیل کے جنگلات میں اپنا دارالسلطنت قائم کیا۔اور بڑی بہادری

کے ساتھ سامراج برطانیہ کے خلاف برسرِ پیکار ہو گئے ان کی کاروائیاں انتہائی منظم اور کامیاب ہوتی تھیں۔

یہ مجاہدین علاقہ مکھی (موجودہ ضلع سانگڑھ) کے بڑے بڑے مالداروں اور زمین داروں سے ٹیکس اور مالیہ وصول کر کے اخراجات پورے کرتے تھے، خصوصاً گورنمنٹ برطانیہ کے پٹھوؤں سے زبردستی رقوم وصول کیا جاتی تھی ان میں سے اگر کوئی رقم دینے سے انکار کرتا یا حکومت برطانیہ کی مدد سے ان کو گرفتار کرانے کی کوشش کرتا تو یہ مجاہدین ایسے افراد کے خلاف شدید ترین کاروائیاں بھی کرتے تھے، ان کے مال و متاع کو زبردستی لوٹ لیتے اور انہیں قتل و غارت کرنے سے کچھ دریغ نہ کرتے تھے، ان مجاہدین کی طوفانی کاروائیوں سے حکمران انگریزوں کے ہوش و حواس گم ہو گئے اور برٹش گورنمنٹ کی نیند حرام ہو گئی تھی۔

حکومت برطانیہ کے وفادار متعدد وڈیروں کو مجاہدین نے قتل کیا اور ان کے مال و متاع لوٹ لیا، ایک پولیس انسپکٹر ''جولان سنگھ'' سکھ کو ''بہرم بری'' کے بھرے میلے میں علی الاعلام جہنم رسید کیا اور پولیس تھانوں پر کامیاب حملے کر کے ان کو تباہ و برباد کیا اور اسلحہ وغیرہ لوٹ کر لے گئے۔

۱۸۹۲ء میں حکومت برطانیہ نے ضلع تھر پارکر (ان دنوں عمر کوٹ ہیڈ کوارٹر تھا) کے انگریز ڈپٹی کمشنر مسٹر ''لیوکس'' کو حر مجاہد پر قابو پانے پر مامور کیا، مسٹر لیوکس اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود جب ناکام رہا تو اس نے غیض و غضب میں آ کر پُر امن شہریوں پر باغی حروں کی مدد کرنے کا الزام رکھ کر سینکڑوں بے گناہوں کو گرفتار کرنے اور ان پر بے پناہ تشدد کرنے کی وحشیانہ کاروائیاں شروع کر دیں اور اس کے حکم سے فوجیوں اور پولیس والوں نے درجنوں دیہات پر حملے کر کے قتل عام کیا، ان کے گھروں کو لوٹ کر مکانوں کو نذرِ آتش کر دیا تھا، اور ہزاروں افراد کو گرفتار کر کے ان پر ناقابلِ بیان مظالم ڈھائے، یہ سب کچھ کرنے کے باوجود بھی جب کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا اور حر مجاہدین کی کاروائیوں پر قابو پایا نہ جا سکا تو فریب کار اور مکار انگریزوں نے اپنی روایتی عیاری سے کام لینے کا منصوبہ بنایا۔

کمشنر سندھ 'مسٹر جیمس' کراچی سے حیدرآباد پہنچا اور پیر سائیں علی گوہر شاہ ثانی کو طلب کر کے ان سے امداد کا طالب ہوا۔ اس نے پیر صاحب پگارا سے پرزور اپیل کی کہ 'امن وامان بحال کرنے میں حکومت کی مدد کریں، اپنے شوریدہ سر مریدوں کو حکم دیں کہ وہ ہتھیار ڈال دیں، اور خود کو مسٹر لیوکس کے سامنے پیش کردیں۔' پیر صاحب نے فرمایا: اگر حکومت ان کو عام معافی دینے کا اعلان کردے اور انہیں سزا نہ دینے کا وعدہ کرے تو میں حر مجاہدین کو حکم دیدوں گا کہ وہ ہتھیار ڈال دیں اور خود کو حکام کے سامنے پیش کردیں۔ کمشنر سندھ نے پیر صاحب کو یقین دلایا اور وعدہ کیا کہ اگر یہ باغی ہتھیار ڈال کر پیش ہو جائیں تو ان کے خلاف کوئی انتقامی کاروائی نہ کی جائیگی۔ پیر صاحب نے حر مجاہدین کے قائدین کو پیغام بھیج دیا کہ وہ مسٹر لیوکس کے سامنے حاضر ہو جائیں۔

مجاہدین کے رہنماؤں نے اپنے مرشد کے حکم کے سامنے سر تسلیم خم کیا اور خالی ہاتھ خود کو پیش کرنے کے لیے روانہ ہو گئے۔ لیکن جب سانگھڑ کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ان پر لیوکس کے حکم سے گھات میں لگی ہوئے پولیس نے اچانک فائرنگ کردی جس کے نتیجے میں:

(۱) پیرو فقیر وسان وزیر
(۲) گلو فقیر موچی کوتوال
(۳) بھلو فقیر گاہو
(۴) مصری فقیر گانگھرد
(۵) تیگو فقیر چانگ
(۶) عثمان فقیر ہنگورو

اور ان کے چند دیگر ساتھی موقع پر شہید ہو گئے۔ وسند فقیر کز اک گرفتار ہوا جسے بعد میں سزائے عمر قید سنائی گئی بچو فقیر بادشاہ اور عیسیٰ فقیر ڈاہری دونوں ریاست خیر پور کے وزیر مسٹر یعقوب علی کے پاس پہنچے اور پناہ دینے کی درخواست خیر پور کی لیکن ان کو بھی دھوکے سے گرفتار کرکے سانگھڑ لایا گیا اور مسٹر لیوکس کے حکم سے ان کو بھی پولیس تھانہ (چوک میں جہاں اب نیشنل بینک ہے) سانگھڑ میں

پھانسی پر لٹکا دیا گیا، ان شہداء حرمجاہدین کو سانگھڑ کے جنوب میں واقع قریبی نظامانی قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں ان کی قبریں اب تک موجود ہیں، مجاہدین کے رہنماؤں میں سے صرف ایک شخص دریا خان نظامانی بچ کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو سکا تھا مگر کچھ عرصہ بعد اسے بھی گرفتار کر لیا گیا تھا، اس کی گرفتاری کا حال آگے چل کر بیان ہوگا ، انگریز اس طرح دھوکہ بازی کے ذریعہ حرمجاہدین کی تحریک آزادی کو دبانے میں عارضی طور کامیاب ہوئے اس کے بعد انگریزوں نے حروں کو مکمل طور پر کچل دینے کا فیصلہ کر لیا تا کہ آئیندہ پھر کبھی یہ سر اٹھانے کے قابل نہ رہ جائیں حروں کو وسیع پیمانے پر پکڑ پکڑ کر گولی ماردی گئی، پھانسی پر لٹکایا گیا اور اس کے ساتھ ہی حر جماعت کے احکام کو خلاف قانون قرار دے دیا گیا، تمام حروں کے نظر بندی کے احکام جاری کر کے مختلف شہروں اور قصبوں کے باہر نظر بندی کے کیمپ قائم کر کے ان کے تمام مرد وزن ، بچے اور بوڑھے ان کیمپوں میں نظر بند کر دیئے۔ حروں کو تما کیمپوں پر مسلح پولیس کے پہرے لگا دئے گئے ،حروں کو حکم دیا گیا کہ دن کے وقت محنت مزدوری کر کے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے اخراجات خورد ونوش پورے کریں ،صبح شام پولیس تھانوں میں حاضری لگوائیں ۔ پیر صاحب پگارا نے حکومت برطانیہ کی ان کاروائیوں پر سخت اعتراض کیا لیکن انگریزوں نے نہیں جانا۔ حروں کی نظر بندی کا یہ ظالمانہ سلسلہ قیام پاکستان تک جاری رہا۔ پیر صاحب اپنے مریدوں کو صبر وتحمل کی تلقین کرتے تھے لیکن جو شیلے حروں کے دلوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت و عداوت کا جذبہ بڑھتا چلا گیا۔ سرفروش حر نظر بندی کے کیمپوں سے روپوش ہونے لگے تا کہ حکومت برطانیہ کے خلاف پھر منظم بغاوت کر سکیں۔

پیر سید علی گوہر شاہؒ ثانی جو پہلے سے ہی علیل رہتے تھے ان واقعات سے ان کی طبیعت پر نہایت شدید اثر پڑا آپ کی صحت مزید بگڑتی چلی گئی ۔ بالآخر جب آپ کی صحت ادائیگی وفرائض و معمولات کی متحمل نہ رہی اور آپ چوں کہ لاولد تھے۔ اس لیے آپ نے اپنے بھائی (تیسرے نمبر کے) سید شاہ مردان شاہ اوّل کو اپنا ولی عہد مقرر کیا۔ اس تقرری کا وصیت نامہ مسٹر میٹو کلکٹر شکار پور کے روبرو لکھ کر آپ نے سید مردان شاہ اوّل کے حوالے کیا۔ علاوہ ازیں آپ نے مولوی عبدالقادر

فقیراور دیگر سر کردہ فقراء سے بھی تاکیداً فرمایا کہ میرے بعد انہی کو سجادہ نشین بنایا جائے۔" (صفحہ ۴۱۹ تا ۴۲۳)۔

لیکن اس خاندان سے متعلق انتہائی اہم تذکرے تبسم چودھری "تذکرہ پیرانِ پاگارا" کے صفحہ: ۱۵۳ پر اس سجادگی سے متعلق ایک اہم معلومات اور ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجادگی کے معاملے پر دو بھائیوں کے درمیان کچھ تنازعہ بھی ہوا تھا۔ مذکورہ صفحے پر جو معلومات ہمیں ملتی ہے وہ اس طرح ہے۔

"سید علی گوہر شاہ ثانیؒ لاولد تھے اس لیے انھوں نے اپنے تیسرے بھائی شاہ مردان شاہ ثانیؒ کو اپنا جان نشین بنایا لیکن شروع ہی سے آپ کے بڑے بھائی پیر علی مظفر شاہؒ نے سجادگی پر اپنا حق جتانے کے لیے زبردست کا آغاز کر دیا تھا اور یہ معاملہ بالآخر کوٹ تک پہنچا جہاں کافی عرصے تک کیس چلنے کے بعد دسمبر ۱۸۹۹ء میں اس کا فیصلہ سید شاہ مردان شاہ کے حق میں ہوا، اور مدعی پیر علی مظفر شاہ کا یہ دعویٰ مسترد ہو گیا کہ وہی سجادہ نشین کے حق دار ہیں۔

چناں چہ آپ کا ایک خط مؤلف لب تاریخ سندھ نے نقل کیا ہے جو آپ نے اس سلسلے میں اسے لکھا تھا۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ سجادگی کے تنازعہ کا مقدمہ ۲۲، دسمبر ۱۸۹۹ء کو کارج ہو گیا ہے کہ اور مدعی کا دعویٰ در کر دیا گیا ہے۔"

"سید علی گوہر شاہ ثانیؒ پیر پگارا چہارم کو طویل عمر نصیب نہیں ہوئی، جیسا کہ ہم پہلے ہی عرض کر چکے ہیں کہ آپ بچپن ہی سے علیل رہا کرتے تھے جس سے آپ کی صحت ٹھیک نہیں رہی مزید یہ کہ اطراف کے حالات نے انہیں مسلسل فکر مند رکھا جس کی وجہ سے بیماری مزید غالب آتی چلی گئی، چناں چہ صرف ۳۹، برس کی عمر میں ۲۴، جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء آپ کی وفات ہوئی۔" (۱)

اس خاندان کے بزرگوں کے واقعات کو تسلسل دینے کے لیے سید علی گوہر شاہ ثانی کے حالات بیان کرنا یہاں

---

(۱) "مخزنِ فیضان" صفحہ: ۴۲۳ پر آپ کی وفات کا مہینہ جمادی الثانی بتایا ہے۔ جبکہ "پیکرِ حریت" کے صفحہ ۴ پر ان کی وفات کا مہینہ محرم درج ہے۔

ضروری تھے ورنہ دینی خدمات کے حوالے سے آپ کی زندگی میں سوائے اس ایک کارنامے کے علاوہ کوئی اور بڑا کام ہمیں نہیں ملتا اور وہ یہ کہ انھوں نے قرآنِ پاک کی تفسیر کو شایع کرایا اور مفت تقسیم کیا تھا جو ان کے والد صاحب نے لکھوائی تھی۔ لہٰذا ان کے اسلاف نے قابلِ قدر دینی خدمات انجام دیں ہیں لیکن کیا وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں اس نوعیت کی خدمات کا کوئی بڑا حوالہ ہمیں نہیں ملتا۔ اس سوال کے چند جوابات ہمارے ذہن میں آتے ہیں اور یقیناً حالات و واقعات کے تناظر میں اگر انہیں دیکھا جائے تو قابلِ تسلیم ہوں گے۔

(۱) سید علی گوہر کو سجادگی کا بہت کم وقت ملا، یعنی صرف ۶، سال کیوں کہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء کو آپ کے والد پیر حزب اللہ شاہ کا وصال ہوا اور اس کے بعد سید علی گوہر سجادہ نشین ہوئے لیکن ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء کو ان کا بھی وصال ہوا اس طرح صرف ۶، سال سجادگی کے ملے۔

(۲) آپ بچپن ہی سے علیل رہے، اور ان ۶، سالوں میں بھی آپ مکمل صحت مند اور تندرست نہیں تھے، اس لیے آپ کے ہاتھوں کوئی بڑا دینی کام نہیں ہوا۔

(۳) انگریزوں کی سازشیں منظم ہو چکیں تھیں اور وہ ان کی تنظیم کو شدید نقصان پہنچانے کے درپے تھا اور متعدد مریدوں کو شہید کیا جا چکا تھا، ان حالات سے پگارا چہارم بہت متفکر تھے، اور اپنے مریدوں کو محفوظ رکھنے کی حکمتِ عملی تشکیل دینے میں زیادہ مصروف رہے۔

(۴) لاولد ہونا بھی ایک صدمہ ہے۔ اس صدمے نے اور فکر نے انہیں سجادگی میں زیادہ سنجیدگی یا دل چسپی کے قابل نہیں رکھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی کو سجادگی کے حکم نامے پر دستخط کر کے دیدیے تھے۔ لہٰذا لاولد ہونے کی وجہ سے پیر صاحب پگارا میں یقیناً گوشہ نشینی کی سی کیفیت ضرور پیدا ہو گئی ہو گی کیوں کہ یہ ایک فطری عمل ہے۔

لیکن اس کے باوجود مریدوں کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اسلاف کے نقشِ

قدم پر چلتے ہوئے کچھ نہ کچھ دینی خدمت ضرور کی جن میں تفسیر کا شایع کرنا نمایاں ہے پھر اپنے
مریدوں کو جہاد کے لیے تیار رکھنا بھی ایک دینی خدمت ہے۔اس کے علاوہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے
کہ یہ اپنی کم عمری اور بیماری کے باوجود محفہ میں بیٹھ کر دور دراز علاقوں کا دورہ کیا کرتے تھے، اور اللہ کی
رسی کو مضبوطی سے تھانے رکھنے کی تلقین اپنے مریدوں کو کیا کرتے تھے۔یہ بھی ایک دینی خدمت ہے
کہ انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں۔لہٰذا انھوں نے بھی متعدد مقامات پر اپنے حلقہ ہائے
ارادت منداں کے درمیان معض معاملات کو انصاف کے مطابق انجام دیا۔
اپنے اسلاف کے دینی ملفوظات کو محفوظ رکھنے میں بھی اپنی ذمہ داری ادا کی اور ان کے چند قلمی مخطوطات تیار
کرائے۔

سید شاہ مردان شاہ اوّل (م،۱۳۴۰ھ) پیر پگارا پنجم
المعروف بہ کوٹ دھنی

۷، سفر ۱۲۷۹ھ کو آپ پیدا ہوئے۔ پیر سید حزب اللہ شاہؒ پیر پگارا سوم (م،۱۳۰۸ھ) کے آٹھ بیٹوں میں سے چوتھے بیٹے تھے، اُن سے بڑے سید علی گوہر شاہ ثانی (م،۱۳۱۴ھ) کے بعد یہ سجادہ نشین ہوئے، آپ ایک عالم فاضل شخصیت کے حامل تھے، اور پیر سید محمد گیلانی شاہ (چناہ والے) سے بیعت ہوئے اور انہی سے تصوف و روحانیت کی تعلیم حاصل کرتے ہوئے سلوک کی منازل طے کیں۔ تصوف میں پیر و مرشد کا رشتہ بڑا مقدس و محترم ہوتا ہے، اسی احترام اور محبت کے باعث شاہ مردان شاہ اوّل کو بھی اپنے مرشد سے بہت محبت اور انسیت خاص تھی یہ ان کا بہت ادب و احترام کرتے تھے، بلکہ اُن کے عاشقوں میں شمار ہوتے تھے۔ انھوں نے درگاہ مبارک کے گرد ایک بڑی دیوار تعمیر کرائی تھی۔ ایسی بڑی اور مضبوط دیوار کو سندھی میں ''کوٹ'' کہتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو ''کوٹ دھنی'' کے لقب سے یاد کیا گیا اور اسی لقب سے یہ مشہور ہوئے۔

۲۷، جمادی الثانی ۱۳۱۴ھ کو جب یہ سجادہ نشین ہوئے تو آپ کے دوسرے بڑے بھائی سید علی مظفر شاہ نے دعویٰ کیا کہ اس کے اصل حق دار وہ ہیں۔ چناں چہ انھوں نے اپنے حق کے حصول کی خاطر عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا۔

شاہ مردان شاہ اوّل نے اس مقدمے کی پیروی کے لیے جس عظیم وکیل کا انتخاب کیا تھا وہ قابلِ ذکر ہے۔ علامہ الحاج ابوالحسان محمد رمضان علی قادری نے لکھا ہے:

> ''شاہ مردان شاہ اوّل سجادہ نشین نے مقدمہ کی پیروی کے لیے مسٹر محمد علی جناح (قائدِ اعظم) کو اپنا وکیل بنایا جو انہی ایام انگلینڈ سے تعلیم حاصل کر کے آئے تھے، انھوں نے بڑی قابلیت کے ساتھ مقدمے کی پیروی کی۔ پیر سائیں محافے دھنی کا وصیت نامہ عدالت میں پیش کیا گیا۔ نیز مولوی عبدالقادر اور دیگر سرکردہ فقراء نے بھی شاہ مردان شاہ اوّل کی بھرپور تائید کی، چناں چہ عدالت نے شاہ مردان شاہ اوّل کے حق میں فیصلہ صادر کر دیا۔ مقدمے میں کامیابی حاصل ہونے پر شاہ مردان

شاہ اوّل انہیں خوش ہو کر مسٹر جناح کو دعا دی کہ اللہ تعالیٰ آپ کا مرتبہ بلند کرے اور صاحب اقبال بنائے۔ آپ کی دعا کے طفیل مسٹر محمد علی جناح کو اس قدر بلند مرتبہ ملا۔ اور صاحب اقبال ہوئے کہ مسلمانوں کے قائدِ اعظم بن گئے۔ اور بانی پاکستان ہونے کا شرف حاصل کیا۔

مقدمے میں کامیابی کے بعد آپ نے اپنے تمام بھائیوں کے ساتھ انتہائی محبت اور حسنِ اخلاق کا برتاؤ کیا۔ انہیں زرعی زمین دی اور درگاہ مبارک کی جانب سے ان کے وظیفے مقرر کر دیے۔ اس حسنِ سلوک سے متاثر ہو کر آپ کے سب بھائی آپ سے راضی ہو گئے اور تمام اختلافات ختم کر دئے۔''(۱)

سیاسی حالات بدستور کشیدہ تھے ہر طرف افراط وتفریط کا عالم تھا انگریز حکومت بڑے علاقوں پر منظم طور پر قابض ہو چکی تھی حر جماعت سے متعلق افراد کیمپوں میں نظر بند تھے اور پگارا صاحب کے دور میں جو جوشِ جہاد تھا وہ پگارا پنجم کے دور میں محض اس وجہ سے سرد ہو گیا تھا کہ تنظیم سے متعلق افراد نے انگریزوں نے منتشر کر دیا تھا۔ اور مسلسل ان کی وفاداریوں کو زمینوں جائیدادوں کے عیوض خریدنے کی کوشش جاری تھی لہٰذا انھوں نے شاہ مردان شاہ اوّل کو بھی زیر کرنے یا اپنے زیرِ سایہ رکھنے کی کوشش کی اور مختلف حکمتیں اختیار کیں کہ وہ کسی طرح حر جماعت کی سرپرستی میں لچک لاتے ہوئے انگریز حکومت کی طرف جھکاؤ پیدا کریں اسی بات کے پیشِ نظر شاہ مردان شاہ اوّل کو بڑی بڑی پیش کشیں ہوئیں لیکن انھوں نے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ چناں چہ انگریزوں نے شاہ مردان شاہ اوّل کو اپنا ممنون اور احسان بنانے کی خاطر اپنے رویے میں نرمی اختیار کی اور انہیں ''شمس العلماء'' کا خطاب دیا۔ شاہ مردان شاہ اوّل نے محض اس وجہ سے اس خطاب کو قبول کر لیا کہ ان کی جماعت کیمپوں میں نظر بند تھی، دشمن کے خلاف کوئی حکمتِ عملی فی الحال اختیار نہیں کی جا سکتی تھی۔ اس موقع پر کچھ ترش لہجے کے ساتھ سارا انصاری لکھتیں ہیں:

''اب افسران حفظ ماتقدم کے مزید راستے ڈھونڈنے لگے، کیوں کہ وہ حروں سے تیسری دفعہ نبردآزما نہیں ہونا چاہتے تھے، لہٰذا ایک دورویہ منصوبہ تیار کیا گیا، جس کے تحت پہلے تو حر علاقہ میں دوسرے علاقوں سے غیر حروں کو لا کر آباد کیا گیا انہی دنوں اس علاقہ میں جمراؤ نہر مکمل ہوئی جو کئی سو ایکڑ رقبہ آباد کر سکتی تھی، اس علاقہ پر دریائے سندھ کے پار سے جوھی سے مری اور ریگستان سے کھوسہ

خاندانوں کو آباد کیا گیا، اس کے علاوہ دیگر بلوچوں، پٹھانوں اور پنجابیوں کو بھی آباد کیا گیا۔ ان میں اکثر پینشن یافتہ فوجی تھے، جن کی وفاداری پر کسی قسم کا شک نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ان کے علاوہ ان لوگوں کو بھی اراضی دی گئی، جنہوں نے ہنگاموں کے دوران سرکار کا ساتھ دیا تھا مثلاً سردار بگٹی کو سانگھڑ کے قریب چار ہزار ایکڑ اراضی کی گئی جس پر بگٹی قبیلے کے لوگ آباد کیے گئے۔ یاد رہے کہ سردار بگٹی نے ہنگاموں کے دوران حروں کو قابو کرنے کے لیے دو سو افراد کمک بھیجی تھی۔

منصوبے کا دوسرا اور زیادہ اہم حصہ یہ تھا کہ حروں کو مئی ۱۹۰۰ء میں جرائم پیشہ قبیلہ قرار دیا گیا، اس کا مقصد تقریباً ان پانچ ہزار حروں پر نظر رکھنا تھا جو مختلف علاقوں میں آباد تھے، انہیں خاص محدود بستیوں میں آباد کر دیا گیا۔ یہ لوگ اپنا ڈیرہ یا بستی دن کی روشنی ہی میں چھوڑ سکتے تھے، لیکن علی الصبح اور مغرب کے وقت حاضری پر موجود ہونا ضروری تھا۔ کوئی حر بغیر اجازت ڈیرے سے غیر حاضر نہ ہو سکتا تھا۔ تلاشی وغیرہ بھی لی جاتی تھی، دریں اثناء حر بچوں کے لیے تعلیم کا بندوبست بھی کیا گیا تھا۔"(۲)

تعلیم دینے کے اس منصوبے میں کوئی خیر خواہی یا ہمدردی نہیں تھی بلکہ انگریز یہ سمجھتے تھے کہ جہاد کا یہ جوش، شہادت کا یہ ولولہ اپنی زمین سے اتنی محبت، اپنے عقائد میں اتنی پختگی، اور اپنے دین کی ایسی سرشاری اس قوم میں اس لیے ہے کہ اس میں تعلیم کی کمی ہے کیوں کہ جس انداز میں یہ قوم اپنی جان ہتھیلی پر لیے آگ میں کود جاتی ہے، یہ عمل ظاہر کرتا ہے کہ اس میں عقل کو دخل کم ہے۔ لیکن انگریز کیا جانیں کہ "بے خطر کود پڑا آتشِ نمرود میں عشق" کی تشریح کیا ہے۔ اس لیے دشمن نے اپنے تئیں یہ سمجھا کہ تعلیم دینے سے اس قوم کے جذبات سرد ہوں گے اور ان میں مفاہمت کی کوئی راہ ضرور نکلے گی۔

بہرحال یہ صحیح ہے کہ سید شاہ مردان شاہ کو سجادگی بڑے پر آشوب دور میں ملی تھی، بیرونی حالات بھی سازگار نہیں تھے اور اندرونی حالات (یعنی خاندانی) مکمل طور پر ٹھیک نہیں تھے، اس لیے وہ اپنے تحریک کی کوئی نمایاں خدمت انجام نہیں دے سکے ادھر حروں کے مختلف گروہ اپنے طور پر سیاسی انتقام لینے کے لیے متعدد مقامات پر انگریز حکومت سے جھڑپیں کرتے رہے، ۱۸۹۵ء سے ۱۹۰۰ء تک کے دوران ان کی گوریلا جنگیں جاری رہیں۔ پگارا صاحب انگریزوں کا دباؤ بڑھتا گیا وہ یہ چاہتے تھے کہ سید شاہ مردان شاہ اپنے مریدوں کو اس گوریلا جنگ سے باز رکھیں۔ سید شاہ مردان شاہ کی کوشش بھی

تھی کہ فی الحال کسی قدر خاموشی اختیار کی جائے مگر گوریلا جنگیں کرنے والے حر اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ چناں چہ وقت کا تقاضہ اور سیاسی چال تو یہی تھی کہ سید شاہ مردان شاہ تحریک کو محفوظ کرنے کی کوئی راہ نکالیں کیوں کہ اس موقع پر اگر کوئی غلطی ہوتی ہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ یہ جماعت، یہ تحریک، یہ تنظیم، یہ مجاہد، ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائیں۔

اس دوران بچو فقیر نے نمایاں کردار ادا کیا اس نے مختلف نوعیت کے زبردست چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ جن کی وجہ سے سانگھڑ اور تھرپارکر کے علاقوں میں خوف و ہراس پھیل گیا اور حکومت مضطرب ہو گئی کہ کسی طرح ان چھاپوں کو روکا جائے۔ اس وقت مسٹر جیمس دوبارہ سندھ کا کمشنر بن کر آیا تھا، ۱۸۹۶ء کو دور تھا جب بچو فقیر کی گوریلا جنگ کا آغاز ہوا اور بہت کم وقت میں اس کا دائرہ اس قدر وسیع ہوتا چلا گیا کہ انگریز حکومت کو اپنی حکمتِ عملی تبدیل کرتے ہوئے بعض مقامات کو چھوڑنا پڑا۔ پولیس ناکامی کے ساتھ پیچھے ہٹ گئی تو حکومت کو اپنی فوج بلانی پڑی لیکن اس کے باوجود سانگھڑ اور تھرپارکر کے مقامات پر حروں نے اس قدر مضبوط اور منظم محاذ بنایا کہ فوج کے بھی قدم جمتے دکھائی نہیں دیتے تھے۔ کیوں کہ یہ علاقہ گوریلا جنگی نکتہ نظر سے بہت سازگار تھا اور کمین گاہیں ثابت ہوتا تھا۔ لیکن بہت جلد بچو فقیر کو ناکامی ہوئی جس کے اسباب ہمیں اس طرح ملتے ہیں۔

> ”انگریزوں اپنے نظام جاسوسی کو زیادہ کارآمد بنانے کے لیے مختلف جاسوسوں کو حروں کے بھیس میں ان کمین گوہوں کی طرف سے روانہ کیا جو بھیج پگارا کے نعرے لگاتے ہوئے مختلف اوقات اور اطراف سے بچو کے ساتھیوں سے مل گئے اور نہایت منافقت سے ان میں گھل مل گئے، جب بہت سے سربستہ رازوں سے واقف ہو گئے تو حکومت کو تمام کوائف سے آگاہ کر دیا، چناں چہ ان خبروں کی روشنی میں حروں کی کمین گاہوں کا محاصرہ کر لیا گیا، اور ان پر بم باری شروع کر دی جس سے جنگلات تباہ اور مورچے برباد ہو گئے، اور بے شمار مجاہدین موت کے گھاٹ اُتر گئے، اس بمباری نے حروں کو چھپنے اور بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

اِدھر حضرت پیر پگارا کو بھی نہایت دق کیا گیا اور ان پر حروں کی سرگرمیاں بند کروانے کے لیے زبردست دباؤ ڈالا گیا، پیر صاحب خود حالات کی ناسازگاری اور اپنے ملکی باشندوں کی اقتدار پرستی کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے، اس لیے پیر صاحب نے حروں کو معرکہ آرائی سے گریز کرنے

کی ہدایت کی چناں چہ پیر صاحب کی ہدایت پر حروں کی سرگرمیاں ماند پڑ گئیں ان حالات کو غنیمت سمجھ کر حروں پر ایسے مظالم ڈھائے کہ ان کی مثال پھر ۴۲-۱۹۴۳ء میں ملتی ہے۔ کئی خاندان تباہ ہو گئے بے شمار لوگ پھانسی پر چڑھ گئے اور جس کسی پر حر ہونے کا شبہ ہوا اسے گولی ماردی گئی۔ انگریزوں نے جس طرح ۱۸۵۷ء میں دہلی میں انقلابی پر ہر ظلم و ستم روا رکھا تھا۔ بعینہ یہ سلوک یہاں بھی کیا گیا۔ ان کی خون چکاں داستانیں زیب قرطاس نہ سکیں۔ کیوں کہ اس قدر ظالم و جابر لیکن مضبوط اور وسیع سلطنت کے مخالفین کا تذکرہ تاریخ کے اوراق میں شامل کرنا بڑے دل گردے کی بات ہے۔ بلکہ خود کو معتوب کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے بچو فقیر اور اس کے ہمرائیوں کے کارنامے صرف دلوں اور دماغوں میں محفوظ رہ گئے، اور وہ بھی استبدادِ زمانہ کے ہاتھوں موجودہ نسل تک پہنچتے پہنچتے تقریباً معدوم ہو گئے یا انہیں رہزنوں کی داستانوں کی حیثیت سے پیش کیا گیا۔''(۳)

مذکورہ بیان میں جس طرح واضح کیا گیا ہے کہ اس جنگ کو صحیح معنوں میں واضح نہیں کیا گیا اور کہیں ذکر بھی ہوا تو اسے رہزنوں کی داستان قرار دیا گیا ہے سے مراد یہ ہے کہ ''لب تاریخ سندھ'' جو یقیناً انگریز پرستی کی ایک یادگار ہے اس کتاب میں بھی مذکورہ واقعہ قلم بند کیا گیا ہے، لیکن کس قدر حقارت سے وہ لکھتا ہے:

''۱۸۹۶ء میں سرکار نے بچو موچی کو جو حروں (لروں) کا سرگروہ ہے ضلع تھر پارکر کے شہر سانگھڑ میں گرفتار کر لیا ہے۔ اس شادی پلی میں دربار منعقد کیا گیا اور پولیس اور دوسرے محکموں کے کئی عمل داروں کو جنھوں نے اس شریروں کے فتنے فرو کرنے میں سرکار کی اعانت کی تھی۔ تلواریں اور لنگیاں بطور انعام پیش کیں۔ نیز پیر پگارا کو اس سلسلے میں ان کی خدمات کے عیوض شمس العلماء کا خطاب دیا گیا۔''

اس بیان میں صداقت بالکل نظر نہیں آتی اس بات کا تجزیہ محققانہ انداز میں ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے کیا ہے۔ جب انھوں نے مذکورہ کتاب کو ایڈٹ کیا تو اس بیان کے صفحے کا ''پاورقِ حواشی'' بھی درج کیا جو اہمیت سے خالی نہیں۔ اس کی تفصیل اور تشریح ڈاکٹر نبی بخش بلوچ نے اس طرح کی ہے:

''مؤلف نے بچو کو موچی لکھا ہے۔ حالانکہ وہ خاصخیلی تھا، جس کا ایک ساتھی گلو تھا، حروں کی

انگریزی سرکار کے خلاف یہ دوسری مہم ۹۶-۱۸۹۵ء میں گیارہ سالاروں کی رہنمائی میں شروع کی گئی تھی، ان میں سے آٹھ کے نام مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) بچو خاصخیلی جس کا لقب بادشاہ تھا، یعنی بچو بادشاہ۔

(۲) پیر بخش وسان جس کا لقب وزیر تھا۔

(۳) گلو موچی

(۴) تکیہ چانگ

(۵) بھلو گاہو

(۶) خمیسہ وسان

(۷) خنلہ قاضی

(۸) فلاں قصائی

۱۸۹۸ء میں بھی حروں نے ایک بار پھر جنگ شروع کر دی تھی، مگر حضرت پیر پگارا کے حکم سے جلد ہی اس کا خاتمہ ہو گیا یوں تو اس کے بعد وقتاً فوقتاً چھوٹی موٹی جنگیں ہوتی ہی رہتیں تھیں، مگر مذکورہ جنگیں بڑے پیمانے پر ہوئی تھیں، دراصل حروں کے نزدیک انگریزوں کا وجود اس سرزمین کے لیے کوڑ کی حیثیت رکھتا تھا جسے وہ جلد از جلد دور کرنا چاہتے تھے، انہیں اپنے مرشد سے بے پناہ عقیدت تھی۔ اس کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ وہ اُن کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تیار رہیں اگر چہ مرشد کے حکم سے انہیں جنگ بھی بند پڑی تھی مگر اُن کا جذبۂ جہاد انہیں بے چین رکھتا تھا اور زرہ سا اشتعال پیدا ہونے پر بے دریغ حکومت سے ٹکرا جاتے تھے۔

آپ زرہ غور کریں اتنی بڑی سلطنت سے متواتر ایک صدی تک ٹکراتے رہنا کس قدر بہادری اور استقامت وعزیمت کی بات ہے افسوس ہے کہ تاریخ کے تذکروں میں اُن کا کہیں ذکر نہیں

ملتا۔ہم ایسے مجاہدوں کی روح کو سلام کہتے ہیں جنہوں نے آزادی کے لیے اپنی جانیں قربان کیں اور آنے والوں کے لیے ایسے نقوش چھوڑ گئے جن پر چل کر ۱۹۴۷ء میں قوم حقیقی آزادی سے ہم کنار ہوئی۔ہم اُن بزرگوں کی روحوں کو بھی سلام کرتے ہیں جنہوں نے یہ بیج بویا اس کی آبیاری کی اور ہمیں آزادی اور حریت کی داستانوں کا قیمتی سرمایہ عطا کیا۔"

دینی خدمات

سید شاہ مردان شاہ اوّل نے زیادہ وقت حکومتی معاملات کو نمٹانے میں اور اپنی جماعت کو منظم کرنے میں صرف کیا لیکن اس کے باوجود آپ نے اپنی نگرانی میں درج ذیل کام انجام دیے:

(۱) ۲۷، رجب کو معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تقریب منانے کا شایانِ شان انتظام۔

(۲) مسجد سے ملحق مدرسے کی توسیع اور وسیع بنیادوں پر یہاں کی تعلیم کو مؤثر بنانے کا اہتمام۔

(۳) جشنِ معراج کی جلسے میں مشہور علماء کو دعوت دیکر بلانا مجلس وعظ کے بعد علماء کو نقد عطیات اور عمدہ خلعت سے نوازنا۔

(۴) عوام کو دعوت دینا کہ وہ علماء کرام کے وعظ سے مستفیض جلسوں میں شرکت کریں۔

(۵) قرآنی تعلیمات کو عالم کرنے کے لیے علماء کرام کو متحرک رکھنا اور ان کی عزت وتوقیر میں محفلوں کا انعقاد کرنا۔

(۶) درگاہ شریف کی مسجد کو توسیع دینا مرمت وآرائش کرنا۔

(۷) حرتنظیم کو منظم کرنے اور درونِ خانہ ان کے جذبۂ جہاد کو سراہنہ۔

(۸) مسجد میں تفسیر قرآن کی محافل کا انعقاد کرنا۔

(۹) غرباء کے لیے طعام ولنگر کا انتظام درگاہ کی طرف سے کرنا۔

(۱۰) اتحاد اور یکجہتی کے جذبے کو فروغ دینا۔

بظاہر یہ دس نکات ہیں، لیکن ان پر عمل کرنا ایک راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کی دلیل ہے۔ جیسا کہ ہم عرض کر چکے ہیں کہ سید شاہ مردان شاہ خود بھی عالم و فاضل شخصیت تھے، انھوں نے اپنے کردار سے بھی ایسا عمل جاری رکھا جو دوسروں کے لیے باعثِ تقلید تھا۔ انہوں نے بھی اپنے دور میں انصاف کے تقاضے پورے کیے، روحانی تعلیمات سے خود مزین تھے اس لیے چاہتے تھے کہ لوگ اس تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ اور ذکر کو اپنا شعار بنائیں۔ اس جذبے اور عمل سے ایسے حالات میں بھی جو سیاسی اعتبار سے ناگفتہ بہ تھے، اس خطے میں دینی رجحان کو عام کرنے اور اسے فروغ دینے میں بھرپور توجہ دی اگر چہ حالات ایسے تھے کہ مختلف علاقوں میں گوریلا جنگیں چل رہی تھیں لیکن اس کے باوجود انہوں نے درگاہ کی وقار کو بر قرار رکھتے ہوئے اپنے اسلاف کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دینی تحریک کو پامال نہیں ہونے دیا اور ہر اعتبار سے کوشش کی کہ مسلمانوں کے معیارِ زندگی میں اضافہ ہو۔

ان کی نیک نیتی اور عملِ پیہم سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر انہیں سازگار ماحول ملتا، اس قدر افراط و تفریط نہیں ہوتی، اطمینان و سکون میسر آتا، سیاسی پیچیدگیاں نہ ہوتیں تو یقیناً وہ اپنے دور میں دینی اعتبار سے کارہائے نمایاں انجام دیتے۔ لیکن اس کے باوجود مذکورہ نکات سید شاہ مردان شاہ کو ایک مخلص اور دین دار مسلمان ثابت کرتے ہیں۔ جنہوں نے وقتاً فوقتاً مسلمانوں میں اسلام سے محبت اور دین سے لگاؤ پیدا کرنے کے لیے ایسے جلسے منعقد کیے اور اپنے دور کے جید علماء کو اپنے ہاں مدعو کیا جواز خود علمی اعتبار سے ایک تاریخ کہے جا سکتے ہیں۔

حواشی

(۱) ''مخزنِ فیضان'' جمعیت علمائے سکندریہ مطبوعہ: ۲۰۰۱ء صفحہ: ۴۲۴ تا ۴۲۵

(۲) سارا انصاری ''سندھی پیر اور برطانوی راج'' فکشن ہاؤس لاہور مطبوعہ: ۱۹۹۶ء صفحہ ۹۸-۹۹

(۳) تبسم چودھری ''تذکرہ پیرانِ پاگارا'' انڈس پرنٹرز حیدرآباد، مطبوعہ: جولائی ۱۹۷۵ء صفحہ ۱۵۵ تا ۱۵۶

پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانیؒ (م،۱۹۴۳ء) پیر پگارا ششم
المعروف بہ پگ دھنی

پیر شاہ مردان شاہ اوّل کے تین بیٹے تھے۔

(۱) سید علی حسین شاہ

(۲) سید محمد صبغت اللہ شاہ ثانی

(۳) سید راحم شاہ

پیر سید محمد صبغت اللہ شاہ ۱۳، صفر ۱۳۲۷ھ کو پیدا ہوئے، آپ کا نام اس خاندان کے پہلے پیر پگارا سید صبغت اللہ شاہ اوّل (م،۱۲۴۶ھ) پر رکھا گیا۔ ابھی آپ کی عمر بارہ برس ہی تھی کہ ان کے والد سید شاہ مردان شاہ (م،۱۳۴۰ھ) کا وصال ہوا تو انہیں سجادہ نشین کے فرائض سنبھال نے پڑے۔ شروع ہی سے آپ کو ایسے بزرگوں کی صحبت اور محفل سے سر فراز ہونے کے مواقع ملے کہ آپ نے دینی مسائل کو سمجھنے میں اور علوم باطنی کو حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ سجادگی کے فوراً بعد ہی آپ نے اپنی جماعت ترتیب و تنظیم از سرِ نو کرنے کی شروعات کی، اور اس دوران دور دراز مریدوں کو بھی اپنے رابطے اور مراسم کی لڑی میں پرولیا۔

اس وقت آپ کی عمر تو زیادہ نہیں تھی لیکن برد باری، سنجیدگی، خدا ترسی، اور دین داری آپ کی شخصیت کا حصہ تھی، آپ کے عادات واطوار اور افعال و کردار میں ایک پکا مسلمان صاف نظر آتا تھا جس کی ایک واضح مثال یہ ہے کہ جب آپ سجادہ نشین ہوئے تو اپنے چچا مرحوم پیر علی گوہر شاہ (م،۱۳۱۴ھ) کے نام پر انگریزوں کا دیا ہوا ایک ''آفرین نامہ'' بنگلے کی دیوار پر آویزاں دیکھ کر کہا تھا: ''ہمارے بزرگ بھی کس قدر سادہ لوح تھے۔ خداوند تعالیٰ نے انہیں بڑی عزت بخشی تھی لیکن پھر بھی یہ آفرین نامہ موجود ہے''۔ روایت ہے کہ پیر صاحب پگارا نے یہ کہتے ہوئے فریم توڑ کر آفرین نامہ پرزے پرزے کردیا۔ اس روایت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ نے جواں مردی، حوصلہ مندی، جہاد پسندی، عزتِ نفس، حریت

پسندی اور سجاعت ووجاہت تھی، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے سب سے بڑا اعزاز اسی کو جانا جو اللہ کی طرف سے عطا ہو۔لیکن آپ کے اس عمل سے دشمن کو یہ بھی واضح ہوگیا کہ ان میں انگریزوں سے مفاہمت کی قطعاً گنجائش نہیں ہے اور مستقبل قریب میں بہت سخت مجاہد صفت پگارا ثابت ہوں گے۔اس طرف بچو فقیر کی تحریک کے اثرات ابھی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئے تھے لہٰذا انگریزوں نے ان کے خلاف سازشیں تیار کرنا شروع کر دیں تھیں اور اسی دوران، درونِ خانہ حالات کچھ اس انداز سے بگڑے کہ مریدوں میں کچھ غلط فہمیاں پھیل گئیں۔جس سے آپ کا بھتیجا شاہ بن حسین علی شاہ اور آپ کے برادر خورد سید راحم شاہ آپ سے برگشتہ خاطر ہو گئے۔اور جماعت میں بھی انتشار برپا ہو گیا۔اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریز نے ایک عجیب سازش تیار کی جس کی تفصیل ہمیں اس طرح ملتی ہے:

> ''انگریز حکمران جو پیرانِ پگارا پر ہاتھ ڈالنے کے لیے مدت سے انتظار میں تھے، انہوں نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔چناں چہ بتاریخ ۲۶، مارچ ۱۹۳۰ء ایس پی سکھر، جی، جی، رے۔پولیس کی بھاری جمیعت لے کر طلوع فجر کے وقت درگاہ مبارک آن پہنچا۔پیر صاحب ہنوز اپنی آرام گاہ میں محو خواب تھے، اور نا معلوم وجوہ کی بنا پر بیرونی شاہی دروازہ اور اندرونی لکھی دروازہ دونوں کھلے ہوئے تھے۔پولیس بغیر کسی رکاوٹ کے آپ کی آرام گاہ میں داخل ہوگئی۔سب انسپکٹر غلام اکبر بلوچ نے آپ کے اسلحہ پر قبضہ کر لیا اور آپ کو گرفتار کر لیا۔آپ کو سینٹرل جیل سکھر پہنچا کر ناجائز اسلحہ رکھنے، قتل اور دیگر الزامات کے تحت سٹی مجسٹریٹ سکھر مسٹر ادھارام مدن داس کی عدالت میں آپ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا گیا۔یہ مقدمہ ۲۳، اپریل ۱۹۳۰ء کو زیرِ سماعت آیا۔
>
> آپ کے خلاف حکومتِ برطانیہ کی جانب سے دو بڑے وکیل پیروی کے لیے مقرر ہوئے۔ایک وکیل مسٹر بولو انگریز تھا، اور دوسرا مسٹر کندن داس ہندو تھا۔پیر صاحب کی جانب سے بڑے وکیل مسٹر محمد علی جناح قائدِ اعظم اور ان کے دو مددگار وکیل مسٹر احمد علی اور صاحب سنگھ مقرر ہوئے۔مسٹر محمد علی جناح نے صرف دو دن مقدمے کی پیروی کی۔انہوں نے مسٹر بولو کے دلائل کے دندان شکن جواب دیے اور اپنے دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ پیر صاحب کے خلاف یہ مقدمہ جھوٹ اور بد نیتی کی بناء پر قائم کیا گیا ہے، جس کی کچھ حقیقت نہیں۔''(۱)

بیرسٹر محمد علی جناح کو معلوم ہو گیا تھا کہ یہ لوگ پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی کو سزا ضرور دیں گے۔ اس کے باوجود انہوں نے مقدمے کی پیروی کی لیکن جب دیکھا کہ جج انصاف کے تقاضے پورے نہیں کر رہا اور قانون کی بالادستی قائم نہیں ہے تو یہ احتجاجاً کوٹ سے چلے گئے اور حکومت نے پیر صاحب کو دس سال قید کی سزا دیکر سکھر جیل سے لاڑکانہ جیل میں پہنچا دیا گیا اور اس کے بعد سینٹرل جیل کراچی منتقل کر دیا گیا، اور وہاں سے بحری جہاز کے ذریعے بمبئی سے قریب رتنا گری جیل لایا گیا، اس کے بعد آپ کو مدنا پور، ڈھاکہ اور راج شاہی کی جیلوں میں منتقل کیا جاتا رہا۔ آخر میں ایک مرتبہ پھر مدنا پور لایا گیا یہیں سے سات برس قید و بند کی صعوبتیں جھیلنے کے بعد آپ رہا ہوئے اس دوران آپ کے بڑے خلیفہ سید بچل شاہ وفات پا چکے تھے، اس کی وفات کے بعد کچھ عرصے تک خلیفہ حسین درس نے درگاہ اور جماعت کا انتظام سنبھالا، پھر حاجی موسیٰ وسان اور جلال فقیر راجڑ یہ انتظام چلاتے رہے۔

آپ نے رتنا گری جیل میں اپنے جدِ امجد حضرت سید محمد راشد روضے دھنی (م ۱۲۳۳ھ) کے ملفوظات کا گہرا مطالعہ کیا اور اس کے ساتھ اردو فارسی سندھی کی بہترین کتابوں سے استفادہ کیا اور اپنے پند و نصائح کا ایک مجموعہ بھی تیار کیا۔ مدنا پور کی جیل میں آپ کی ملاقات ہندوستان کے نامور رہنماؤں سے ہوئی جس کے بعد آپ نے ہندوستان کی سیاسی صورتحال اور مستقبل میں رونما ہونے والی صورتِ حال کا بغور جائزہ لیا، اور یہ فیصلہ کیا کہ ہندوستان سے انگریزی فوج کو بزورِ بازو نکالنا ضروری ہو گیا ہے۔

پیر صبغت اللہ شاہؒ اس جھوٹے کیس کی سزا کاٹ کر ۱۷ رمضان ۱۳۵۵ھ کو درگاہ مبارک (پیر گوٹھ) پہنچے، مخزنِ فیضان کا مصنف لکھتا ہے:

> ''مولوی حاجی فیض محمد راجڑ نے پیر صاحب کو مشورہ دیا کہ آپ خود کو صرف ذکر و فکر اور عبادتِ الٰہی کے لیے وقف کر دیں، اور جماعت کی تعلیم و تربیت میں مصروف رہیں۔ اس کے علاوہ کسی دوسرے معاملے سے قطعاً سروکار نہ رکھیں... پیر صاحب نے اس مشورے کو قبول کیا، اور اسی سال آپ فریضۂ حج کی ادائیگی کے لیے حرمین شریفین تشریف لے گئے۔ فریضۂ حج ادا کر کے آپ مدینہ منورہ حاضر ہوئے، سرکارِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ اقدس میں حاضری دے کر بحری جہاز سے آپ وطن واپس آئے اس کے بعد جمادی الثانی ۱۳۵۶ھ میں جماعت کے فقراء کو تعلیم و تربیت دینے

کے خاطر تفصیلی دورہ کیا، آپ روہڑی کے علاقوں کا دورہ کرتے ہوئے ضلع رحیم یار خاں میں آئے، پھر شاہ گڑھ کا دورہ کرتے ہوئے جیسلمیر پہنچے۔" (۲)

اس دورے سے جماعت میں نئی روح بیدار ہو چکی تھی اور یہ لوگ ایک مرتبہ پھر جذبۂ جہاد سے سرشار ہو چکے تھے، تنظیم کو اس طرح منظم دیکھ کر انگریز سرکار کو پیر صبغت اللہ شاہ سے شدید خطرہ محسوس ہونے لگا، لہٰذا انہوں نے ایک مرتبہ پھر انتشار کی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی، تبسم چودھری اس ضمن میں لکھتیں ہیں:

"انگریز سرکار کی طرف سے حضرت پیر صاحب کے نظریات، رجحانات اور عزائم کو جانچنے کی یہ آخری کوشش تھی۔ چناں چہ اس کے بعد حکومت کو یقین ہو گیا کہ پیر صاحب کی وفاداری مشکوک ہے، اس عرصے میں پیر صاحب کے خاص مریدوں اور خلفاء کے خلاف کاغذی کارروائیاں پوری ہو چکیں تھیں، پیر صاحب نے اپنا مرکز اب گڑنگ کو بنا لیا تھا۔ کیوں کہ آپ کے عزائم کی تکمیل کے لیے یہ بہترین پناہ گاہ تھی اور آپ کا خیال تھا کہ یہاں کم از کم چھ ماہ تک قیام کیا جائے۔ آپ نے خاص دستہ تیار کر کے اسے مناسب جنگی تربیت دلائی۔ اور اسے ہر لحاظ سے آزما کر اطمینان کر لیا۔ آپ کے مریدوں میں انگریزوں کے خلاف زبردست نفرت پائی جاتی تھی... آپ کے ارادوں کا کسی کو علم نہ تھا۔ اگرچہ جنگی تربیت آپ کے عام مریدوں میں باقاعدہ جاری تھی۔ لیکن انگریز حکومت چوں کہ آپ کو باغی تصور کرتی تھی اس لیے اس کے نزدیک آپ سے بالواسطہ ٹکر لے کر آپ پر گرفت کرنا بے حد ضروری تھا اور وہ موقع کی تلاش میں تھی چناں چہ اس اسکیم کو کامیاب بنانے کے لیے مندرجہ ذیل طریقے اختیار کیے گئے۔

"(۱) ہر قسم کے جرائم میں بغیر کسی تحقیق و تفتیش کے حروں کو ان کا مورد الزام ٹھہرایا گیا۔ اور ان میں سے خاص خاص بہ اثر لوگوں کو گرفتار کرنے کے لیے کاغذات مکمل کر لیے گئے۔

(۲) ہر چھوٹے بڑے حر کے لیے یہ لازمی قرار دیا گیا کہ اپنے حلقے کے تھانے میں ہر ہفتے میں ایک بار ضرور حاضری دے۔ بعض حروں کے لیے ہفتے کے بجائے روزانہ حاضری کی پابندی عائد کر دی گئی۔

(۳) گڑنگ والے بنگلے پر پولیس کا ایک دستہ نگہبانی کے لیے مقرر کر دیا۔" (۳)

پیر صبغت اللہ شاہ ثانی نے ان پابندیوں کے خلاف حکومت سے مختلف اوقات میں احتجاج کیا مگر ان کی جانب

سے کوئی خاطر خواہ عمل درآمد نہیں ہوا، اوران کی درخواست کو کسی قدر رد کر دیا گیا۔ ان کی جانب سے قابلِ غور بات یہ تھی کہ حروں کی روزانہ حاضری کو ضروری قرار نہیں دیا جائے۔ کیوں کہ یہ لوگ آٹھ آٹھ دس دس کوس روز یہ حاضری دینے کی مشکل سے گزرتے ہیں ایسے میں ان کا ذریعہ معاش شدید متاثر ہوتا ہے۔ اور یہ ظلم ان پر اس لیے ہے کہ یہ حر ہیں۔ اور یہ عمل انصاف، قانون، اور انسانیت کے بالکل خلاف ہے لیکن حکومت نے اس احتجاج اور درخواست پر کوئی غور نہیں کیا بلکہ کسی قدر اپنی جانب سے سختیوں میں اور اضافہ کر دیا آخر کار پیر صبغت اللہ شاہ ثانی نے حروں کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے انہیں یہ حکم دیا کہ روزانہ حاضری دینے والے اب تھانے نہیں جائیں۔

اس حکم کو انگریز کے خلاف ان کی طرف سے پہلی آوازِ جنگ، طبلہ جہاد، نقارۂ جنگ وجدل اور اس مجاہدِ اعظم کی طرف سے پہلی للکار کہنا چاہیے۔ اپنے مرشد کی طرف سے حکم پاتے ہی جیسے حروں میں زندگی کے آثار بیدار ہو گئے ہوں، بظاہر تو وہ حاضری نہ دینے کے روپوش ہو گئے لیکن اندر ہی اندر جذبۂ جہاد پروان چڑھنے لگا۔ حکومت نے پیر صاحب پر زور دیا کہ وہ حاضری کی اس شرط کو پورا کروائیں ایں جانب سے جواب ہوا کہ حکومت انہیں خود ڈھونڈ لے۔ اس عمل سے دونوں طرف خلش اور خلیج بڑھتی گئی اور انگریز نے نہ صرف یہ کہ روپوش مریدوں کو تلاش کرنے کی مہم شروع کی بلکہ باقی جماعت کے افراد کی معلومات بھی جمع کرنا شروع کر دیں۔ نیز یہ عمل بھی اختیار کیا گیا کہ خود پیر صاحب کے خلاف حکومت نے سازشوں اور رپورٹوں کی تیاری بھی شروع کر دی۔ ایسے وقت پر جب تفتیشی افسران پیر صاحب سے ملاقات کرتے تو پیر صاحب انہیں وہ عزت نہیں دیتے جس کے یہ عادی تھے۔ یہ عمل دیکھ کر مقربین نے آپ کو مشورہ دیا کہ اس وقت مناسب ہے کہ ان سے ایسا رویہ اختیار کیا جائے جس سے یہ خوش ہو جائیں اور ان کی جانب سے ہونے والی سختی نرمی میں بدل جائے، لیکن مضبوط ارادوں کے حامل پیر صاحب نے کیا عمدہ بات کی:

"رشوت دینا ہمارے مذہب میں حرام ہے۔"

بالآخر وہی ہوا کہ پیر سید صبغت اللہ شاہ کو نظر بندی کی صعوبت اٹھانی پڑی اور انہیں گڑنگ سے کراچی منتقل کر دیا گیا۔ اس موقع پر ہم ایک مرتبہ پھر تبسم چودھری سے رجوع کرتے ہیں:

"سر غلام حسین ہدایت اللہ سندھ نے آپ سے کہا کہ نظر بندی کے قانون کے تحت آپ کو کراچی ہی میں رہنا پڑے گا آپ باہر نہیں جا سکتے۔ آپ نے فرمایا اگر ہم نے کوئی جرم کیا ہے تو سرکار

ہم پر مقدمہ چلائے۔ یہ کوئی طریقہ نہیں ہے کہ آپ نے ہمیں کراچی میں بلا کر ہمیں یہاں نظر بند کرنے کی دھمکی دی ہے، ہمیں اس سلسلے میں تحریری حکم نامہ دیا جائے تاکہ ہم اس کی خلاف ورزی کریں۔ مگر اس کا کوئی جواب نہیں دیا گیا، آخر آپ نے سر غلام حسین ہدایت اللہ سے کہا کہ یہ نظر بندی بالکل بے قاعدہ اور غیر قانونی ہے اور ہم یہاں کسی صورت میں نہیں رہیں گے۔ آپ کو جو کچھ کرنا ہے کرلو۔ اس کے بعد آپ راتوں رات موٹر کے ذریعے کراچی سے گڑنگ پہنچ گئے، اب آپ کو یقین ہو چکا تھا کہ حکومت آپ کے خلاف ضرور کاروائی کرے گی۔ اس لیے آپ نے خاص مریدوں کو حکم دے دیا کہ اگر معاملہ بگڑ جائے تو با قاعدہ منظم ہو کر ہماری دی ہوئی ہدایت کے مطابق اپنی جدو جہد جاری رکھیں ۔ اس کے بعد آپ درگاہ شریف (کنگری) پہنچے وہاں بھی ضروری احکام دیے۔ دوسرے دن آپ کو کراچی لے جا کر نظر بند کر دیا گیا''۔(۴)

پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی کے خلاف مقدمہ درج ہوا اور کاروائی کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ ان پر بغاوت، قتل، افراتفری پھیلانے کے الزامات عائد کیے گئے۔ اور اس خوف سے کہ کہیں مقدمے کی کاروائی کے دوران جماعت میں انقلاب پیدا نہ ہو جائے لہٰذا انہوں نے گڑنگ والے بنگلے کا محاصرہ کرلیا۔ اس سے اریب قریب جتنی جھونپڑیاں تھیں ان میں آگ لگا دی بنگلے پر بم باری کی گئی گویا اس علاقے کو کھنڈرات میں تبدیل کر دیا گیا۔ اس کاروائی نے حروں کو بھی مجبور کر دیا کہ وہ شدید جوابی کاروائی کو اختیار کریں۔ اس کے نتیجے میں علاقے میں ایک زبردست جنگ شروع ہوگئی انہوں نے ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ متعدد لوگوں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ ان غازیوں اور بہادروں نے جم کر مقابلہ کیا اور دشمن کے دانت کھٹے کر دیے، ہزاروں نہیں لاکھوں افراد کا ایک لشکر تھا جو اس جہاد میں شریک تھا۔ اس میں بزرگوں کے علاوہ نوجوان بلکہ بچوں کی تعداد بھی کم نہیں تھی۔

اعجاز الحق قدوسی ''تاریخ سندھ'' میں لکھتے ہیں:

''پیر صاحب بے حد موثر ثابت ہوئی اور پیر صاحب کے غیر حاضری کے باوجود حر غازیوں نے انگریزوں سے جنگ جاری رکھی سندھ کی عوام نے بھی اس جنگ میں حصہ لیا۔ فوج اہل سندھ پر مارشل لا کی صورت میں ایک عذاب نازل کرتی رہی۔ پیر گوٹھ اور گڑنگ میں حروں کے مکان نذر آتش

کیے گئے۔ حر بلکہ عام مرید بھی گرفتار کیے گئے۔ بہت سوں کو جیلوں اور کیمپوں میں بند کر دیا گیا۔ ہزاروں بے گناہ شہید، سیکڑوں عورتیں بیوہ اور ہزاروں بچے یتیم ہو گئے۔

اس ظالمانہ ماحول میں سندھ کے بڑے بڑے زمین دار اور وڈیرے خاموش تماشائی بنے تماشا دیکھتے رہے اور اس ظلم پر کسی کو مجال دم زدن نہ تھی۔" (۵)

اس حالت میں پیر صاحب پر بھی شدید ظلم ڈھائے گئے۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے ذاتی کتب خانے میں محفوظ "تذکرہ پیرانِ پاگارا" (ذاتی نسخہ) کے صفحہ ۱۸۶ پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کے دستخط سے ایک حاشیہ درج ہے:

"پیر صاحب کو سیونی (CP) کے جیل میں بھی رکھا گیا۔ وہاں کے مسلمان ان سے ملنے جاتے تھے، پیر صاحب فرماتے تھے کہ مجھے ایک مرتبہ تو حروں کو خطاب کرنے دو۔ اگر وہ صحیح نہ بن جائیں تو مجھ پر مقدمہ چلاؤ۔

ایک شیعہ پولیس آفیسر مجھ سے کہتے تھے، کہ پیر صاحب پر اتنے ظلم ڈھائے گئے ہیں کہ حضرت امام حسینؓ پر بھی نہ ہوئے ہوں گے، پیر صاحب اس قدر قوی ہیکل تھے کہ ان کی کلائیاں ہمارے دو دو کلائیوں کے برابر چوڑی تھیں۔" (۶)

مقدمے میں دوران انگریز حکومت نے کوشش کی کہ پیر صاحب ان سے معافی مانگ لیں اور آئندہ جدوجہد آزادی سے کنارا کشی اختیار کر لیں، اس طرح انہیں پھانسی سے بچایا جا سکتا ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ حکومت ان کے لیے فیصلہ عدالتی فیصلہ ہونے سے پہلی ہی "فیصلہ" کر چکی تھی، اس پیش کش کو سننے کے بعد اس مرد مجاہد نے واضح الفاظ میں کہا:

"شہادت ہمارا تاج ہے اسے آگے بڑھ کر پہن لینا ہمارے لیے عبادت ہے، ہم نے صرف آزادی کو چاہا ہے اور یہ کوئی جرم نہیں ہے، انسان سے معافی مانگنے کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ہم تو صرف اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔"

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے لیے اس قدر جدوجہد کرنے والا شخص، جس کے پہلے مقدمے کی پیروی خود قائداعظم محمد علی جناح کر چکے تھے، یعنی قائداعظم پیر صاحب سے اور ان کی شخصیت سے خوب اچھی طرح واقف تھے،

پھر یہ واقعہ پورے ہندوستان کے سیاسی افق پر سورج کی طرح روشن تھا، تو مسلم لیگ جو اس وقت مکمل طور پر منظم تھی اور پورے ہندوستان میں مسلمانوں کی نمائندگی کر رہی تھی تحریک آزادی کے اس مردِ مجاہد کی کاوشوں کو کیوں نہیں سراہا گیا یا انگریز حکومت کے خلاف مسلم لیگ کی طرف سے کیوں آواز بلند نہیں ہوئی۔ اس کے جواب میں تبسم چودھری نے اپنی تصنیف کے صفحہ ۱۸۶، پر اس طرح دیا ہے:

''جابر انگریز حکمرانوں کا سندھ پر اس قدر خوف طاری تھا کہ یہاں کسی کو کلمہ حق کہنے کی توفیق نہ تھی۔ حالاں کہ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے نوجوانوں کا ایک وفد دہلی میں مرحوم لیاقت علی خاں سے ملا اور انہوں نے پیر صاحب کی حمایت میں بہت کچھ کہا۔ مرحوم نے اس وفد کی باتیں سن کر کہا ہم تو پیر صاحب کی خاطر بہت کچھ کرنا چاہتے ہیں لیکن سندھ کے مسلم لیگیوں میں کوئی دم نہیں ہے۔ اس لیے ہم کیا کر سکتے ہیں؟ نہایت افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ سرزمینِ سندھ کے اس مجاہد اعظم کی حمایت میں سندھ کے کسی کونے سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔''

بالآخر حکومتِ برطانیہ نے پیر صاحب پگارا سید صبغت اللہ شاہ ثانی سنٹر جیل حیدر آباد میں منتقل کیا اور خصوصی ملٹری کورٹ قائم کر کے ان کے خلاف تاج برطانیہ سے مسلح بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا اور ملٹری کورٹ کے سربراہ مسٹر رچرڈسن نے آپ کو سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا۔

سزائے موت سننے کے بعد بھی ایک انگریز افسر کی شہادت ہے کہ ''لیمبرک یا مسٹر کوپر'' آپ کے ساتھ رات کو شطرنج کھیلنے آیا کرتا تھا اور ہر روز ہار جاتا تھا۔ پھانسی ملنے سے ایک رات پہلے وہ انگریز اس خیال سے آیا کہ پیر صاحب اپنے انجام کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ذہنی کشمکش میں مبتلا ہوں گے۔ اور وہ آسانی سے بازی جیت لے گا، لیکن اسے حیرت ہوئی کہ اس رات بھی پیر صاحب نہایت صبر و سکون سے بازی کھیل رہے تھے، وہ آپ کے سکونِ قلب اور اطمینانِ ذہن کو دیکھ کر ششدر رہ گیا، پیر صاحب نے اسے طلسم حیرت کدہ میں دیکھ کر فرمایا: ''حق کی راہ میں شہادت حاصل کرنا تو میرے آباؤ اجداد کی سنت ہے۔ ہم جس چیز کو حق سمجھتے ہیں اس کی خاطر ہنستے کھیلتے پھانسی کے تختے پر چڑھ جانا ہمارے لیے عین عبادت ہے۔ ہم غلام بننے کے لیے پیدا نہیں ہوئے بلکہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنا ہمارا مقصدِ حیات ہے۔''

اس کے بعد پیر صاحب نے نوافل ادا کیے اور تا دیر عبادت میں مشغول رہے اور اس کے بعد خود سپرنٹنڈنٹ جیل

سے کہاوقت ہو گیا ہے اب چلنا چاہیے۔ ہفت روزہ ''لیل ونہار'' کا کہنا ہے:

''پیر صاحب پگارو ششم کو انگریز کی فوجی عدالت نے سزائے موت دیدی، مہینوں مارشل لا کے تحت مقدمہ چلتا رہا اور سزا کا فیصلہ کر لیا گیا، لیکن صرف چند گھنٹے پیشتر اس مردِ حق کو اس کی اطلاع دی گئی، کیوں کہ انگریز سامراجیوں کو یقین تھا کہ اگر سزائے کا موت کا اعلان پہلے کر دیا گیا تو حر مجاہدین اپنی جان کی بازی لگا کر بھی پیر صاحب کو لے جائیں گے۔ اور کسی جیل کی دیواریں بھی ہر مجاہدین کے لیے ناقابلِ تسخیر ثابت نہ ہوں گی۔ سید صبغت اللہ شاہ کو جب بتایا گیا کہ چند گھنٹوں کہ بعد انھیں پھانسی کے تختے پر جانا ہے تو انہوں نے کسی اضطراب کا اظہار نہیں کیا۔ نوافل ادا کیے ان کے اعصاب کی مضبوطی اور اطمینان کا یہ عالم تھا کہ سپر نٹینڈنٹ نے فرمائش کی کہ وہ میرے ساتھ شطرنج کی آخری بازی کھیلیں۔ انہوں نے سپر نٹینڈنٹ جیل کو تین بار مات دی اور اس سے کہنے لگے کہ تم پریشان ہو چکے ہو اس لیے اچھی طرح نہیں کھیل رہے ہو۔ اور نوافل پڑھنے میں مصروف ہو گئے ۔ پھانسی کے مقررہ وقت سے ذرا پہلے عبادت ختم کی اور جب وقت ہو گیا تو خود سپر نٹینڈنٹ سے کہا کہ وقت ہو گیا ہے اب چلنا چاہیے۔ سپر نٹینڈنٹ جیل نے جس کی نگرانی میں پیر صاحب کو پھانسی دی گئی بعد میں لکھا ہے کہ اس نے پوری زندگی میں ایسا شخص نہیں دیکھا جس نے موت کو دیکھ کر ایسی استقامت کا مظاہرہ کیا ہو''۔ (۷)

بہر حال ۲۰، مارچ ۱۹۴۳ء مطابق ۱۴، ربیع الاوّل ۱۳۶۲ھ کو فجر کے وقت پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی ؒ کو حیدر آباد جیل میں پھانسی دے دی گئی۔ اور آپ کی لاش بھی ورثہ کے حوالے نہیں کی گئی، اگر چہ بعض مریدوں کو صرف چہرہ دکھایا گیا تھا۔ ان کی تدفین کہاں ہوئی یہ معما آج تک حل نہیں ہو سکا، تمام تذکرہ نویسوں نے یہ کہہ کر قلم رکھ دیا کہ: ''آپ کو نا معلوم مقام پر دفن کر دیا گیا۔''

ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا کہنا ہے:

''اگر انہیں نا معلوم مقام پر دفن کیا جاتا تو ممکن تھا اب تک کچھ نہ کچھ علم ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی لاش سمندر میں بہادی گئی ہوگی۔'' (۸)

دینی خدمات

جیسا کہ پیر صبغت اللہ شاہ ثانی شہید جذبۂ جہاد سے سرشار تھے اور کم وبیش اپنی پوری زندگی اس جہاد کی نظر کردی اس لیے کہ آپ باطل وقتوں کے خلاف تھے۔ جب حق ظاہر ہوتا ہے تو باطل فرار ہو جاتا ہے۔ قرآنِ پاک میں سورۃ بنی اسرائیل: آیت ۸۱ میں ارشاد ہوتا ہے:

وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا

ترجمہ: اور آپ فرمادیں کہ آیا حق اور نکل بھاگا باطل۔ بے شک باطل نکل بھاگنے والا ہے۔

پیر صاحب کی زندگی بھی دینی تقاضوں کے مطابق ایسا ہی حق تھی، جس کی تشریح اقبال کے اس مصرعے میں نظر آتی ہے۔

"جو نمود حق میں نظر آتا ہے وہ باطل ہوں میں"

شریعت کے مطابق زندگی گزاری، اس کے احکام کی پاسداری کے لیے مختلف اوقات میں اور مختلف مواقع پر انگریزوں کے خلاف نبرد آزما رہے، اس کے لیے حروں میں وہی جذبہ پیدا کیا جو صبغت اللہ شاہ اوّل کے دور میں تھا۔ ان لوگوں نے پیر صاحب کی راہ نمائی میں مختلف محاذوں پر جنگیں لڑیں نذرانہ جاں پیش کیا، اور قرآنِ پاک کے اس احکام کی مکمل پاسداری کی جو سورۃ التوبہ: آیت ۲۹ میں ہے:

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَ رَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّ هُمْ صٰغِرُوْنَ ۚ

ترجمہ: لڑو اُن سے جو ایمان نہیں لاتے اللہ پر اور قیامت پر اور حرام نہیں مانتے اس کو جس کو حرام کیا اللہ اور اس کے رسول اور سچے دین کے تابع نہیں ہوتے، یعنی وہ جو کتاب دیے گئے ہیں جب تک اپنے ہاتھ سے جزیہ نہ دیں ذلیل ہو کر (جزیہ دینے والے کو خود حاضر ہو کر کھڑے ہو کر پیش کرنا چاہیے)۔

ہمیں ان کی زندگی میں اس احکام پر عمل نظر آتا ہے، انہوں نے صرف اُن حروں کو منع کیا کہ وہ حاضری کے لیے

متعلقہ تھانوں پر نہ جائیں جہاں انہیں روز طلب کیا جاتا تھا، ورنہ جزیہ کا مسئلہ مذکورہ آیت کے مطابق طے کیا۔ اور حق گوئی کے لیے انھوں نے جامِ شہادت نوش کیا، قرآنِ پاک میں شہادت کا درجہ بڑا افضل بتایا گیا ہے، اور اسے مردہ کہنے سے منع کیا گیا ہے۔ سورۃ البقرہ آیت: ۱۴۵ میں ارشاد ہے:

وَ لَا تَقُولُوْا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ

ترجمہ: اور مت کہو جو کوئی مارا جائے اللہ کی راہ میں مدرہ ہیں، بلکہ وہ زندہ ہیں لیکن تم کو خبر نہیں۔ ○

پیر صبغت اللہ شاہ ثانی کی تصانیف میں ہمیں دو بیاضیں ملتی ہیں جس میں آپ نے سلوک و معارفت کے نکات کو قلم بند کیا ہے اور قدرے تفصیل سے بیان کیا ہے۔ یہ بیاض سو صفحات پر مشتمل ہے جو رتناگری جیل میں لکھی گئی، اس بیاض میں پیر صاحب نے یہ نوٹ بھی دیا ہے:

> ''میں نے جو کچھ لکھا ہے۔ رتناگری جیل میں لکھا ہے، مدنا پور سنٹر جیل میں کچھ نہیں لکھا، کیوں کہ سرکار عوام تک اسے پہنچنے نہیں دیتی اور کتاب کے لکھنے میں سخت دقتوں کا سامنا ہے۔ اگر زندگی ہے تو جیل سے باہر آ کر لکھوں گا، اب تک صرف جیل میں مطالعہ جاری ہے، جس پر میں نشان لگا رہا ہوں۔'' (۹)

اس بیاض کے پہلے صفحے پر انگریزی میں لکھا ہے:

Certified That This Book Contains 100 Pajes. ? EllisSuperintendent - 12 Prion. 16-4-31(۱۰)

اس بیاض میں پیر صاحب نے خود واضح کیا ہے۔ ''اس میں ہم نصیحت کی باتیں لکھیں گے، جو خلقِ خدا کو برے کاموں سے بیزار کر دیں۔''

پہلی حکایت میں کہتے ہیں ''مرید جو سچے ارادے سے مرشد کو پکڑتے ہیں، وہ بامراد رہتے ہیں اور وہ جو اپنے مرشد کا کہنا نہیں مانتے، حقیقی فیض سے محروم رہیں گے، کیوں کہ مرید کے لیے یہ واجب ہے کہ وہ مرشد کی ہر بات پر عمل کرے۔''

اس بیاض کے مطالعے سے ایک طرف تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب کو اپنے بزرگوں سے کس قدر عشق تھا اور وہ ان کی تقلید کرتے تھے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پیر صاحب کا علمی ذوق، روحانی مرتبہ، روحانی تعلیم، اور ادبی

ذوق کس قدر رشستہ اور اعلیٰ تھا۔ ان کے ہاں یہ شعر بھی ہے:

ہر نقطہ او شگفتہ باغی افروختہ تر زشب چراغی
نقطش چو طراوت جوانی، معناش چو آب زندگانی

آپ کے یہاں چند سندھی کافیاں بھی ملتی ہیں:

موںکي هٿي ڪو جادو سهڻا يار دل لٽي وئين
ڪري چشمن سند وڪو چالو سر ساه ٻني سٽي وئين
(۱) ڪري ٻهر يون ميلون تو گالهيون ، وڏئي يار دل ڪي دواليون
هٿي نيڻن سند يون دو ناليون ، منهنجا دوست دم ڦٽي وئين
(۲) تنهنجو عشق آهي تهدي ، مثل،پرا باز بحري
وٺي بلبل ڪي وقت سحري ، نٽين منجهي دل جهٽي وئين
(۳) صبغت الله جي سڻ تون زاري،ڪرڪاتون ستاري
هيڪر ڏيئي ڏيکاري ، تهان پوه منهن مٽي وئين

×=×=×=×=×=×

جڳائي مدامي ذڪر سان زبان٪ نہ ڪوڙي دنيا ڪجي ڪويان
سچائي ء سند ويارڪڻ تون قدم ۔ چيو آ عجب دوست منهنجي قلم
ٻنڻ تي پريو آهي ٻيران زور ۔ ٻنڻ ڪم انهي جوجو گاندولغور
ٻنن ٻير ٿا پيا هميشہ مدام ۔ وجي ڪن ٿا مائهن جو گهر منجه سلام

☆ ☆ ☆

نہ پيرن ڪني خلق جي رهبري پڳ ۾ ٻتن ٿاڪوڙن جي پري
رکج يار تون يا نهجي صاف دل ڪري خيال ڏس تون آهين امل

دل کي رکج تون هميشہ صفا ـ کوڙي دنيا جا ڇڏي سڀ خفا

تنهين دل جنهن جي ٿئي هڪ يار

تنهين تان سوين سر آهين نثار

- ☆ پیر صبغت اللہ شاہ ثانیؒ نے جہاد کے جذبے کو فروغ دیا جو سب سے بڑی دینی خدمت ہے، اور اس میدان میں جامِ شہادت نوش کیا جس سے ان کی تنظیم میں شہادت کے جذبے کو غیر معمولی فروغ حاصل ہوا۔
- ☆ کہتے ہیں کہ پیر صاحب ایک وقت میں ہزاروں غریبوں کو کھانا کھلا کر خیرات کیا کرتے تھے، یہ بھی دین میں ایک بڑی خدمت شمار کی جا سکتی ہے۔
- ☆ درگاہ سے ملحق مسجد اور اس میں قائم مدرسے کو فعال بنایا، جس میں دینی تعلیم کے جذبے کو فروغ حاصل ہوا، نیز علاقے میں دینی تعلیم حاصل کرنے کے شوق کو مہمیز ملی۔
- ☆ قدیم کتابوں کو محفوظ کروایا اور کاتبوں سے ان کتابوں کی نقول تیار کرائیں۔
- ☆ اپنے قریبی مریدوں کو یعنی ایسے مریدوں کو جو روحانی تعلیم میں ایک خاص مقام رکھتے تھے، کو پابند کیا کہ وہ خطابات کے ذریعے علاقے میں اس تعلیم کو اور لوگوں کے مسائل کو دین کی روشنی میں حل کریں۔
- ☆ ایسے مرید جو پیر صاحب کے والد کے مرید تھے اور بعد میں آپ کے ہاتھ پر تجدید کرنا چاہتے تھے، انہیں نہ صرف منع کیا بلکہ ان کی عزت و تکریم میں کوئی کمی نہیں آنے دی یعنی انہیں اپنے بزرگوں کا درجہ دیا۔
- ☆ خود نے بھی شریعت کی پابندی کی اور دوسروں سے بھی یہی توقع کی اس طرح لوگ پیر صاحب کی اتباع میں شریعت کی طرف راغب ہوئے۔
- ☆ انہوں نے اس رجحان کو عام کیا کہ کسی غیر مسلم کی حاکمیت کو قبول نہیں کیا جائے۔ اور جہاں تک ممکن ہو سکے اپنا شرعی نظام رائج کیا جائے۔
- ☆ چوں کہ پیر صبغت اللہ شاہ ثانی ایک بہت بڑے علاقے اور اس کے لوگوں کے روحانی پیشوا تھے، اس لیے ان کی زندگی اور اقوال کا ان لوگوں پر خاص اثر ہوا۔ اس طرح علاقے میں دینی رجحان کو تقویت حاصل ہوئی۔

حواشی

(۱) ''مخزنِ فیضان'' جمعیت علماء سکندریہ، خیر پور، مطبوعہ: (دوم) ۲۰۰۱ء صفحہ: ۴۲۸ تا ۴۲۹

(۲) ایضاً

(۳) تبسم چودھری ''تذکرۂ پیرانِ پاگارہ'' انڈس پرنٹرز، حیدرآباد، مطبوعہ: جولائی ۱۹۷۵ء صفحہ: ۱۸۰-۱۸۱

(۴) ایضاً صفحہ: ۱۸۲

(۵) اعجاز الحق قدوسی، ڈاکٹر ''تاریخِ سندھ (جلد سوم) اردو سائنس بورڈ لاہور، اکتوبر ۱۹۸۴ء صفحہ: ۱۲۹

(۶) حاشیہ (دستخط کے ساتھ) بہ قلم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، ذاتی نسخہ ''تذکرۂ پیرانِ پاگارہ'' صفحہ ۱۸۶

(۷) ہفت روزہ ''لیل ونہار'' مورخہ ۱۳، مئی ۱۹۷۳ء صفحہ: ۷

(۸) روایت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں، راوی، مسرور احمد زئی، بتاریخ ۲۲، اگست ۲۰۰۲ء

(۹) ماہنامہ ''مہران'' حیدرآباد ''سوانحی نمبر'' ۱۹۵۷ء صفحہ: ۲۶۵

(۱۰) اس کے بعد پیر صاحب کی تحریر میں درج ہے ''یہ کتاب ہمیں رتناگری کی جیل میں ملی، بتاریخ ۱۲، ربیع الاوّل ۱۳۵۰ھ مطابق ۲۸، جولائی ۱۹۳۱ء

پیر سکندر شاہ (موجودہ پیر پگارا)

المقلب پیر شاہ مردان شاہ ثانی

پیر سکندر شاہ (موجودہ پیر پگارا) ۲۲، نومبر ۱۹۲۸ء کو خیر پور میرس میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت سید صبغت اللہ شاہ شہیدؒ (م ۱۹۴۳ء) کے سب سے بڑے فرزند ہیں، آپ کا اصلی نام پیر سکندر شاہ ہے۔ ان کے چھوٹے بھائی نادر شاہ ان سے تقریباً دو سال چھوٹے ہیں۔ موجودہ پگارا کی عمر اُس وقت تقریباً چودہ سال تھی جب اِن کے والد کو ۲۰، مارچ ۱۹۴۳ء کو پھانسی دے دی تھی۔ ان کے اہلِ خانہ کو کراچی میں نظر بند کر دیا گیا تھا، آپ نے ایک ہفت روزہ پرچے کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا:

''ہم دونوں ان دنوں چھوٹے بچے تھے۔ تاہم ہمیں کچھ نہ کچھ سوجھ بوجھ حاصل تھی اسی بناء پر ہمارا اندازہ تھا کہ کوئی نہایت اہم بات ہو رہی ہے آج سے بتیس تینتیس سال پیش تر بچے آج کی طرح بڑوں کی مجلس میں نہ بیٹھتے تھے اور نہ گفتگو میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے براہِ راست تو کچھ علم نہیں البتہ اس وقت کے مشاہدات کو یاد کرتے ہیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ تحریک بالکل ابتدائی درجے میں تھی، کچھ لوگ مسلح جدوجہد کی تربیت حاصل کر رہے تھے، لیکن اس وقت تک نہ تحریک کا کوئی ہیڈ کوارٹر طے ہوا تھا اور نہ طریقِ کار کا فیصلہ ہوا تھا۔ کوئی کمانڈ بھی نہیں بنائی تھی اور نہ جدوجہد کے لیے مقام اور وقت کا تعین ہوا تھا۔ اور شاید ابھی تک کوئی باقاعدہ تنظیم ہی نہیں بنی تھی۔ بہر حال ہمیں اپنے بھائی، والدہ، اور گھر کے دوسرے افراد سمیت حراست میں لے لیا گیا، پیر گوٹھ سے کراچی لایا گیا۔ ہمیں اس وقت بندر روڈ کے ایک بنگلے میں زبردست پہرے میں نظر بند کر دیا گیا۔ کسی کو ہم سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے ساتھ ہمارے چار پانچ ملازم تھے انہیں بھی باہر جانے یا کسی سے بات کرنے کی اجازت نہ تھی۔''(۱)

---

(۱) ہفت روزہ ''لیل و نہار'' مورخہ ۱۳، مئی ۱۹۷۳ء

متذکرہ انٹرویو میں موجودہ پیر پگارا نے یہ بھی کہا:

''[والد صاحب کی] شہادت سے کچھ عرصے بعد یعنی ۱۹۴۳ء کے آخر یا ۱۹۴۴ء کے اوائل میں ہمیں تعلیم کے لیے علی گڑھ لے جایا گیا اس کی صورت یہ تھی کہ ہمیں اور ہمارے چھوٹے بھائی نادر شاہ کو شام کے جھٹپٹے میں برقع اڑھا کر ریلوے اسٹیشن لایا گیا اور گاڑی میں تمام راستے کھڑکیاں اور دروازے بند تھے، دہلی جا کر ہم نے برسوں بعد کھلی فضاء کو دیکھا... نظر بندی کے دوران ہماری درخواست پر برطانوی حکومت نے پراسیکیوٹنگ انسپکٹر صدرالدین کو قرآنِ پاک پڑھانے پر معمور کیا جو کبھی کبھی آ کر ہمیں قرآن پاک پڑھاتے تھے، علی گڑھ میں ہمارے لیے کوئی خصوصی انتظام نہ تھا۔ جون ۱۹۴۶ء میں سمندری جہاز کے ذریعے مجھے اور نادر شاہ کو لور پول (انگلینڈ) پہنچا دیا گیا۔''

وہیں آپ نے تعلیم حاصل کی جب آپ کو لندن بھیجا گیا اُس کے ایک سال بعد پاکستان وجود میں آ گیا۔ ۱۹۴۹ء کو جب پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم نواب زادہ لیاقت علی خاں لندن کے دورے پر گئے تو انہوں نے پیر صاحب پگارا اور ان کے چھوٹے بھائی کو اپنی ہوٹل میں طلب کیا اور وہاں تحریک آزادی میں اس خاندان کی قربانیوں کا اعتراف کرتے ہوئے یہ مژدہ سنایا کہ حکومتِ پاکستان نے ''پگارا'' گدی کو بحال کرنا اپنا قومی فریضہ سمجھا ہے چناں چہ انہوں نے بتایا کہ جلد ہی گدی کی بحالی کا فیصلہ کر لیا جائے گا۔ لیکن اس پر عمل درآمد ۱۹۵۲ء کو ہوا، اور ۴، فروری ۱۹۵۲ء کو پیر سکندر شاہ المعروف پیر شاہ مردان شاہ ثانی کی دستار بندی عمل میں آئی۔ ان کا روحانی تعلق درگاہ چھہاں شریف ضلع گجرات کے بزرگوں سے ہے۔ اس کے بعد آپ نے ایک مرتبہ پھر مجتمع کیا اور تب سے آج تک پاکستان کی سیاسی تاریخ میں آپ کا غیر معمولی کردار رہا ہے۔

ضمیمہ

یہاں تک تو ہم نے سلسلۂ پیر پگاران کا تذکرہ اور ان کی علمی اور دینی خدمات کا احاطہ کرنے کی کوشش کی ہے اس سلسلے کی اولاد کا بھی دین و ادب کے میدان میں نمایاں کام ہے اگر چہ یہ لوگ "پیر پگارا" تو نہیں ہیں لیکن "خاندانِ پیر پگارا" میں ضرور شامل ہوتے ہیں۔ چوں کہ یہ لوگ "پگارا" نہیں ہیں اس لیے ان لوگوں نے خود کو "راشدی "نسبت سے ظاہر کیا ہے۔ راشدی سے مراد حضرت پیر سید محمد راشد شاہؒ (روضے دھنی) سے نسبت ہے۔ لہذا ضمیمے میں ان منتخب افراد کا تذکرہ بیان کیا جاتا ہے اور اس وضاحت کے ساتھ کے ان لوگوں کی دینی خدمات تو قابلِ ذکر نہیں ہے لیکن علمی اور ادبی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔

راشدی

سید محمد راشد شاہؒ (روضے دھنی) کے وصال یکم شعبان ۱۲۳۳ھ مطابق ۱۸۱۸ء کے بعد آپ کے بیٹے سید صبغت اللہ شاہ (اوّل) کو پہلا پگارا بنایا گیا تو جانشین یا سجادہ نشین کے لیے محمد یسٰین شاہؒ اور صبغت اللہ شاہ کے درمیان تنازعہ ہوا مقدمے کا فیصلہ پیر صبغت اللہ شاہ کے حق میں ہوا، اور محمد یسٰین شاہؒ اپنے والد کی نشانی ''جھنڈا'' لے کر الگ ہو گئے، ان سے چلنے والا سلسلہ ''جھنڈے والے'' کہلائے۔ پیر صبغت اللہ شاہ اوّل کے وصال ۱۲۴۶ھ مطابق ۱۸۳۱ء کے بعد آپ کے دو فرزند، بڑے۔ سید علی محمد شاہؒ سے جو سلسلہ چلا وہ ''راشدی'' کہلائے۔ یہ بیان جی ایم سید کا ہے جو انہوں نے اپنی تصنیف جنب گذاریم جن سین، میں دیا ہے۔

لیکن ڈاکٹر اعجاز الحق قدوسی نے اس بارے میں لکھا ہے۔

''اس حقیقت کو پیشِ نظر رکھیے کہ حضرت پیر پگارا کا خاندان اور پیر جھنڈا کا خاندان اور راشدی خاندان ایک خاندان کے مختلف نام یا ایک ہی خاندان کی مختلف شاخیں ہیں۔ پیر محمد راشد روضے دھنی اس خاندان کے جدِ اعلیٰ ہیں، جن کے چار صاحب زادے تھے...

اس خاندان میں وہ شاخ پیر پگارا کہلاتی ہے جو پیر علی گوہر اوّل کی اولاد ہیں۔ یہ پیر علی گوہر اوّل کی اولاد ہیں۔ اس شاخ کے ساتھ مسند سجادگی مختص ہے۔ پیر جھنڈا وہ لوگ کہلاتے ہیں جو پیر محمد یسٰین جھنڈا والے کی اولاد ہیں۔

پیر علی محمد بن سید صبغت اللہ اوّل کی اولاد نے عموماً اپنے آپ کو اپنے جدِ اعلیٰ پیر محمد راشد (روضے دھنی) سے نسبت دی اور وہ راشدی کہلائے، پیر حامد شاہ کے صاحبزادے پیر علی محمد راشدی، پیر حسام الدین راشدی اور پیر احمد شاہ راشدی ہیں۔'' (تاریخ سندھ: صفحہ: ۱۷۵)

پہلے پہل راشدی نسبت کا اظہار:

اکثر کتابوں اور اس خاندان کے تذکروں میں درج ہے کہ راشدی نسبت کا اظہار یا استعمال اپنے نام کے ساتھ سب سے پہلے پیر علی محمد شاہ راشدی نے کیا، مگر یہ بات تحقیقی نقطہ نظر سے درست معلوم نہیں دیتی ۔ یہ نسبت بھی سب سے پہلے حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی ؒ نے اپنے نام کے ساتھ استعمال کی، یہ چیز اُن کی بیاض سے ظاہر ہے، جس میں ایک نوٹ درج ہے ۔ بیاض کے آخری صفحے ۱۲۲ کی بائیں جانب دیوانِ حافظ سے انتخاب ہے ۔ یہ انتخاب چند اشعار پر مشتمل ہے ساتھ ہی چند اردو اشعار بھی نقل کیے گئے ہیں آخر میں پیر صاحب نے اپنے دستخط میں اس نسبت کا اظہار یا استعمال اس طرح کیا ہے۔

''سید پیر محمد صبغت اللہ شاہ جلالی'' ''اس میں یہ شعر بھی ملتا ہے۔

گردن از حکم خدایت بر متاب

تا نمانی روزِ محشر در عذاب

اپنے جدِ امجد کے ملفوظات کے متعلق لکھا کہ:

''میں نے فارسی کے یہ تمام اشعار حضرت روضے دھنی کے ملفوظات سے منتخب کیے ۔ ان اشعار کے پڑھنے والوں کو میری نصیحت ہے کہ ان اشعار میں سے کچھ اشعار ضرور یاد کرلیں یہ اشعار عجیب معنی اور شوق رکھتے ہیں ۔ میں نے ۵ جمادی الآخر ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۷، اکتوبر ۱۹۳۱ء کو اس بیاض کی تحریر کو ختم کیا۔

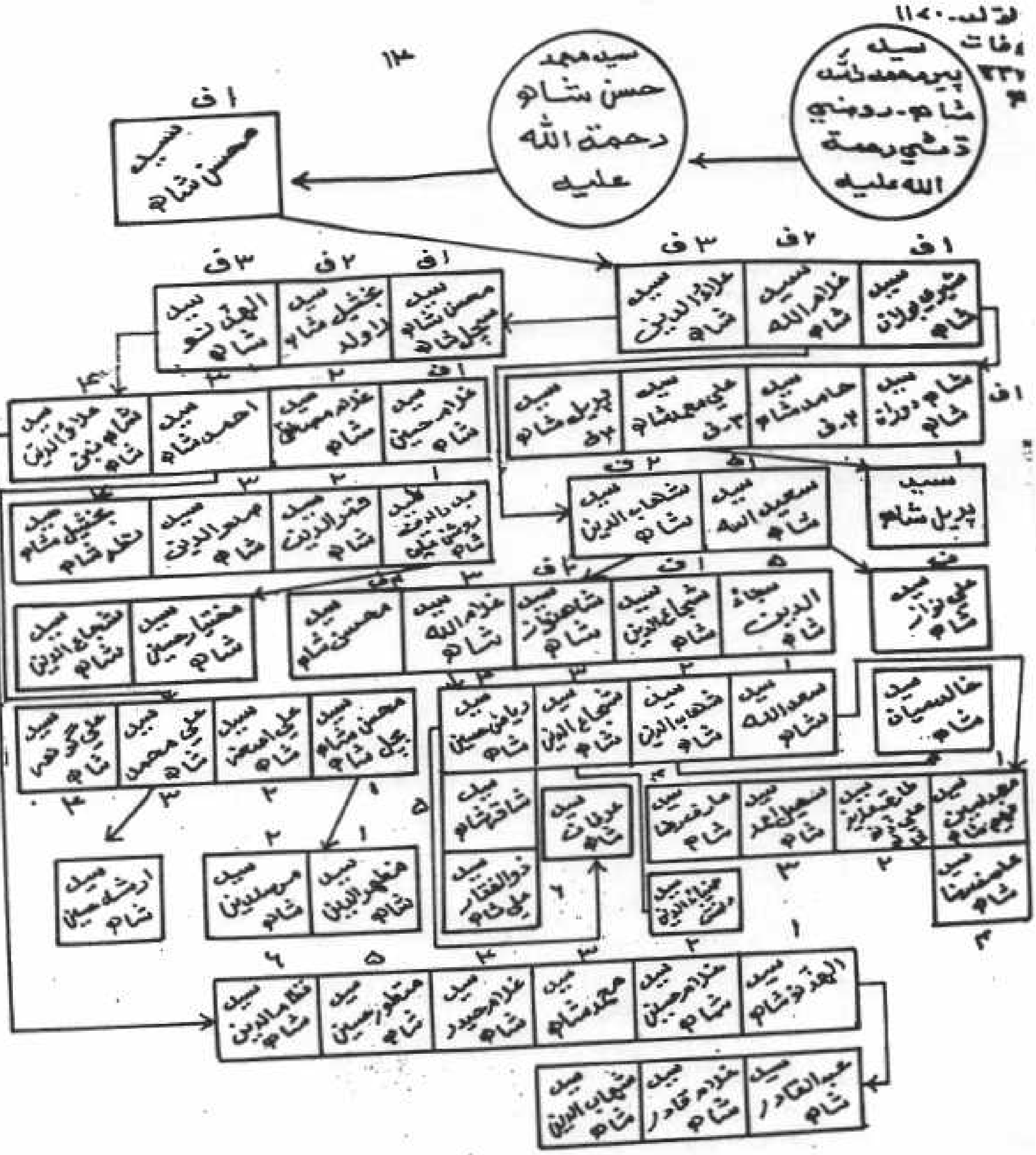
(سید پیر محمد صبغت اللہ شاہ ہاشمی، جلالی، راشدی)''۔(۱)

---

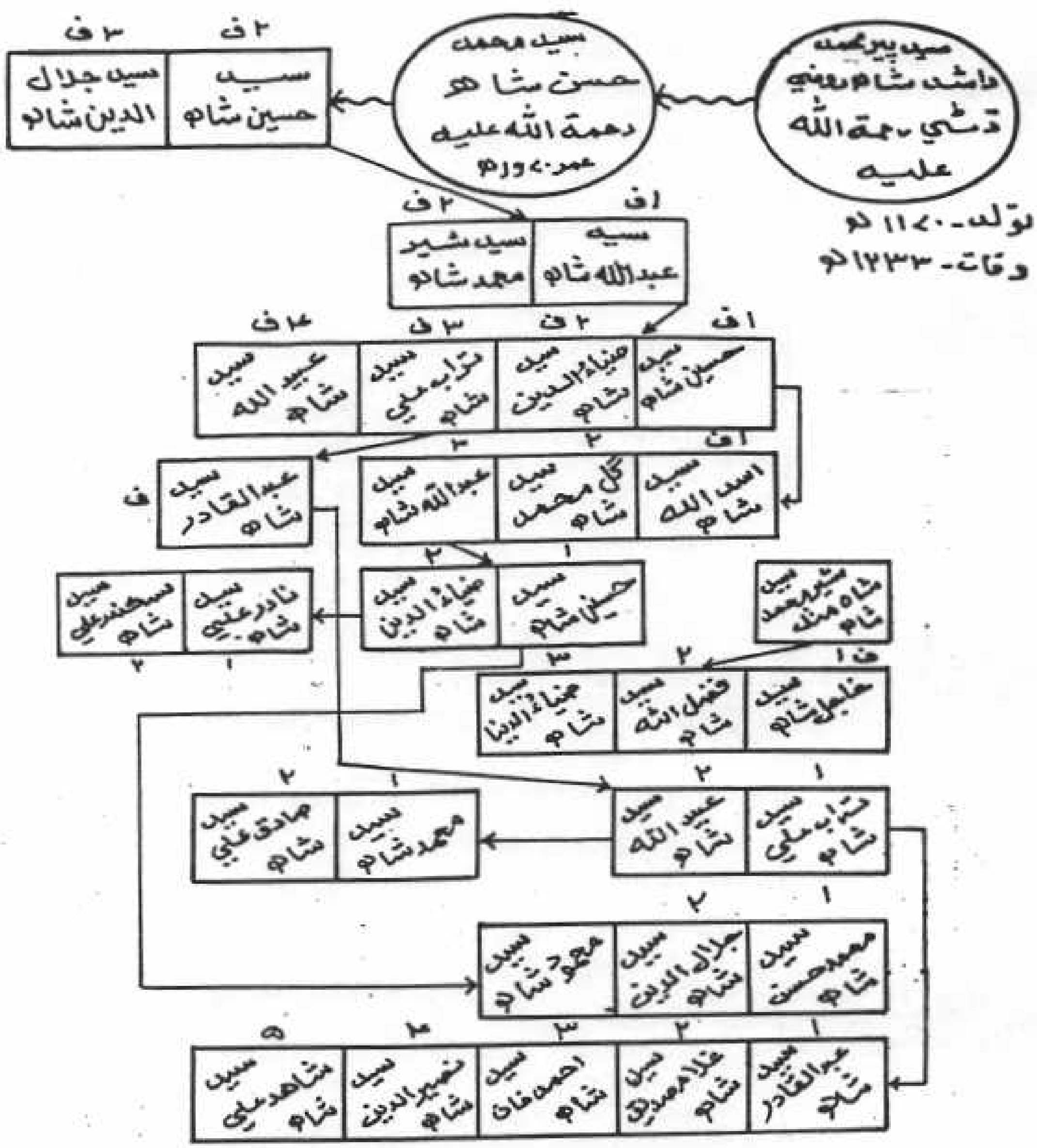
(۱) اس بیاض میں دیوانِ حافظ سے ارسٹھ رباعیات کا انتخاب کیا گیا ہے ۔ یہ مطالعہ رتنا گری جیل میں مکمل ہوا۔ یہاں جو تاریخ درج ہے وہ یہ ہے ۔۵، جمادی الاوّل ۱۳۵۰ھ مطابق ۱۱، اکتوبر ۱۹۳۱ء یعنی اس تاریخ کو بیاض کے نوٹس مکمل ہوئے ۔ اس کے نیچے بھی پیر صاحب نے دستخط کیے اور وقت اس طرح لکھا:

(سید پیر محمد صبغت اللہ ہاشمی، جلالی، بوقت ساڑھے نو بجے)

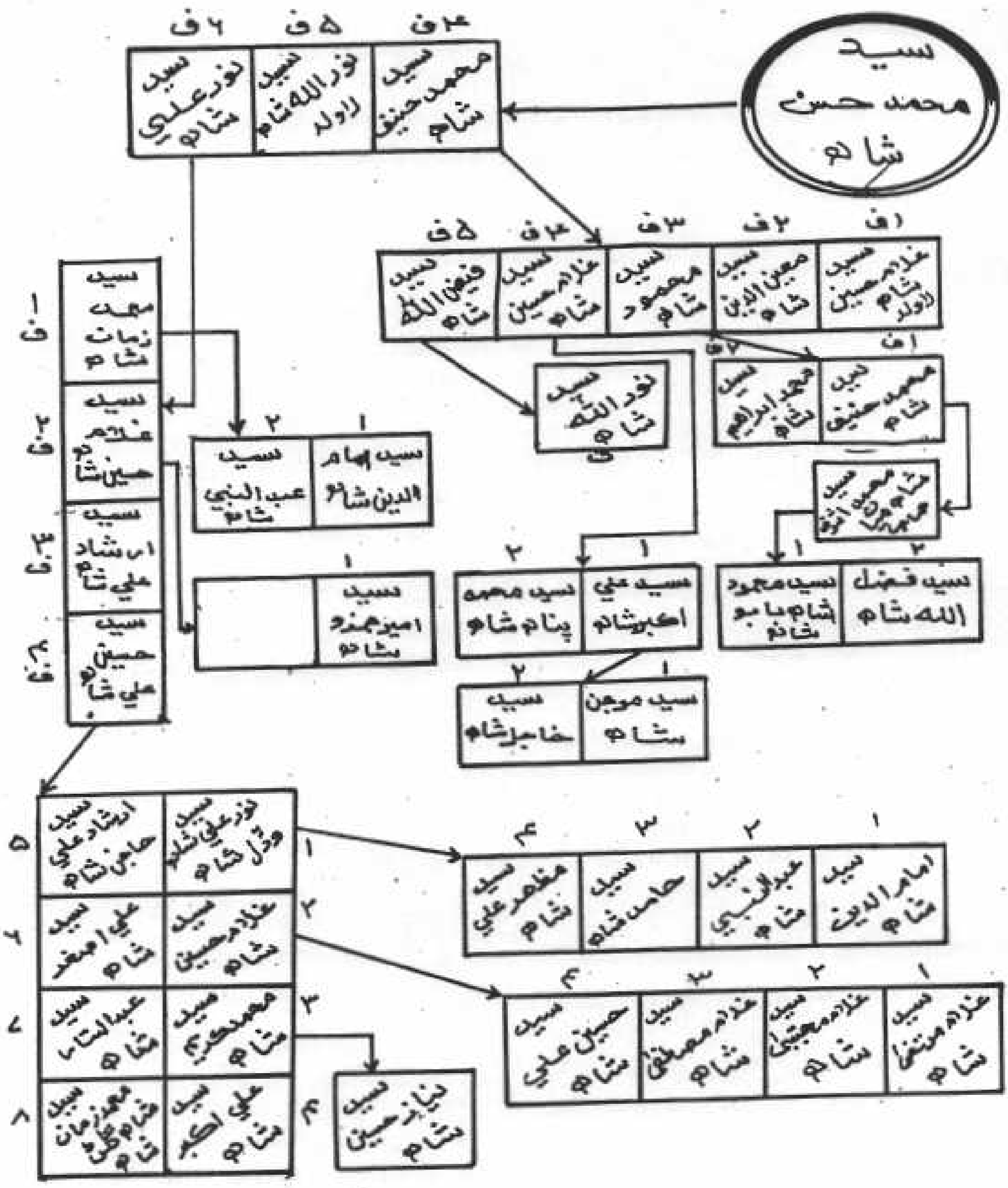
شجرہ خاندانِ پگارا اور سلسلہ راشدیہ



سيدمحسن شاھ ولد سيد محمدحسن شاھ جن جا پھريون نمبر فرزند ھئا پيرسائين محسن شاھ جيو اولاد مان، سيد غلام الله شاھ موجوده گادي نشين آھي پاڻ جن ٽگ ڪروندي ڳوٺ شاھ آباد ضلعي خيرپور، تعلقي فيض گنج ۾ رھن ٿا. سندن اولاد به سندن ڳوٺ ۾ رھن ٿا پيرسائين محسن شاھ جن جو ٻيون نمبر فرزند ـــ سيد علاؤالدين جن جو اولاد ڪجھ ڪنڊياري شھر ۾ ٿا رھن ڪجھ ڪنياري تعلقي فيض گنج ضلعي خيرپور ۾ رھن ٿا.



پيون نمبر فرزند سيد حسين شاھ ولد سيد محمد حسن شاھ جن جو اولاد شھر قنمبر علي خان ضلعي لاڙڪاڻي ۾ ٿا رھن سندن روضا مبارڪ به قنمبر علي خان ۾ آھن. سندن اولاد به قنمبر علي خان ۾ ٿا رھن.



سيد محمد حنيف شاهه جو ٽون نمبر فرزند سيد محمد حسن شاهه جو
اولاد شهر مٽلي ضلعي حيدرآباد ۾ ٿا رهن.

پیر یٰسین شاہ (جھنڈے والے)

حضرت محمد راشد روضے دھنیؒ کے بیٹے پیر یٰسین شاہؒ بھی تھے۔ والد کی وفات کے بعد جب سجادہ نشینی کا معاملہ آیا تو پیر صبغت اللہ شاہ اوّل کو پیر پگارا اوّل بنایا گیا تو پیر یٰسین شاہ نے مخالفت کی اور سجادہ نشینی کا دعویٰ کیا یہاں تک کہ یہ صاحبان اُس وقت کے حکمراں میر صاحبان کے پاس پہنچے اور ان سے درخواست کی کہ انصاف کیا جائے اور مجھے سجادہ نشین بنایا جائے۔ حاکم نے اپنے وزیرِ اعظم ولی محمد خاں آف تاجپور کو حکم دیا کہ درگاہ مبارک جا کر تحقیقات کرے اور انصاف کے تقاضے پورے کیے جائیں، وزیرِ اعظم نے درگاہ مبارک پہنچ کر انتہائی توجہ اور دل چسپی کے ساتھ تحقیق و تفتیش کی اور اس نتیجے پر پہنچا کہ سجادہ نشینی کا حق پیر سید صبغت اللہ شاہ اوّل ہی کو حاصل ہے یہ فیصلہ لکھ کر اُس نے اپنے دستخط کیے اور مہر ثبت کی اس طرح سید صبغت اللہ شاہ اوّل کو پہلا پیر پگارا بنایا گیا۔

اس موقع اور فیصلے پر پیر یٰسین شاہ نے مطالبہ کیا کہ انہیں، اُن کے والد پیر محمد راشد روضے دھنیؒ سے تبرکات میں سے کوئی تبرک دیا جائے تاکہ یہ علیحدہ ہو جائیں۔ اس خواہش پر نواب ولی محمد خاں تاجپور نے بھی سفارش کی اور زور دیا کہ یٰسین شاہ صاحب کو اُن کے والد کے تبرکات میں سے کوئی تبرک ضرور دیا جائے۔ لہٰذا ان کے چھوٹے بھائی پگارا اوّل نے آپ کو ایک علم (جھنڈا) دیا جس پر کلمۂ طیبہ جلی و طلائی حروف میں لکھا تھا۔ یہ وہ علم تھا جو شاہ کابل زماں شاہ بن تیمور شاہ بن احمد شاہ ابدالی نے تیار کروا کر پیر سائیں روضے دھنی کو دیا تھا۔ یہ علم بطور یادگار سید محمد یٰسین شاہ کو دیا گیا۔ پیر سید محمد شاہ صاحب اس جھنڈے کو لے کر مقام ٹھلاہ نزد: اسٹیشن باقرانی، ضلع لاڑکانہ چلے گئے، اور وہیں مستقل طور پر مقیم ہوئے۔ اس طرح ان سے بھی سلسلۂ راشدیہ کو فروغ حاصل ہوا۔ پہلے یہ لوگ ''جھنڈے والے'' کے لقب سے یاد کیے گئے بعد میں ان کی اولادوں نے بھی خود کو ''راشدی'' لکھا۔

پیر یٰسین شاہ صاحب کی زندگی بھی نہایت متقی اور پرہیز گار تھی۔ انہوں نے مذکورہ مقام پر ایک ایسا دینی مرکز قائم کر لیا جس سے ہزاروں لوگ وابستہ ہوئے اگرچہ بعد میں یہ لوگ بھی مسلکی اعتبار سے دو حصوں میں تقسیم ہو گئے۔ ایک گروہ اہلِ حدیث میں شمار ہوا اور دوسرا اہلِ حنفی میں، اوّلاذکر سے متعلق افراد کی تعداد زیادہ ہے جس کے تحت قرآنِ پاک کی تفسیر اور دینی مسائل اور اس کا حل اسی مسلک کے مطابق شایع ہوئے۔

جہاں تک پیر لیسین شاہ کی ذاتی زندگی کے واقعات ہمارے سامنے آتے ہیں اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ انہوں نے اپنے مردوں کی بڑی اخلاقی تربیت کی دینی مسائل کو سمجھایا اور اس تعلیم میں وہ اثر صاف صاف نظر آتا ہے جو ان کے والد پیر سید محمد راشد شاہ روضے دھنی کی زندگی میں دیکھا گیا۔ ان کے ملفوظات بھی مقبول ہوئے جو پیر حاجی ہدایت اللہ شاہ راشدی نے جمع کیے جو انہیں پیر مولانا وہاب اللہ شاہ سجادہ نشیں جھنڈے والے کے توسط سے ملے۔ ان ملفوظات کو شاہ ولی اللہ اکیڈمی کی جانب سے سلسلۂ مطبوعات نمبر ۲۸ کے تحت شائع کیے گئے۔(۱)

ان مطبوعہ ملفوظات کا فاضلانہ، مختصر اور جامع مقدمہ شاہ ولی اللہ اکیڈمی کے سرپرست معروف محقق اور دانش ور غلام مصطفیٰ قاسمی نے تحریر کیا ہے۔(۲)

اس مقدمے کے آخری حصے میں غلام مصطفیٰ قاسمی نے پیر لیسین شاہ جھنڈے والے کی زندگی پر مختصر روشنی ڈالی ہے کہ ”وہ ایک دین دار گھرانے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے ان کے ملفوظات میں بھی دین کی تبلیغ اور شریعت کی پابندی کا سبق ملتا ہے“۔

ہم جب ان ملفوظات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں واضح طور پر نیکی کا ایسا درس اور دین کی ایسی تبلیغ ملتی ہے جو شرعی زندگی کی صحیح ترجمانی کرتی ہے۔ ان ملفوظات میں اپنے مقربین اور محبین اس نوعیت کی تلقین اور ہدایت زیادہ کی ہے کہ تکبر سے پرہیز کیا جائے۔ اپنے اخلاق کو جس قدر ممکن ہو سکے بلند کیا جائے جب تک آپ کے دل میں دوسرے کا درد نہیں ہوگا تب تک آپ کے اخلاق میں بلندی پیدا نہیں ہو سکے گی۔ پھر ایک جگہ یہ بھی کہا اپنے لوگ صرف وہی نہیں ہوتے جو ماں باپ، اولاد، بھائی، بہن، اور قریبی عزیز ہوں بلکہ وہ لوگ بھی اپنے ہوتے ہیں جو کلمہ گو ہیں، یعنی تمام مسلمانوں کی طرف اُن کا اشارہ تھا۔ یہ بھی دین کی ایک بڑی خدمت تھی جو انہوں نے اپنے ملفوظات کے ذریعے انجام دی، اس مقام پر ان ملفوظات کا مختصر مطالعہ بھی ضروری ہو جاتا ہے مناسب ہے کہ ان ملفوظات کو اسی زبان (یعنی سندھی) میں پیش کیے جائیں جس میں یہ طبع ہوئے۔ اس لیے کہ ان ملفوظات کی روشنی میں ہم پیر لیسین شاہ کی زندگی ان کی فکر اُن کی خدمات اُن کی تعلیمات اور اُن کے کردار کو صحیح طور پر دیکھ سکے گے۔ لہٰذا ہم آئندہ صفحات میں ان ملفوظات کا عکس پیش کرتے ہیں۔

---

(۱) ملفوظات پر تاریخ اشاعت درج نہیں

(۲) قاسمی صاحب نے مقدمے کا زیادہ حصہ اہل اللہ کے ملفوظات کی دینی اہمیت پر لکھا ہے۔ اور مطبوعہ ملفوظات پر مختصر روشنی ڈالی ہے۔

باب ڇهون

فصل پهريون

منجهه ڏين جي خصوصن ادب مريدن جي

نقل ڪندڙ فقير محمد جعفر نظامائي وينل ڳوٺ ڪرم جو ته پاڻ سڳورا اهڙو ادب رکندا هئا سڀبان ادب جو ڪڏهين پنهنجي پٽ کي منٽي نه وهڻ ڏيندا هئا. هميشه هيٺ وهندا هئا سڀبان جي فرمائيندا هئا ته انسان مڙئي آدم اهي جي سنجائي جي تنو سنجائي ته ابليس آهي **نقل** ڪندڙ ساڳيو فقير ته پاڻ فرمايائون ته اصحاب سڳورا نبي خدا صلي الله عليه و سلم جن حضور ۾ ايندا هئا ته پاهٺيون وات ۾ جهي اچي وهندا هئا ته متان ڪا اجائي ڳالهه ڪري ويهون. **نقل** ڪندڙ غلام شاه ڪونگائي ته هڪ ڏينهن پاڻ ماتلي جي مسجد ۾ وينا هئا هو انهي مسجد جي ڏکڻ ۾ ٻاهرون گهوڙا وهٽ ٻڌل هوا مون سندن حضور مٿون آئي مسجد مٿون سندن آڏو فقيرن گهوڙن وارن کي چيم ته ڪو گهوڙن کي گاه آهي ۽ پاڻي پياريو اٿو يا نه فقيرن ڪو نجواب ڏنون پوء آيس وٽن ته پاڻ جوش ڪري فرمايائون ته ميان غلام شاه وائسراء انگريز جي آڏو به ائين ڳالهائيندا آهيو ائين چئي پوء فرمايائون ته ادا هڪ ته مسجد خداء جو حضور ٻيو ظاهر مرشد جو حضور تنهن ۾ گهرجي ته ادب ڪري ويهجي جي اجايو ڳالهائيندو ته اٿندو ته فيض نه ٿيندس. **نقل** ڪندڙ فقير عبدالسلام ڪيريو وينل ڳوٺ شجا جو ته هن پوئين سفر ۾ پاڻ سڳورا بڪر جمالي جي ڳوٺ ۾ البت بيچاڪ هوا پوء پاڻ اولهه ڏي منهن مبارڪ ڪيون وينا هوا ته پاڻ ڪنگهي تڪو ڪٺڻ ٿيا ته مون تڪو اٿي ڪٺي اتر جي طرفان حاضر ڪيو ته پاڻ چڀي ڏني تڪو ڪسي ڏکڻ ڏي ڪري ٿڪ اڇليائون پوء مونکي خيال ٿيو ته پاڻ ضرب ڏني جو وڏائون تڏهن پاڻ فرمايائون ته توڏهون ڪاوڙ اسانکي نامي ايڏانهين سڄو پاسو مرشدن جو طرف آهي تنهنڪري ڏکڻ ڏي ٿڪ اڇلبي - ڏسو ادا پاڻ سڳورا ڪيڏو ادب

ڪندا هئا جو مرشدن جي طرف بيچاڪائي ۾ به ٽڪ نه ڪيائون نقل ڪندڙ فقير محمد هاشم ڪيريو ته هڪ دفعي اسين سندن حضور ۾ هواسين ته هڪ وڏيري پڇيو ته قبلا ادب پلو يا امر پلو آهي پاڻ فرمايائون ته ادا ڪن جاين تي امر پلو آهي ڪن جاين تي ادب پلو آهي امر ڪوڻ. تنهن تي پاڻ هي نقل فرمايائون ته حضرت پير صاحب روضي وارا رحمت الله عليه جن دلي واه جي تري ۾ ڪوهي ٿي کٽايائون تنهن وقت پاڻ فرمايائون ته جيڪو هن ڪوهي ۾ لپا هڻندو تنهن تان دوزخ جي باه حرام تنهنڪري سڀني فقيرن لپا هنيان تان جو پاڻ روضي وارن فرمايو ته اسانکي به وارو ڏيو جو اسين پڻ لپا هڻندا سين پوءِ پاڻ گهوڙي لپا بيٺا ڪڍڻ جڏهن ڪجهه لپا ڪيائون ته فقير چيو ته قبلا هاڻي اسانکي ڪوڏر ڏيو تڏهن پاڻ فرمايائون ته جيڪو اسان کوڻ ڪوڏر وٺندو سو دوزخ ۾ داخل ٿيندو تڏهن فقير سڀ ماٺ ڪري رهيا هڪڙو فقير چنيه نالي ڪيريو فقير وينل پاهوڙي جو هو سو ويو هو وضوءَ تي جڏهن آيو اچي پڇيائين ته اندر ڪوهي ۾ ڪير آهي چيائون ته پاڻ ٿا بيٺا ڪڍن تڏهن چيائين ته اوهين ڪوڏر وٺي ڪوهي نه ٿا ڪڍون تڏهن چيائون ته پاڻ هن دستور فرمايو اٿن تڏهن فقير چيو ته آءٌ پلي دوزخ ۾ پوان ٽپ ڏئي وڃي ڪوڏر سندن هٿ مٿون ورتائين سو ادا اهڙن هنڌن تي ادب امر کٿون افضل آهي.

فصل ٻيو

منجهه تنبيه بي ادبن جي

نقل ڪندڙ هي مسڪين ته پاڻ سڳورا فرمائيندا هئا ته جو ڪيئي طالب حال وارن کان حال ويندو رهيو سو سببئون بي ادبي جماعت وارنهه جي جو حال جي وقت ڪوڻ پوءِ به هنن کي جو لتون ڪين لڳيون تنهن سببان بي ادبي جي هنن جو فيض ويو ۽ اسان ٿوري مريدن کي سيکن پاڻ سمجهائيندا هئا ته جماعت جو ادب ڪيو اڳئون جي جماعت جي نه لنگهو پٺئون لنگهو ڪنهن وقت جي وٺي ڪنهن ڪنهن فقير کي گڏبا هواسين ته ڪاوڙ فرمائيندا هئا ۽ چوندا هئا ته اٿي گڏ جو.

نقل ڪندڙ فقير محمد جعفر ته هڪ ڏينهن پاڻ سڳورا جو ڪين ۾ هوا ڏوپهرن جو وقت هو فقيرن ڪافيون ٿي چيون سو تمام جماعت ۾ گريو ۽ روڄ هو ۽ حاليتون فقيرن ۾ هيون تنهن وقت زالون به لنگهي اچي اندر ويٺيون پاڻ جو زالن کي فقيرن سان گڏ ڏٺائون سو اچي ڪاوڙيا

۽ نڪري اچي ٻاهر اس ۾ ويٺا چيائون ته ادب ويندو رهيو ۽ زالون مڙس
سان گڏجي ٿيون ويهن اسين اس ۾ ويٺا هونداسين جڏهن گهٽيون زاريون
ڪيائون ۽ رنا تڏهن اچي اندر ويٺا ۽ چيائون ته زالن کي تاڪاريو
چوندا ته پير سائين جي جماعت ۾ پڻ زالون گڏ ويٺيون هيون . نقل
ڪندڙ حافظ ڪريم ڏنو ويٺل ڳوٺ ٻاهوڙي جو ته هڪ ڏينهن پاڻ
سڳورا ٻاهوڙي ۾ لٿل هوا اتي فجر جي وقت ڪين ادب جي فقيرن
اچي موڪلايائون بلڪ گهٽي جماعت ويٺي هئي تنڪي لتاڙي لنگهي
آيا تنڪي پاڻ جوش ڪري فرمايائون ته هن موڪلائڻ ڪان اوهانکي
ري موڪل وڃڻ چنگو آهي وڏا وڏا فيض وارا تن جو فيض سببون
بي ادبي جي هليو ويو آهي ۽ مون ته جيڪر فقير جي لٺ به نه
اورانگهيان . نقل ڪندڙ فقير موليڏنو ويٺل ڊيڪي جو ته پاڻ فقير
ڪڙوندي ۾ چڙيا هوائون پاڻ آيا ها اچي دائود جي ڪوٽ ۾
اتي مائي هڪڙي مست پاڳ پڙي نالي مونڊي هلي اتي آئي ۽
ٻاهرئون اچي دانهن ڪري چيائين ته گهوري گهوري ڊکهل پير ٿئون
تڏهن پاڻ ٻڌائون پوءِ چيائون ته مون توکي امر ڪيو هو ته ندي وٽ
هججان ۽ تون هيڪلي چو آئي آهين ۽ رضا فقير کي چيائون ته مائي
کي ورائي وڃي اتي ڇڏي اچينس پوءِ ڏينهن ٽتي ۾ ورائي وني فقير اتي
ڇڏي آيس. نقل ڪندڙ فقير محمد هاشم ڪيريو تنهن نقل ڪيو فقير
عبدالوسع ڪيري ويٺل ڳوٺ گيو جو ته هڪ پيري اسين گهٽي
جماعت گڏ جي درگاه ٿلهه واري تي زيارت واسطي سائين جي ويا هواسي
پوءِ هڪ وقت اوطاق وڏي ۾ فقيرن کي وعظ ويٺي تي ڪيائون پوءِ
گفتار ۾ پاڻ فرمايائون ته مرشد جي حضور ۾ وهجي ته ڪتا ۽ ٻلا دلين
۾ رکي نه ويهجي پاڻ اهو لفظ فرمايائون پوءِ جڏهن پاڻ اٿيا اسهيا تڏهن
اسان فقيرن پاڻ ۾ پڇا ڪئي ته ادا ڪهڙي کي ڪتو ٻلو دل ۾ هوتنهن
وقت ميان غلام شاه ڪنگاڻي حاضر هو تنهن چيو ته ادا منهنجو منهن
تي ڪارو ڪيائون مونکي دل ۾ ڪتن جو خيال هو جو ڳوٺ ڇڏي
آيو هوس.

ابوالبقا پیر مظہر الدین راشدی (م،۱۳۱۸ھ)

مظہر الدین ولد سید حاجی ہدایت اللہ ولد پیر سید محمد راشد روضے دھنیؒ، ایک عالم، فاضل، حکیم، کامل، ذہین، بزرگ تھے، آپ نے اپنے والد کی صحبت میں رہتے ہوئے ظاہری علوم حاصل کیے اور اس کے بعد اپنی خداداد صلاحیتوں کی بناء پر اپنے علم میں خوب اضافہ کیا ان کے چچازاد، پیر سید محمد رشد اللہ صاحب (صاحب العلم الرابع) کے ساتھ گہری دوستی تھی، ان دونوں بزرگوں کا آپس میں علمی موضوعات پر مباحثہ اور مقابلہ رہتا تھا جس کی وجہ سے پیر مظہر الدین راشدیؒ بڑی کاملیت اور قابلیت کے مالک ہوگئے۔

انہوں نے ٹھلہ شریف میں ایک پریس قائم کیا، جہاں سے (ہدایت الاخوان) نام کا ایک نہایت علمی رسالہ جاری کیا جس سے لوگوں کو بہت فائدہ حاصل ہوا اس رسالے میں بڑے دینی اور علمی موضوعات پر آپ اہلِ علم کے تاثرات اور مضامین شایع کرتے خود بھی بڑے دقیق اور وسیع حیثیت کے حامل موضوعات پر قلم اٹھاتے اور موضوع کا حق ادا کردیتے، یوں اس رسالے میں بہت اہم دینی مسائل اور علمی موضوعات پر آپ کا نقطۂ نظر دیکھنے کو ملتا ہے۔ جس سے آپ کی علمی فضیلت اور دینی رجحان کو سمجھنے میں بڑی آسانی حاصل ہوسکتی ہے۔ اس کے علاوہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے کچھ اور ناموں سے بھی مختلف رسالے شایع کیے تھے، بہ ہر حال ''ہدایت الاخوان'' کم وبیش ایک سال چھپتا رہا مگر پھر جاری نہ رہ سکا اور بند ہوگیا۔

''تذکرہ مشاہیر سندھ'' کے مصنف لکھتے ہیں:

> ''ان کے پاس ہر وقت علماء کا ایک اجتماع رہتا تھا، انگریزی اور یونانی طبیب ہونے کی وجہ سے روزانہ بہت سے مریض علاج کے لیے آتے تھے۔''

ان کے عربی، سندھی، فارسی، میں لکھے ہوئے بہت سے رسالے مذہبی اور طبی موضوعات پر ہیں، جو ان کے بیٹے پیر حاجی محمد بقا ٹھل شاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں۔ یہ کتب خانہ بھی آپ کے والد محترم کے علمی ذوق کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ ایک تو اس اعتبار سے کہ اس میں موجود نایاب اور نادر کتابیں آپ کے والد صاحب کے شُستہ ذوق کی ترجمانی

کرتی ہیں۔تو دوسری طرف ان کے بیٹے نے جس طرح اس کتب خانے کی حفاظت کی اور اس کو توسیع دی نیز اس اہم کتب خانے سے استفادہ کیا وہ بھی آپ کے والد صاحب کی عمدہ تربیت کی عکاسی کرتا ہے۔اس کتب خانے میں ابو البقا پیر مظہر الدین راشدی کے جو اہم علمی و دینی مسائل پر رسالے وہ درج ذیل ہیں۔

(۱) تکویر الا مامت علی ان القلنسوة لا یکره فیها الا قتاء والا مامة

(۲) الفوائد الجمة فی الحکام اعمامة

(۳) القاعد المهمة للفوائد الجمة

ان رسالوں میں ایک ہی مسئلے پر بحث کی گئی ہے کہ ٹوپی میں امام کو جماعت کی نماز پڑھانا جائز ہے اس رسالے کا ان کے مرید نے سندھی نظم ترجمہ کیا ہے۔مذکورہ رسائل کے علاوہ جو اہم رسالے ہیں ان کی ترتیب اس طرح ہے۔

(۴) تحریرات،مباحثه،قرأت،قرآن،جهر در جماعت

(۵) تحصیل الصحته عن السقامة بما جاء فی الفصلا والحجامة

(۶) افحام الا فحمه بتائید ابراء المتهم

(۷) تحقیق الخبر فی صلاة الجنازة علی القبر

(۸) مجربات مظهریة یونانی

(۹) رسالہ درفن کیمیاء فارسی

(۱۰) سنڌي ڪافين جو ڪتاب

''ابو البقاء پیر مظہر الدین راشدیؒ کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہوئے، واضح ہوتا ہے کہ انہوں نے پوری زندگی علم حاصل کرنے اور علم کو پھیلانے میں صرف کی ہے۔مذکورہ رسائل میں اتنے دقیق اور وقیع موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور پھر اسے بڑی خوبی سے نتیجے تک پہنچایا ہے یہ تمام مطالعہ آپ

کے وسیع علم پر دال ہے۔ ہمیں ان کے رسالوں میں علمی، ادبی، دینی اور مذہبی موضوعات ملتے ہیں جس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس دور میں ایسے موضوعات مثلاً امام کا ٹوپی پہن کر نماز پڑھانا، جنازے کی نماز کے مسائل، قرآن پڑھنے میں اور لکھنے کے انداز وغیرہ موضوعِ بحث رہے ہوں گے جنہیں آپ نے علمی نقطۂ نظر اور تحقیقی اندازِ فکر سے حل فرماتے ہوئے نتائج اخذ کیے ہیں۔ ہمیں مذکورہ تذکرے (ص: ۲۴۷) سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی عمر کے آخری حصے میں انگریزی بھی سیکھ لی تھی اور اس زبان میں کچھ شاعری بھی کی تھی۔"

انہوں نے نہایت کامیاب زندگی گزاری ان کی عمر صرف ۴۲ سال تھی کہ بروز بدھ دن نو بجے ۲۲، ربیع الثانی ۱۳۱۸ھ کو وفات پا گئے۔ اور انہیں اپنے خاندانی قبرستان ٹھلہ شریف میں مدفون کیا گیا۔

☆ ابوالبقا پیر مظہر الدین راشدی کے اس تذکرے کو مرتب کرنے میں "تذکرہ مشاہیر سندھ" (جلد اوّل) مرتبہ: مولانا دین محمد وفائی، سندھی ادبی بورڈ، جامشورو، مطبوعہ: ۱۹۸۴ء صفحہ: ۲۴۷ سے استفادہ کیا گیا ہے۔

پیر شہاب الدین شاہ راشدیؒ

پیر شہاب الدین شاہ، ولد پیر صفدر علی شاہ، ولد شاہ مراد شاہ راشدی، درگاہ شریف پیر گوٹ، خیر پور سندھ میں پیدا ہوئے۔ان کی وفات ۸۷ سال کی عمر میں ہوئی۔اس حساب سے ان کی ولادت کی تاریخ ۱۸۷۶ء میں ہوئی ہوگی۔انھوں نے اپنے دور کے جید عالموں سے علم حاصل کیا اس وجہ سے وہ سندھی، عربی، فارسی، اچھے طریقے سے لکھنا، پڑھنا جانتے تھے، پھر انگریزی کے شوق کی وجہ سے اس میں بھی مہارت حاصل کی، قرآن شریف کی کتنی ہی آیتیں اور حدیثیں بھی زبانی یاد تھیں، کچھ کتابیں عربی میں پڑھیں جن میں زیادہ تر طب پر تھیں۔وہ کہتے تھے کہ اردو کی ایک زبردست کتاب "مرنے کے بعد" پڑھنے سے انسان میں خود کو سنبھالنے کا طریقہ آ جاتا ہے، شجرہ راشدیہ کی ابتداء میں پیر شہاب الدین راشدی کا خاکہ لکھا ہے، اس کے مطابق:

> "ان کا چہرہ ہنستا مسکراتا، تراشی ہوئی تصویر کی طرح، سنہری بال جسے پہلے خضاب لگاتے تھے۔پھر جب خضاب لگانا چھوڑ دیا تو چاندی جیسی سفیدی نظر آنے لگی، قد ٹھیک ٹھاک، بدن بھرا بھرا، وہ چاک و چوبند مرد تھے۔تنگ پائینچوں کی شلوار، بدن پر کرتا یا قمیص، اس پر واسکٹ، سردیوں میں کوٹ، سر پر ٹوپی جس کا سرا اوپر سے پھیلا ہوا، اور کنارا تنگ، وہ ایک لکڑی بھی ساتھ رکھتے تھے، پیروں میں جوتا پہنتے تھے، گھوڑے پر سواری کیا کرتے تھے، دھوپ سے بچنے کے لیے لال رومال ماتھے پر رکھتے تھے، ہر طریقے سے دھوپ سے بچنے کی کوشش کرتے تھے، تاکہ شعاعیں آنکھوں پر نہ پڑیں ان کے پاس مولوی فیض الکریم ملتانی کا ایک فتویٰ موجود تھی، جس میں یہ تھا کہ سونے کے ٹکڑے ٹکڑے مرد کو پہننا جائز ہیں۔اس لیے وہ انگوٹی اور کڑے بھی پہنتے تھے۔"

مذکورہ تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ پانچ وقت نماز کے پابند، روزے دار، تہجد گزار تھے، تسبیح بھی پڑھتے تھے، تسبیح ہمیشہ ہاتھ میں ہوتی تھی، زبان سے گفتگو بھی کرتے رہتے تھے، تب بھی تسبیح کے دانے پلٹتے رہتے تھے۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا پیر شہاب الدین راشدیؒ گفتگو کے دوران تسبیح کے دانے گھماتے رہتے تھے، ایسا ایک واقعہ یا ایک سوال حضرت زوّار حسین شاہ صاحب نقش بندی مجددیؒ سے بھی ہوا تھا تو آپ نے جواباً فرمایا:

''جب سالک کا قلب جاری ہو جائے تو پھر زبان کے علاوہ بھی ذکر مسلسل جاری رہتا ہے۔''

لہٰذا معلوم ہوا کہ تسبیح کا تعلق گفتگو سے نہیں ہوتا بہ شرطے کہ سالک کا قلب جاری ہو گیا ہو۔ پیر شہاب الدین شاہ راشدی کی زندگی ایسی معلوم ہوتی ہے کہ آپ کا قلب جاری ہو گیا ہوگا۔ مذکورہ تذکرے میں آپ کی ریاضت سے متعلق درج ہے:

''عبادت گریہ وزاری کے ساتھ کرتے تھے، ان کی آنکھیں بھیگی رہتی تھیں، خدا کے خوف سے ان کے آنسو کبھی نہ رکتے۔ حکمت کا پیشہ ان کے چچا کا تھا جن سے انہوں نے بھی علمِ طب حاصل کیا، ان کے چچا علی مردان شاہ الھڈنی، کے ساتھ آ کر رہتے تھے، اس جگہ کو اب پیر حاجن شاہ کا دیہات، کہتے ہیں، سائیں پیر مردان شاہ سندھ کے نامور حکیموں میں سے ایک تھے۔ ایک ذکر کے مطابق جب انگریزوں کی حکومت تھی تو ایک انگریز ڈاکٹر نے ایلو پیتھک دواؤں کے زیادہ استعمال کے لیے حکومت کی طرف سے سندھ کے نامور حکیموں کو بلوا کر انھیں چند ہدایتیں کیں، علی مردان شاہ نے کہا کہ، ڈاکٹر صاحب یہ دوائیں آپ نے سرد ممالک کے لوگوں پر تجربہ کر کے بنوائی ہیں۔ گرم ممالک کے رہنے والوں کے لیے یہ دوائیں آزمودہ نہیں۔ یہ بھی ایک گرم ملک ہے، اگر آپ کی یہ دوائیں آزمودہ ہیں تو آپ شوگر کی بیماری کو جسے ہم ذیابطیس اور آپ ڈائبٹس کہتے ہیں، لوگ اس بیماری میں اب تک کیوں مبتلا ہیں، آپ کی اس بیماری کا علاج ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں کر سکتا، پھر اس ڈاکٹر نے نبض دکھا کر باقاعدہ علاج شروع کروایا اور پھر صحت یاب ہو گیا، اس ڈاکٹر نے یہ بات مان لی کہ اگر ایلو پیتھک عوام کی بھلائی کا علاج ہے تو پھر یونانی علاج بھی بہت سی بیماریوں کا توڑ ہے۔ ایسے کتنے ہی سرٹیفکٹ سائیں مردان شاہ کو دیے گئے تھے۔ سائیں شہاب الدین شاہ ان کے شاگرد تھے، اور کچھ کم نہ تھے، ان کے علاوہ ان کا سعادت مند ایک اور شاگرد رشید تھا۔''

علی مردان شاہ کا ذکر ہم نے یہاں صرف اسی لیے نہیں کیا کہ پیر شہاب الدین شاہ راشدی نے آپ سے حکمت کی تعلیم حاصل کی تھی یا یہ آپ کے چچا تھے، بلکہ ایک مقصد یہ بھی ہے کہ علی مردان شاہؒ کی اولاد جن میں سائیں شاہ مراد عرف اللہ ڈنو شاہ، سائیں عبدالرؤف حاجن شاہ، سائیں، غلام علی شاہ، اور سائیں عباس علی شاہ شامل تھے۔ یہ لوگ ''سھارجا'' کے

قریب ایک دیہات میں جس کا نام "دیرو" تھا۔ آباد ہوئے، یہاں ان کے گھر آج بھی موجود ہیں۔ ان افراد اور اس خاندان سے بھی پیر مریدی کا سلسلہ شروع ہوا، اور اس علاقے میں بہت مقبول ہوا، سیکڑوں لوگ ان کے حلقے میں شامل ہوئے اور مرید ہوئے، ان صاحبان نے بھی علمِ روحانیت یعنی تصوف کی تعلیم عام کرنے میں ایک نمایاں کردار ادا کیا ہے ۔قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ ان افرادِ خانہ نے ایک ایسے علاقے کا رہائش کے لیے انتخاب کیا تھا جہاں دینی تعلیم کم و بیش مفقود تھی۔ان کے وہاں قیام کرنے سے دینی تعلیم کے فروغ میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ یہ لوگ آج بھی نہایت عقیدت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

مذکورہ بھائیوں میں سے ایک سائیں غلام نبی شاہ اپنا دیہاب چھوڑ کر ٹنڈو الہیار میں رہائش پذیر ہوئے، وہ سائیں شہاب الدین شاہ راشدیؒ کے چچازاد تھے، جب سائیں شہاب الدین صاحب کا یہاں آنا ہوتا تھا تو وہ اپنے ایک دوست حاجی محمد یوسفانی کے پاس ٹھہرتے تھے۔ایسے ہی ایک قیام کے دوران وہاں کے ایک کارخانے میں محفل بجتی تھی۔ جب آپ کے قیام کی اطلاع مقامی لوگوں کو ہوتی تو اکثر لوگ آپ سے ملنے کھنچے چلے آتے ،آپ کے کردار ،افعال، گفتار، تربیت، شریعت کے مختلف موضوعات، طریقت کی تعلیمات کو سن کر یہ لوگ خواہش ظاہر کرتے بلکہ زور دیتے کہ آپ یہاں آ جائیں اور اس علاقے میں دینی تعلیم کو عام کرنے میں احسان فرمائیں۔اسی قسم کا ایک واقعہ" ولی داد " دیہات میں بھی پیش آیا، یہاں کے لوگ بھی کہتے تھے کہ آپ یہاں اپنا گھر آباد کریں ہم آپ کی ہر طرح مدد کریں گے،ان کے بار ہا اسرار پر سائیں کو یہاں آنا پڑ گیا، پھر یہ دیہات ان کی توجہات، خدمات، دینی فروغ، مذہبی تعلیم، قرآنی فکر دینے اور ان کے شرعی کردار سے ایسا متاثر ہوا کہ پھر اس ولی داد دیہات کا نام، اس ولی اللہ کے نام سے منسوب ہو کر" پیر شہاب الدین شاہ کا دیہات" کے نام سے مشہور رہا۔ آج بھی ٹنڈو الہیار سے قریب یہ دیہات اسی نام سے مشہور ہے۔

راشدی خاندان کے تذکرے مرتبہ: پیر فیض الدین شاہ میں راشدی خاندان کی بابت درج ہے:

"راشدی خاندان میں کوئی ایسا شخص نہ تھا جو کہ پیری، مریدی کے ساتھ حکمت کا فن نہ جانتا ہو، اس خاندان میں سخت پردہ اور پرہیز گاری چلی آ رہی تھی، ان کے بڑے اپنے چھوٹوں کو پیار سے سمجھا کر حکمت کی طرف راغب کرتے تھے، لوگ انہیں اکثر کہتے تھے کہ کیا آپ کے پاس خاندان کی بہو، بیوی، بیٹیاں دوسرے حکیموں اور ڈاکٹروں کے پاس جا کر اپنے بازو ان کے آگے کر دیں اور خود کو

ان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیں تو آپ کے خاندان کی عزت، آبرو، شان وشوکت ان کے رحم وکرم پر آ جائے گی، ان باتوں سے ان کی غیرت جوش کھاتی اور اسی وجہ سے راشدی خاندان کے زیادہ تر لوگ حکمت سے واقف ہیں راشدی خاندان اور حکمت لازم وملزوم ہیں۔''

پیر شہاب الدین شاہ راشدی جب عبادت، ریاضت اور وظائف سے فارغ ہوتے تو مطب سنبھالتے، خاندان کے تمام افراد تو (جو یہاں مقیم تھے) آپ ہی سے فیض یاب ہوتے اس کے علاوہ دیگر افراد بھی آپ سے علاج کراتے۔ آپ کار مسیحائی کو حقیقتاً عبادت سمجھتے تھے۔ اس علاقے میں نا معلوم کتنے افراد ہوں گے جو آپ سے علاج کراتے اور آپ اُن سے ایک پائی کی امید نہ رکھتے تھے اگر کوئی دواؤں کا خرچ دے جاتا تو بھی دعا اور نہ دیتا تو بھی دعا ان کا کہنا تھا دوا میں شفا اسی وقت آتی ہے جب دعا کا اثر شامل ہو۔

شام کو ہر روز محفل لگتی تھی جس میں شہر کے معزز لوگ عالم، اور مرید شرکت کرتے تھے، اللہ اور رسولؐ کی باتوں کے بعد حالتِ حاضرہ اور حالتِ زمینداری کی باتیں ہوتیں تھیں، اس محفل میں اکثر بڑوں کے اقوال لطیفے اور ٹوٹکے پر بااخلاق طریقے سے گفتگو ہوتی تھی، ان کی خوش طبعی اور علمی رعب، بہت سے لوگوں پر غالب تھا۔ وہ زیادہ خشک طبیعت کے مالک بھی نہ تھے، شگفتہ باتیں کرتے تھے، اور بعض لوگوں کو نہایت سہل اور غیر محسوس طریقے سے اس طرح ہدایت کرتے تھے کہ وہ ان کی زندگی پر اثر انداز ہوتی یہ ان کی تعلیم کا خاص انداز تھا۔

صدقۂ جاریہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا، جس میں شہر کے معزز لوگ، سیٹھ، عالم اور مرید بھی آ کر شرکت کرتے تھے، کوئی شخص ان کے دروازے سے خالی ہاتھ نہ جاتا اپنے مطب کے دوسری طرف بیماروں کے رہنے کے لیے بڑا سا کمرہ بنا ہوا تھا، جہاں بیمار رہتے تھے، کچھ کوٹھیاں بھی تھیں جن میں مہمان رہتے تھے۔ خاص مہمان مولوی فیض الکریم، مولوی رحیم بخش اور ان کے والد زیادہ تر آ کے ٹھہرتے تھے، کھانے کے وقت تو کسی کو جانے نہ دیتے تھے، اور کہتے'' بابا غریبانہ کھانا کھا کر جاؤ'' اکثر لوگوں کو کھانا کھلا کر پھر خود کھا کر آرام کرتے تھے، اکثر عالموں سے دینی باتوں میں مشغول رہتے۔

وہ خدا کا خوف رکھنے والے بندے تھے، کتنے ہی معاملاتِ طب اور وظائف میں کمال رکھتے تھے، جب ان کے پہلے فرزند نور الحسن نے وفات پائی تو غم سے نڈھال ہو گئے، عبادت میں زیادہ وقت صرف ہوتا اور اپنے بیٹے کی مغفرت کے ساتھ ساتھ گھر کی رونق پھر سے حاصل کرنے کی خواہش کا اظہار دربارِ خداوندی میں انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ کیا

کرتے چوں کہ آپ اللہ کے نیک بندے تھے اس لیے اشارہ ہوا کہ آپ کو یہ خوشی دوبارہ حاصل ہوگی چناں چہ پھر آپ کے یہاں ایک بیٹا پیدا ہوا جس کی شکل وصورت نورالحسن سے بہت ملتی ہوئی تھی۔

اس علاقے میں شیعہ اور سنی مسلک کے لوگ آباد تھے، ان دونوں فرقوں کے درمیان اگر کبھی اختلاف ہوتا اور معاملہ جھڑپ سے جھگڑے تک آ پہنچتا تو مصالحت کے لیے شہاب الدین شاہ راشدیؒ سے رجوع کیا جاتا اور آپ کی بات کو حتمی سمجھ کر فریقین اس پر اتفاق کرتے۔ لیکن اس نوعیت کا کوئی فیصلہ کرنے سے پہلے آپ اچھی طرح تحقیق فرماتے۔ قرآنِ پاک میں بھی ارشاد ہے کہ کسی بات کو سن کر یقین کرنے سے قبل اس بات کی اچھی طرح تحقیق کرلو۔

دونوں فریقین ان کی بات اس لیے تسلیم کرتے تھے کہ یہ معاملے کی تحقیق کے ساتھ ساتھ خود بھی ایک ایسا کردار رکھتے تھے جو متاثر کن تھا۔ مناسب ہے کہ اب ہم یہاں نکات کی صورت میں آپ کی فکر و تبلیغ کا احاطہ کرنے کی کوشش کریں۔

دینی خدمات

☆ سائیں شہاب الدین شاہ راشدیؒ نے اپنی زندگی کا غالب حصہ عبادت وریاضت میں صرف کیا۔ جس کا اثر لوگوں پر اس طرح پڑا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوتے گئے۔ اس لیے کہ بزرگوں کا قول ہے نیک شخص اور ولی اللہ کی نشانی یہ ہے کہ اسے دیکھ کر دیکھنے والوں کو اللہ یاد آئے۔

☆ طب کے ذریعے مفلوک الحال عوام کی خدمت کی اس خدمت کی وجہ سے لوگ ان سے متاثر ہوئے اور اُس حلقے میں داخل ہوتے چلے گئے جو حلقۂ دین کہلاتا ہے۔

☆ قرآنی تعلیم پر مکمل دست رس ہونے کی وجہ سے زندگی کے مختلف مسائل کا جواب اس علم کی روشنی میں تلاش کرنے کی کوشش کرتے جس سے سننے والوں کو اس تعلیم کا اثر معلوم ہوتا اور وہ بھی اس کے طالب علم ہونے کی کوشش کرتے۔

☆ مختلف دینی مسالک کو قریب لانے کی کوشش کی اور ان کے باہمی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ہمیشہ کوشاں

رہے۔یہی وجہ ہے کہ آپ کی بات کو ہر مسلک کے فرد نے تسلیم کیا۔

☆ ان کی تعلیمات کی بنیاد قرآن وشریعت کی تھی۔ایسی تعلیم کے فروغ کرنے والا کا سہارا اللہ پاک خود بنتا ہے چناں چہ آپ کے ہاتھوں اس تعلیم نے ایسا فروغ پایا کہ جس علاقے میں آپ رہائش پذیر تھے وہ علاقہ آپ کے نام سے منسوب ہو گیا۔

بہ ظاہر تو یہ عام سے اور معمولی نکات ہیں جو با کثرت لوگوں میں نظر آ سکتے ہیں۔لیکن شہاب الدین شاہ راشدی کی پوری زندگی کے تناظر میں اگر دیکھیں تو یہ نکات اس لیے اہم ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے پوری زندگی اسی انداز اور طریق پر بسر کی،مزید یہ کہ آپ کے خاندان کے بزرگوں کی یہ روایت رہی ہے کہ یہ لوگ علم پرور،ادب دوست اور دینی رجحان کے حامل تھے۔لہٰذا انہوں نے بھی اپنے بزرگوں کے اندازِ زندگی کو اختیار کیے رکھا اس لیے ان نکات کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔ایک اور زاویے سے اگر ہم مذکورہ نکات کا جائزہ لیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مثبت پہلو ہیں ہر انسان میں کچھ خوبیاں اور کچھ خامیاں ہوتی ہیں،کہیں خوبیاں قابلِ ذکر ہوتی ہیں،کہیں خامیاں غالب آ جاتی ہیں اور کہیں معاملہ متوازن رہتا ہے۔لیکن ہمیں شہاب راشدیؒ کے یہاں کوئی ایسا پہلو اور مثال نہیں ملتی جو منفی شمار ہو،ممکن ہے کچھ ایسی باتیں بھی ہوں ،لیکن وہ بشری تقاضے کے مطابق ہوں گی،یعنی مثبت پہلو آپ کی شخصیت پر غالب تھے۔جب کسی شخصیت پر تعمیری اور مثبت پہلو غالب ہوتے ہیں تو اس کی شخصیت اُس خاص میدان میں متاثر کن ہو جاتی ہے۔اگر یہ میدان دینی رجحان سے متعلق ہو تو شخصیت میں چار چاند لگ جاتے ہیں۔ہماری اس شخصیت کی کشش بھی اسی میں نظر آتی ہے کہ انہوں نے اپنی پوری زندگی ان اصولوں کے مطابق دینی ماحول میں بسر کی،اور اس طرح کہ دوسروں کے لیے باعثِ کشش ہو گئے۔یقیناً اس تاثیر اور تاثر کے بعد لوگوں میں ان سے قربت پیدا ہوئی ہو گی اور اس طرح بہت سے لوگ اس لذت سے آشنا ہو گئے ہوں گے،جسے لذتِ تصوف یا سرورِ روحانی کہا جاتا ہے۔(۱)

---

(۱) شہاب الدین شاہ راشدی کے مذکورہ تذکرے کے لیے ہم نے "راشدی خاندان جو شجرو" سے خاص استفادہ کیا ہے۔

حاجی امام الدین راشدی (م،۱۳۵۰ھ)

سید امام الدین ولد پیر سید رشید الدین (صاحب العلمہ ثالث) ولد پیر محمد یٰسین (صاحب العلمہ الثانی) ولد پیر سید محمد راشد روضے دھنیؒ، حاجی امام الدین راشدی نے اپنے والد کی تربیت کے ذریعے تصوف کی منزلیں طے کرتے ہوئے قادری راشدیہ طریقے میں خلافت حاصل کی۔ عام تعلیم کم حاصل کی مگر علماءؒ کی صحبت، مجلسی علم کی بدولت اور مذہبی کتابوں کے مطالعے کے سبب ان کی علمی معلومات وسیع اور مستند تھی۔ ان کا زیادہ مذہبی رجحان حدیث کی طرف تھا انہوں نے حدیث کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا۔ اور اپنی پوری عملی زندگی حنفی مسلک کے مطابق گزاری۔ سید امام الدین راشدی بھی اپنے بزرگوں کی طرح علم طب کے ماہر تھے، اور ان کو اپنے بزرگوں سے طب میں ایسے مفید نسخے اور مشورے ملے تھے جس سے اس میدان میں ان کی بہت شہرت ہوگئی تھی۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ وہ علمِ کیمیاء کے بھی ماہر ہیں۔ ''تذکرہ مشاہیر سندھ'' میں درج ہے کہ ایک مرتبہ ان سے کسی نے معلوم کیا تھا کہ کیا آپ علمِ کیمیاء پر مکمل دست رس رکھتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب میں اقرار کیا تھا۔ اسکے علاوہ مختلف نوعیت کے نقشے بنانے میں بھی انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، مختلف عملیات یعنی تعویذ وغیرہ لکھنے میں بھی بڑا رتبہ تھا۔ عادات میں بھی آپ بڑے مخلص مہربان اور مہمان نواز تھے۔ مذکورہ تذکرے کے مصنف نے لکھا ہے:

> ''نوجوانی کے زمانے میں اپنے والد کے حکم سے ٹھلہ شریف کے قریب باقرانی میں آ کر مقیم ہوئے۔ اور وہیں پر ان کے فیض اور ارشاد سے ایک بہت بڑی جماعت قائم ہوگئی، جو اس علاقے میں ایک فیضِ جاریہ کی حیثیت رکھتی تھی، آپ کی سرپرستی میں اس پوری جماعت نے بہت مفید اور بہت عظیم دینی کام سرانجام دیے۔ آپ نے ۱۳۲۲ھ میں اپنے بڑے بھائی عالم فاضل عارف باللہ سید رشد اللہ صاحب العلم کے ساتھ حج کا سفر کیا۔''

جس کے بعد آپ اپنے نام کے ساتھ 'حاجی' کی فضیلت اور نسبت سے زیادہ پکارے جانے لگے یعنی ''حاجی'' صاحب اور یوں آپ کا نام حاجی امام الدین راشدی مقبول ہوا۔

آپ کے دینی اورادبی کام کے سلسلے میں ہمیں جو اہم معلومات حاصل ہوتیں ہیں وہ اس طرح ہیں۔

''حضرت مولانا عبداللہ سندھی نے جب ۱۹۰۱ء میں مدرسہ دارالرشاد کی بنیاد رکھی تب آپ کو ممبر شوریٰ میں شامل کیا گیا جہاں آپ ہمیشہ کھلے دل سے مدرسہ الرشاد کی امداد کرتے رہے۔ جس کے نتیجے میں اس مدرسے نے خاطر خواہ ترقی کی اور اس کی کارکردگی میں خوب اضافہ ہوا، مدرسے کا یہ کام اور آپ کی نگرانی اور توجہ از خود ایک بڑا دینی کام ہے۔ اس اعتبار سے حاجی امام الدین راشدیؒ ،راشدیہ خاندان کے ایک باعلم ،باعمل ،باکردار، دین دار اور مذہبی رجحان کے ایک پر تاثیر بزرگ تھے۔ آپ کا وصال گردن پر پھوڑا نکلنے کے سبب ۲۷، ربیع الثانی ۱۳۵۰ھ میں رحلت فرما گئے۔''(۱)

---

(۱) تذکرہ'' مشاہیر سندھ'' جلد اوّل ،مرتبہ: مولانا دین محمد وفائی ،سندھی ادبی بورڈ ،جامشورو، حیدرآباد، مطبوعہ: ۱۹۸۵ء۔ صفحہ:۱۷۶، سے اس تذکرے میں مدد لی گئی ہے۔

سید علی محمد شاہ راشدیؒ (م، ۱۹۸۷ء)

سید صبغت اللہ شاہ اوّل (م، ۱۸۳۱ء) کے ایک فرزند سید علی محمد شاہ (اوّل) (م، ۱۳۸۴ھ مطابق ۱۸۶۷ء) بھی تھے۔ان کے یہاں پانچ فرزند ہوئے ان میں سے ایک سید محمد میاں ہیر شاہ (م، ۱۳۴۱ھ مطابق ۱۹۳۱ء) تھے۔ان کے فرزند حامد شاہ (م، ۱۹۳۷ء) کے یہاں تین صاحب زادے ہوئے ، ان میں سے ایک پیر سید علی محمد شاہ راشدی (م، ۱۹۸۷ء) دوسرے پیر حسام الدین راشدی اور تیسرے پیر سید احمد شاہ راشدی تھے۔آپ ۱۲، جمادی الثانی ۱۳۲۴ھ مطابق ۵، اگست ۱۹۰۵ء کو پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومار دکنی اور مولوی محمد صدیق سے حاصل کی۔

سید علی محمد شاہ راشدی، قیام پاکستان اور پاکستانی صحافت وسیاست میں بیک وقت معروف رہے، انھوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز میدانِ سیاست سے اس وقت کیا جب ۱۹۲۶ء میں سندھ محمڈن ایسوسی ایشن میں شمولیت اختیار کی، معلوم ہوتا ہے کہ اسی دور میں آپ نے ''الراشد'' نام سے ایک اخبار بھی نکالا تھا کیوں کہ آپ نے انجمنِ سادات راشدیہ بھی قائم کی تھی جس کے تحت آپ نے نمایندے کھڑے کیے تھے اور الراشد اخبار کے ذریعے ان نمایندوں کی تشہیر کی گئی تھی لیکن انجمنِ سادات سے کوئی نمایندہ کامیاب نہیں ہوسکا۔

جب سندھ کو بمبئی سے الگ کرنے کی منظم تحریک چلی جس کا مطالبہ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے اپنے تاریخی چودہ نکات میں بھی کیا، تو اسے کامیاب کرنے کے لیے سندھ میں پیر سید علی محمد شاہ راشدی نے نمایاں کردار ادا کیا، اس مطالبے سے متعلق مدلل جوابات راشدی صاحب ہی تحریر کیا کرتے تھے جو یہاں سے شایع ہوتے۔

۱۹۳۳ء سے ۱۹۳۶ء تک ضلع اسکول بورڈ لاڑکانہ کے نگراں رہے، ۱۹۳۶ء میں حاجی عبداللہ ہارون کی کوشش سے ''سندھ اتحاد پارٹی'' بنائی گئی تو یہ اس کے بنانے والوں میں شامل تھے۔اس پارٹی سے وابستہ افراد اور ان کی نمایندگی کے حق میں انھوں نے ''صبح سندھ'' اخبار میں مستقل کالم لکھے، جی ایم سید نے اپنی تصنیف ''جب گزر اریم جن سین'' میں علی محمد شاہ راشدی کا بڑی تفصیل سے ذکر کیا ہے، وہ لکھتے ہیں: (صیغۂ حال اس لیے ہے کہ یہ تحریر مصنف نے ممدوح کی زندگی میں لکھی)۔

کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کے جنرل سیکریٹری کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔

۱۹۴۰ء میں لاہور میں منعقد ہونے والے آل انڈیا مسلم لیگ کے انتظامات کے نگراں مقرر ہوئے اور اسی اجلاس میں قراردادکی ترتیب وتدوین میں بھی معاونت کی جوآگے چل کر قراردادِ پاکستان کہلائی۔

۱۹۶۳ء سے روزنامہ جنگ میں ''مشرقِ بعید'' کے عنوان سے مستقل کالم نگاری کی یہ نہایت سنجیدہ کالم تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی فکاہیہ کالم نگاری کا سلسلہ ''وغیرہ وغیرہ'' کے عنوان سے جاری رہا۔اس طرح آپ جنگ کے ادارتی صفحے پر کم وبیش ربع صدی تک کالم تحریر کرتے رہے، یہ ان کی اردو خدمت کے حوالے سے بھی اہم دور ہے۔

۱۹۴۹ء میں پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹر کانفرنس کے صدر منتخب ہوئے اور پاکستانی پریس کے اس تاریخی وفد کی سربراہی کے فرائض انجام دیے، جو ہندوستان گیا تھا اور جس نے لیاقت، نہرو معاہدے کی راہ ہموار کی تھی، ۱۹۴۹ء ہی میں مشترکہ ہندوستان کے صدرِ مشترک منتخب ہوئے اس کے ایک سال بعد ۱۹۵۰ء میں مصر اور برطانیہ جانے والے پریس وفد کی نمائندگی کی تھی ۱۹۵۳ء میں سندھ کی مجلسِ قانون ساز کے رکن منتخب ہوئے اور صوبائی وزیر مالیات صحت عامہ اور اطلاعات کے منصب پر بھی فائز رہے۔

۱۹۵۴ء میں سندھ کے وزیر مالیات کی حیثیت سے جامشورو میں ''سندھ میڈیکل کالج'' قائم کیا مزید برآں کہ جامشورو ہی میں سندھ یونی ورسٹی کے نئے کیمپس کا قیام عمل میں لائے۔ سکھر، نواب شاہ اور لاڑکانہ میں سول اسپتال بھی قائم کیے، یہ کام دنیا کے ساتھ ساتھ دین کی بھی خدمت ہے کہ ''جس نے ایک شخص کی جان بچائی گویا اس نے پوری انسانیت کی جان بچائی''۔

۱۹۵۰ء میں پاکستان کی مجلسِ قانون کے رکن منتخب کیے گئے، اور وفاقی وزیر اطلاعات وتشریات بنائے گئے، اس دوران ۱۹۵۶ء کے آئین میں بڑی گرم جوشی سے حصہ لیا۔لیکن اسی سال جب ''ری پبلکن'' پارٹی برسرِ اقتدار آئی تو آپ وزارت سے مستعفی ہوکر حزبِ اختلاف میں جا بیٹھے، ۱۹۵۷ء میں مجلسِ قانون ساز کی رکنیت سے بھی مستعفی ہوگئے اور فلپائن میں پاکستان کے سفیر ہونے کی ذمہ داری قبول کی، یہاں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں جس کے اعتراف میں فلپائن حکومت نے اپنے یہاں کا اعلیٰ ترین سول اعزاز ''آرڈر آف دی رالاشتاتونا'' سے نوازا۔

۱۹۶۱ء میں ان کے سفارتی تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے حکومتِ پاکستان نے انہیں عوامی جمہوریہ چین میں

پاکستان کا سفیر مقرر کیا، پاک چین دوستی کو استحکام دینے میں ان کا کلیدی کردار رہا ہے اس کردار کی روشنی میں پاک چین سرحدی معاہدہ طے پایا۔ ۱۹۶۶ء میں عہدۂ سفارت سے سبک دوش ہوئے اور اپنے سابقہ علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں کی جانب رجوع کیا، پیر علی محمد راشدی کی درج ذیل مدون اور غیر مدون تحریریں قابلِ مطالعہ ہیں۔

(۱) ''فریاد سندھ'' سندھی زبان میں۔

(۲) ''اُھی ڈینھن اُھی شیھن'' سندھی زبان میں، تین ضخیم جلدوں پر مشتمل۔

(۳) ''رودادِ چمن'' روزنامہ جنگ میں شایع شدہ مضامین کا مجموعہ۔

(۴) خطء مضمون'' سندھی زبان میں۔

(۵) ''اسٹوری آف سفرنگس آف سندھ'' انگریزی زبان کی قابلِ ذکر کتاب۔

(۶) ''اے پوائنٹ آف ویو'' روزنامہ جنگ لندن کے لیے ہفت وار کالم کا عنوان۔

(۷) کراچی سے شایع ہونے والے ایک انگریزی اخبار میں ''امپریشن آف ریفلیکشن'' کے عنوان سے مستقل کالم۔

(۸) ''زندہ پند'' کے عنوان سے حیدرآباد کے سندھی روزنامے میں ہفت وار کالم۔

حواشی

(۱) جی ایم سید ''جب گزار یم جن سین''، صفحہ: ۲۱۲

(۲) ایضاً صفحہ: ۲۱۳

(۳) جی ایم سید کی مذکورہ کتاب میں اس ماہنامے کا نام ''الراشدیہ'' لکھا ہے۔

(۴) مذکور کتاب کے صفحہ ۲۰۸ پر ہے کہ انہوں نے ایک انگریزی اخبار ''اسٹیٹمنٹ'' بھی جاری کیا تھا۔ کتاب ''پاکستان کی مشہور شخصیتیں'' از نور الصباح (سالِ اشاعت ندارد) کے صفحہ: ۹۵ پر ہے کہ راشدی صاحب ''سندھ آبزرور'' کے ایڈیٹر بھی رہے۔

پیر سید حسام الدین شاہ راشدیؒ (مرحوم)

سید حسام الدین راشدی ولد حامد شاہ راشدی بروز جمعرات ساڑھے سات بجے صبح ۲۵، رمضان المبارک ۱۳۲۹ھ مطابق ۲۰، ستمبر ۱۹۱۱ء کو پیدا ہوئے۔ یہ پیر علی محمد شاہ راشدی کے چھوٹے بھائی تھے انھوں نے ابتدائی تعلیم مولوی محمد سومارد کنی سے حاصل کی اس کے بعد مولوی محمد الیاس پنہور سے درس لیا آخر میں مولوی سید علی شاہ لکیاری سے استفادہ کیا، آپ نے سندھی، اردو اور فارسی میں خوب دست رس حاصل کی اور ان تینوں زبانوں میں نمایاں علمی اور ادبی خدمات انجام دیں اس کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی مہارت حاصل کی، انہیں بچپن ہی سے مطالعے کا شوق رہا جس کی وجہ سے ان کی معلومات میں بڑی وسعت تھی۔

۱۹۲۶ء کے قریب جب اخبار ''جاگنا'' (جاگٹ) شایع ہوا تو آپ نے اس میں کالم نگاری سے اپنے قلم کا تعارف کرایا، ۱۹۲۹ء کے قریب ماہنامہ رسالہ ''المنار'' شایع ہوا تو آپ اس کے ایڈیٹر ہوئے، ساتھ ساتھ ماہنامہ ''پیغام'' جو مولانا عبدالکریم چشتی شایع کرتے تھے، پیر حسام الدین راشدی اس اخبار نامہ نگار بھی رہے۔ اس کے بعد خان بہادر کھہڑے کی زیرِ نظر سکھر سے ایک اخبار ''سندھ زمین دار'' جاری ہوا، اس اخبار میں ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۴ء حسام الدین راشدی ایڈیٹر رہے، جس کے بعد ۱۹۳۴ء ہی میں آپ نے میاں علی محمد شاہ کے ساتھ مل کر ایک ہفت وار اخبار ''ستارۂ سندھ'' جاری کیا جس میں اعلیٰ علمی، ادبی، تاریخی اور سیاسی مضامین شایع ہوتے تھے۔

۱۹۳۷ء تک یہ اس کے ایڈیٹر رہے ۱۹۴۱ء میں ''الوحید'' اخبار سے وابستہ ہوئے جس کے بعد ''قربانی'' اخبار جاری کیا، اس اخبار میں پیر حسام الدین راشدی بغیر نام کے مضامین اور کالم لکھتے تھے۔

۱۹۵۰ء میں اُس وقت کے وزیرِ تعلیم سندھ میاں غلام نبی خاں پٹھان نے سندھی ادبی تنظیم بورب کو از سرِ نو تعمیر کیا اور اسے سندھی ادبی بورڈ کے نام سے متعارف کرایا، اس میں تین سال کے بعد یعنی ۱۹۵۳ء سے پیر حسام الدین راشدی کو منیجر کی ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

قیامِ پاکستان کے بعد جب مولوی عبدالحق نے ''انجمن ترقی اردو'' کا دفتر دہلی سے کراچی منتقل کیا تو پیر صاحب کو

انجمن کے شریکِ کار کی حیثیت سے منتخب کیا گیا، پیر حسام الدین راشدی بابائے اردو مولوی عبدالحق کے قریبی دوستوں میں سے تھے اس کے علاوہ اردو کے معروف محقق مولوی پرنسپل محمد شفیع (ایڈیٹر، انسائیکلوپیڈیا آف اسلام، المعارف) سے بھی بڑے گہرے مراسم رکھتے تھے، مولوی محمد شفیع کے انتقال پر آپ کا طویل مقالہ (مشمولہ: مقالاتِ راشدی) قابلِ مطالعہ ہے۔ آپ کی علمی و ادبی خدمات جس قدر سندھی میں ہیں اسی قدر اردو میں بھی ہیں جس کے تحت ۱۹۶۴ء کو حکومتِ پاکستان کی جانب سے صدرِ پاکستان نے ''تمغۂ امتیاز'' سے سرفراز فرمایا۔ فارسی خدمات کے اعتراف میں ۱۹۶۵ء کو ایران کی وزارت نے آپ کو بطور خاص ایران بلوایا جہاں آپ نے مختلف شہروں میں فارسی زبان میں تاریخ پر لیکچر دیے۔ اس موقع پر شہنشاہِ ایران سے بطور خاص ملاقاتوں کا سلسلہ رہا اور آپ کی لیاقت اور فارسی دانی کے اعتراف میں ایران کے معروف شعراء نے پیر حسام الدین راشدی پر قصائد اور قطعات تحریر فرمائے، اور شہنشاہِ ایران نے آپ کو ''نشانِ سپاس'' بھی پیش کیا، اسی سال پیر صاحب کو پاک روس کلچر ایسوسی ایشن کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔

۱۹۶۶ء میں پیر حسام الدین راشدی نے پاکستانی اہلِ قلم کے وفد کی سرپرستی کرتے ہوئے چین کا دورہ کیا۔ متشرقین کی عالمی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے روس، ہندوستان اور امریکہ بھی گئے۔ اسی سال شہنشاہِ ایران کی طرف سے پہلوی کتب خانے کے تحت ہونے والے ''ایران شناس علماٗ'' کے عالمی اجلاس میں شرکت کرنے بطور خاص ایران گئے۔ واپسی میں افغانستان کا دورہ کیا اور وہاں سندھی افغانی لسانیات پر بالخصوص تحقیق کی۔ آپ کی تصنیفات، تالیفات اور مقالات کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سندھی، اردو، فارسی اور انگریزی زبانوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ جن میں سے چند تصانیف کا تعارف اس لیے ناگزیر ہے کہ اس کے بغیر پیر حسام الدین راشدی کی فعال، متحرک اور عالمانہ شخصیت کا تعارف مکمل نہیں ہوسکتا۔

(۱) انارکلی اور کچھ دوسرے افسانے اور کہانیاں

ویسے تو اس ادیب، عالم، مورخ، دانشور اور نقاد نے مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا ہے، ابتدائی دور میں شاعری بھی کی لیکن پیر حسام الدین راشدی نے ایک انٹرویو کے دوران یہ اعتراف کیا تھا کہ میں بنیادی طور پر افسانہ نگار ہوں، اُن کے بہت سے افسانے، کہانیاں سندھی اخبار ''سندھ زمین دار'' میں شایع ہوئے، لیکن مجموعے کی صورت میں مرتب نہیں ہو سکے۔

۱۱۷۴ھ میں ایک ضخیم کتاب لکھی، دوسو سال کے بعد یہ کتاب راشدی صاحب نے مرتب کی پہلے مہران کے ذریعے شایع ہوئی بعد میں اس کی قدامت اور افادیت کے پیش نظر سندھی ادبی بورڈ نے اسے مکمل طور پر سندھی میں شایع کرنے کا فیصلہ کیا، چناں چہ ۱۹۶۷ء میں یہ کتاب ''مکلی نامہ'' کے نام سے شایع ہوئی جس میں پیر حسام الدین راشدی کا مقدمہ، تعارف، حواشی اور شجرہ قابلِ داد ہے۔

(۷) دسویں صدی عیسوی کا سندھ:

سلطان سلیمان ثانی (ترکوں کی عثمانیہ سلطنت) اپنے دور میں مصر سے بحرِ ہند کے ذریعے سید علی رئیس کو یہاں بھیجا تھا پانچ مہینے پانچ دن رہا اور واپسی پر ایک سفرنامہ ''مراۃ الممالک'' نام سے تحریر کیا جس میں اُس وقت کے سیاسی حالات پر اہم روشنی پڑتی ہے، راشدی صاحب نے اِس کتاب کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۹۷۱ء کو شایع ہوا۔

(۸) تذکرہ مشاہیر سندھ (جلد اوّل)

مولانا دین محمد وفائی نے سندھی مشاہیر کی تاریخ پر یہ کتاب پانچ جلدوں میں تحریر کی۔ اس کتاب کی پہلی جلد حسام الدین راشدی نے ترتیب دی، اس کا مقدمہ اور حواشی تحریر کیے جس سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۹) میر محمد مسعود بکھری:

سندھی زبان میں اس نام سے کون واقف نہیں لیکن ان سے متعلق معلومات میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، پیر حسام الدین راشدی نے مذکورہ عنوان پر تلاش اور تحقیق کے ذریعے مواد کو جمع کیا، یہ کام تقریباً نصف صدی تک جاری رہا، اور یوں ایک عظیم وضخیم کتاب ۱۹۷۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔

(۱۰) سندھی کتاب:

حکومتِ پاکستان کے کہنے پر پیر حسام الدین راشدی نے یہ کتاب لکھی جسے سندھی ادب کی پہلی مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا اردو ایڈیشن کراچی سے ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا، روسی ایڈیشن بھی شایع ہوا تھا۔

(۱۱) ہفت مقالہ:

اس کتاب میں ''سہ ماہی اردو'' میں شایع ہونے والے سات اہم مقالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، جس میں شیخ فرید الدین عطار، حافظ محمود شیرانی، شاہ نامہ کا دیباچہ قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، فردوسی کا مرتب، پروفیسر شیخ محمد اقبال،

(۲) اسلامی کتب خانے:

یہ کتاب ۱۹۳۹ء میں شایع ہوئی، کتاب کے عنوان سے ظاہر ہے کہ لکھنے والے کے ذہن پر اس دور کے سیاسی حالات مکمل طور پر نقش ہیں اس کتاب میں بہت سے کتب خانوں کا اور وہاں موجود ادبیات و ادبیات کا علم ہوتا ہے، بعض ایسی کتابیں بھی نظر آتی ہیں جو اب نایاب اور نادر ہو چکی ہیں۔ یہ کتاب سندھ مسلم ادبی سوسائٹی حیدر آباد کے تحت شایع ہوئی۔

(۳) مہران کی لہریں:

یہ کتاب ۱۹۵۲ء میں شایع ہوئی۔ جس کے تین اہم حصے ہیں، اس میں مرحوم گل حسن، احسن، کربلائی اور تالپور حاکموں کے علمی کارنامے نہایت اہمیت کے حامل ہیں۔ فاضل مرتب نے کتاب کی افادیت اس طرح بیان کی ہے:

> ''ہماری زبان اور ادب کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ وقت بوقت ایسے مجموعے شایع ہوتے رہیں جن میں ہمارا بہترین ادب محفوظ ہوتا رہے، یہ صحیح ہے کہ پرانے رسائل میں سے چھان بین کر کے معیاری چیزیں ڈھونڈنا آسان نہیں، لیکن اپنی زبان اور ادب کے لیے ہمیں محنت و کوشش سے کام کرنا پڑے گا۔''

(۴) تذکرہ امیر ثانی:

خاندانِ امیر ثانی تقریباً تین صدیوں سے کسی نہ کسی صورت میں سندھ پر اپنا اثر رسوخ رکھتا ہے، سیاست کے علاوہ یہ خاندان علمی اور ثقافتی تاریخ میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے، پیر حسام الدین شاہ راشدی نے اس خاندان سے متعلق ایک اہم کتاب مرتب کی اور جسے ۱۹۶۱ء میں شایع کیا گیا۔ اس کتاب میں آپ کی غیر معمولی تحقیق نظر آتی ہے۔

(۵) ماک پنارا بیل:

اس کتاب میں ماہنامہ ''نئی زندگی'' میں شایع شدہ مضامین اور مقالات کا انتخاب کیا گیا ہے، جس کے تحت سندھی ادب کا ارتقاء بہت آسانی سے دیکھا جا سکتا ہے، ۱۹۶۵ء میں یہ کتاب منظرِ عام پر آئی۔

(۶) مکلی نامہ:

میر علی شیر قانع کلہوڑوں کے دور کا مشہور شاعر، ادیب، محقق اور تاریخ نویس تھا۔ انہوں نے مکلی پر نثر اور نظم میں

۱۱۷۴ھ میں ایک ضخیم کتاب لکھی، دوسو سال کے بعد یہ کتاب راشدی صاحب نے مرتب کی پہلے مہران کے ذریعے شایع ہوئی بعد میں اس کی قدامت اور افادیت کے پیش نظر سندھی ادبی بورڈ نے اسے مکمل طور پر سندھی میں شایع کرنے کا فیصلہ کیا، چناں چہ ۱۹۶۷ء میں یہ کتاب "مکلی نامہ" کے نام سے شایع ہوئی جس میں پیر حسام الدین راشدی کا مقدمہ، تعارف، حواشی اور شجرہ قابلِ داد ہے۔

(۷) دسویں صدی عیسوی کا سندھ:

سلطان سلیمان ثانی (ترکوں کی عثمانیہ سلطنت) اپنے دور میں مصر سے بحر ہند کے ذریعے سید علی رئیس کو یہاں بھیجا تھا پانچ مہینے پانچ دن رہا اور واپسی پر ایک سفرنامہ "مراۃ الممالک" نام سے تحریر کیا جس میں اُس وقت کے سیاسی حالات پر اہم روشنی پڑتی ہے، راشدی صاحب نے اس کتاب کا سندھی میں ترجمہ کیا۔ یہ ترجمہ ۱۹۷۱ء کو شایع ہوا۔

(۸) تذکرہ مشاہیر سندھ (جلد اوّل)

مولانا دین محمد وفائی نے سندھی مشاہیر کی تاریخ پر یہ کتاب پانچ جلدوں میں تحریر کی۔ اس کتاب کی پہلی جلد حسام الدین راشدی نے ترتیب دی، اس کا مقدمہ اور حواشی تحریر کیے جس سے اس کتاب کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

(۹) میر محمد مسعود بکھری:

سندھی زبان میں اس نام سے کون واقف نہیں لیکن ان سے متعلق معلومات میں بڑا اختلاف پایا جاتا ہے، پیر حسام الدین راشدی نے مذکورہ عنوان پر تلاش اور تحقیق کے ذریعے مواد کو جمع کیا، یہ کام تقریباً نصف صدی تک جاری رہا، اور یوں ایک عظیم و ضخیم کتاب ۱۹۷۹ء میں منظرِ عام پر آئی۔

(۱۰) سندھی کتاب:

حکومتِ پاکستان کے کہنے پر پیر حسام الدین راشدی نے یہ کتاب لکھی جسے سندھی ادب کی پہلی مکمل تاریخ کہا جا سکتا ہے۔ اس کا اردو ایڈیشن کراچی سے ۱۹۵۰ء میں شایع ہوا، روسی ایڈیشن بھی شایع ہوا تھا۔

(۱۱) ہفت مقالہ:

اس کتاب میں "سہ ماہی اردو" میں شایع ہونے والے سات اہم مقالوں کا انتخاب کیا گیا ہے، جس میں شیخ فرید الدین عطار، حافظ محمود شیرانی، شاہ نامہ کا دیباچہ قدیم، حکیم سید شمس اللہ قادری، فردوسی کا مرتب، پروفیسر شیخ محمد اقبال،

روباعیات عمر خیام اور عبدالباری پر مقالات ہیں۔

(۱۲) دودِ چراغِ محفل:

اس کتاب میں اُن پانچ فارسی گو شاعروں کا احوال دیا گیا ہے جس کا تعلق مرزا غالب سے قائم ہوتا ہے، یہ کتاب ۱۹۶۹ء میں مرزا غالب کے سوسالہ جشن کے موقع پر شایع ہوئی۔

(۱۳) مرزا غازی بیگ ترخان اور اس کی بزمِ ادب:

مرزا غازی بیگ کے سوانح اور ادبی خدمات پر یہ کتاب دو حصوں میں تقسیم ہے، پہلے حصے میں مرزا غازی کی سوانح دی گئی ہے، سندھی کی سیاسی تاریخ کے مطالعہ کرنے والوں کے لیے یہ حصہ بے حد قیمتی ہے۔

دوسرے حصے میں ۳۵ فارسی شاعروں کے کلام سے انتخاب دیا گیا ہے جو کسی نہ کسی صورت اور حوالے سے غازی بیگ سے وابستہ یا متاثر تھے۔ یہ حصہ بھی سندھی فارسی ادب کا مطالعہ کرنے والوں کے لیے ضروری ہے، پیر حسام الدین راشدی بیس بائیس سال تک اس موضوع پر کام کرتے رہے۔

(۱۴) مثنوی چنیسر نامہ:

پیر حسام الدین راشدی نے یہ کتاب مع مقدمہ مرتب کی اور ۱۹۵۶ء میں سندھی ادبی بورڈ کے ذرریعے شایع ہوئی۔

(۱۵) مقالات الشعراء:

سندھ میں بہت پہلے سے فارسی تذکرہ اور تاریخ لکھی جاتی رہی ہے، انہی تذکروں سے استفادہ کرتے ہوئے مرتب نے ''مقالات الشعراء'' کی تکمیل کو ممکن بنایا جو ایک بہت بڑے فارسی علم و ادب کا مطالعہ پیش کرتی ہے۔

(۱۶) تذکرہ لب الالباب: ۶۲۵ھ ۱۲۲۷ء

تصنیف نورالدین محمد عوفی

(۱۷) روضۃ السلاطین: ۹۵۸ھ ۱۵۵۱ء

مولف فخری، ہروی، مقام ٹھٹھہ

(۱۸) جواہر العجائب: ۹۶۲ھ ۱۵۵۵ء

مولف، فخری، ہروی، مقام ٹھٹھہ

(۱۹) ید بیضا: ۱۱۴۵ھ ۱۷۳۲ء تالیف، غلام علی آزاد مقام سہون

راشدی صاحب نے ان تصنیفات و تالیفات کو بھی مع مقدمہ مرتب کیا جو ۱۹۵۷ء کو سندھی ادبی بورڈ کے تحت شایع ہوئیں، یہ کتابیں سندھی ثقافت، تہذیب، معاشرت، سیاست اور ادبی ارتقاء کو فارسی زبان میں سمجھنے کے لیے کلیدی حیثیت رکھتی ہیں۔

(۲۰) مثنوی مظہر الآثار:

ارغونی دور میں سندھ کے اندر پیدا ہونے والے فارسی ادب میں یہ مثنوی کا اولین نمونہ ہے، جو سید جہاں گیر ہاشمی نے ۹۴۰ھ مطابق ۱۵۳۳ء میں لکھی اور شاہ حسن ارغون کے نام منسوب کی بعد میں یہ شاعر حج پر جاتے ہوئے مکران میں ۹۴۶ھ ۱۵۳۹ء میں شہید ہو گیا۔ راشدی صاحب نے بڑی محنت اور جستجو سے اس کتاب کا متن تیار کیا، شاعر کی نایاب تصاویر حاصل کیں، اور فارسی میں ۶۲ صفحات کا نہایت وقیع مقدمہ بھی تحریر کیا، ۱۹۵۷ء میں یہ کتاب شایع ہوئی۔

(۲۱) تکملہ مقالات الشعراء:

فارسی گو شعراء شاعروں کا سندھ میں یہ آخری تذکرہ ہے، جو ابراہیم خلیل نے لکھا۔ راشدی صاحب نے اسے مرتب کیا اور مقدمے کے ساتھ شایع کیا۔

اس کے علاوہ بھی پیر حسام الدین راشدی کی تصنیفات و تالیفات بہت ہیں لیکن ہم نے یہاں چند معروف اور اہم کتابوں کا ذکر کیا ہے، جس سے مصنف و مولف کی علمی اور ادبی خدمات کا ایک خاکہ ہمارے سامنے آ سکتا ہے، آپ کی علمی و ادبی خدمات میں سندھی رسالہ ''مہران'' نے ۱۹۸۳ء میں (۳۱۵ صفحات پر مشتمل) ''پیر حسام الدین راشدی نمبر'' شایع کیا، آخر میں ہم پیر حسام الدین راشدی کے نام مذکورہ رسالے سے معروف ادبی شخصیات کے مکتوبات میں سے تین مکتوبات شامل مقالہ کرتے ہیں جس سے پیر صاحب کی ادبی خدمات کا خاکہ مکمل ہو سکے گا۔

☆ اس تذکرے کی تکمیل میں ''مہران'' پیر حسام الدین راشدی نمبر مطبوعہ ۱۹۸۳ء اور ''مقالاتِ راشدیہ'' مطبوعہ: ۲۰۰۲ء سے استفادہ کیا گیا ہے۔

RAJA OF MAHMUDABAD

راجا محمود آباد

۱۳ مارچ ۶۳

پیر صاحب تسلیم

گویا صاحب کے بارے میں مختلف کوششیں
کیں لیکن نہ تو دعا میں اثر رہا ہے نہ سفارش
میں - اب ایک مرتبہ آپ سے بھی ذرا سی سفارش
کرتا ہوں - اردو بورڈ میں دو جگہیں
خالی ہوئی ہیں - ایک جگہ پر تو ان کا
تعین کرا دیجیے -
میں خود آپ کے پاس یہ سفارش لے کر حاضر
ہوتا لیکن میں چند روز کے لیے لاہور
جا رہا ہوں - والسلام خیر ختام

مخلص

محمد امیر احمد

راجا صاحب محمود آباد

انجمن ترقی اردو (ہند)

Anjuman-e-Taraqqi-e-Urdu (India)

۱- دریا گنج، دہلی
مورخہ ۲۵ر نومبر ۴۱ء

نشان (۸۴۹۶)

مکرم بندہ — تسلیم

میں سفر سے ابھی ابھی لوٹ کر آیا ہوں۔ آپ کا خط پہنچا۔
ممکن ہے کہ آپ کا خیال صحیح ہو کہ اردو کی ابتدا سندھ سے ہوئی
مجھے سندھ کا قدیم شعرا کا ایک کلام دستیاب نہیں ہوا جس سے میں
یہ نتیجہ اخذ کروں۔ اگر آپ اس کے ثبوت میں قلمی نسخے دیں تو
کا ممنون ہوں گا۔

مخلص
عبدالحق

بابائے اردو مولوی عبدالحق

TELEGRAMS NIGAR

EDITOR NIAZ FATEHPURI.

THE NIGAR

(AN ORGAN OF RATIONALISTS AND FREE THINKERS)

(Established 1922)

NIGAR BUILDING
LUCKNOW.

۳ دسمبر ۵۷ء

Ref. No. ....

مکرمی۔ تذکرۂ مقالات الشعراء پہنچا۔ شکریہ

سندھی ادبی بورڈ جو گرانقدر خدمت علم و ادب کی انجام دے رہا ہے

وہ دیکھنے ہی کی ہے

مقالات الشعراء کی تدوین و ترتیب میں جناب نے

جس عالمانہ سعی و کاوش سے کام لیا ہے یقیناً تحسین و آفرین کی

مستحق ہے اور سندھی ادبی بورڈ کی طرف سے ایسے گرانقدر

مخطوطات کی اشاعت دراصل قیام پاکستان کے دورِ زمانہ کی

خوشگوار یادگار ہے جو ہمارے لیے باعث فخر ہیں۔

والسلام

مخلص نیاز فتحپوری

علامہ نیاز فتحپوری

خلاصۂ کلام، تحقیقی نتائج

اور

اشاریہ: قلمی مخطوطات مملوکہ پگارا خاندان

باب اوّل میں دو موضوعات سے بحث کی گئی ہے۔ اِس میں پہلا موضوع ''سرزمین سندھ کا مختصر تعارف'' ہے۔ پگارا خاندان کا تعلق اسی سرزمین سے ہے۔ اس لیے اِس کا تعارف ضروری تھا۔ یہاں میں نے سارا انصاری کی اس رائے سے اختلاف کیا ہے جس میں انھوں نے کہا ہے ''برصغیر میں تاریخی اعتبار سے سندھ کی حیثیت کافی غیر اہم رہی ہے''۔ (مطبوعہ: سندھی پیر اور برطانوی راج، ص: ۲۵) میں نے اِس خیال کی تردید میں زمانی ترتیب سے مخدوم نوح بکھری (ساتویں صدی ہجری) لعل شہباز قلندر (م، ۶۲۳ھ) شیخ پتھورو (م، ۶۶۶ھ) شیخ خضر سیوستانی (م، ۹۹۶ھ) اسمٰعیل سومرو (م، ۹۹۸ھ) مخدوم نوح ہالائی (م، ۹۹۸ھ) عبداللہ حسینی (م، ۱۰۹۳ھ) عبدالکریمؒ (م، ۱۱۳۰ھ) وغیرہ کا ذکر کیا ہے، جس سے اِس سرزمین کی دینی و علمی فضیلت واضح ہوتی ہے۔ اِس کے علاوہ (۹) ایسے صوفیا کرام اور بزرگانِ دین کا بھی تذکرہ کیا ہے جنھوں نے اِس سرزمین پر دینی خدمات اور علمی تبلیغ فرمائی۔

اِس باب کے دوسرے حصے میں ''مسلمانوں کی سندھ میں آمد کا ابتدائی دور'' ہے۔ ''سندھ میں نقش بندی اولیاء'' میں مسلمانوں کی آمد کا قدیم ترین ثبوت ۲۷ھ بتایا گیا ہے۔ جب بھنبھور میں کھدائی کرنے سے ایک جامع مسجد دریافت ہوئی، اس کے ایک کتبے میں یہی سنہ درج ہے۔ تقریباً اسی زمانے میں ابوترابؒ یہاں تشریف لائے، کہا جاتا ہے کہ انھوں نے بکھر کا قلعہ فتح کیا تھا۔ ٹھٹھہ سے قریب دس میل مغرب کی طرف تعلقہ میر پور ساکرو میں ''گجو'' کے مقام پر آپ کا مزار ہے۔ اِس پر ۸۸۷ھ درج ہے۔ پھر بہت سے بزرگ تشریف لائے۔ مذکورہ سنین سے لے کر ترتیب وار، عہد بہ عہد معروف بزرگوں کے حالات مختصراً تحقیقی انداز میں بیان کیے ہیں۔ جن میں پگارا خاندان کے اوّلین بزرگ سید علی مکیؒ کی سندھ میں آمد سے بھی بحث کی ہے۔

باب دوّم میں ''پیر جو گوٹھ'' کا مختصر تعارف ہے۔ کس دور میں یہ خطہ کس نام سے پکارا گیا؟ اِس ضمنی عنوان میں یہ بحث حقق ہے۔ اسی باب میں ''پگارا'' کی وجہِ تسمیہ بھی بیان کی گئی ہے۔ اِس باب کے چوتھے حصے میں ''حروں کی خدمات اور اُن کا پس منظر'' درج کیا گیا ہے۔ لفظ حرؔ سے متعلق محققین و مصنفین کے نظریات میں اختلاف ہے جسے تحقیقی انداز میں ایک نتیجے تک پہنچایا

ہے۔ اسی باب میں پگارا خاندان کا ایک شجرہ بھی مرتب کیا گیا ہے۔ سندھ میں یہ سلسلہ شاہ علی مکی لکیاریؒ سے شروع ہوتا ہے۔ جو حضرت کرم اللہ وجہہ کی تیرھویں پیڑھی میں سے اور شاہ عباسؒ کی اولاد میں سے تھے۔ شاہ علی مکی کے بعد سولھویں پیڑھی میں سید محمد بقا شہید تھے۔ ان کے بیٹے سید راشد روضے دھنی تھے۔ یہ پگارا خاندان کے سر کا تاج کہے جانے کے قابل ہیں انھیں سے سلسلۂ پگارا، سلسلۂ راشدیہ اور سلسلۂ جھنڈے والا چلتا ہے۔ پہلے پگارا راشد روضے دھنی کے بیٹے پیر صبغت اللہ شاہ کہلائے۔ جھنڈے والے کا سلسلہ پیر راشد روضے دھنی کے دوسرے بیٹے، پیر یٰسین شاہ سے چلا۔ وہ اپنے والد کی وفات کے بعد سجادہ نشین کے مسئلے پر اختلاف کرتے ہوئے اپنے بھائی سے الگ ہو گئے تھے۔ اور اپنے والد کی نشانی کے طور پر اُن کا ''جھنڈا'' اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ اِن دونوں سلسلوں سے متعلق دوسرے افراد نے خود کو ''راشدیہ'' کہا۔ موجودہ پگارا کے والد کا نام بھی پیر صبغت اللہ شاہ ثانی تھا۔ جنھیں حیدر آباد میں پھانسی دی گئی تھی۔ اِن کی ایک بیاض کا ذکر کرتے ہوئے تبسم چودھری نے واضح کیا ہے کہ سب سے پہلے خود کو ''راشدیہ'' آپ ہی نے لکھا تھا۔

باب سوم تصوف سے متعلق ہے کیوں کہ اِن بزرگوں کا تعلق علمِ تصوف سے تھا۔ پہلے یہ لوگ سلسلۂ نقش بندیہ سے وابستہ تھے بعد میں سلسلۂ قادریہ سے متعلق ہوئے۔ چناں چہ اِن دونوں سلسلوں کا مختصر تعارف، اِن کی تعلیمات اور اِن سے متعلق بزرگوں کا ایک جامع شجرہ بھی مقالے میں مرتب کیا گیا ہے۔

باب چہارم میں مقالے کے صفحہ ۶۰، تک یہ بحث تمام ہوتی ہے۔ یہاں سے پگارا بزرگوں کے حالاتِ زندگی اور اُن کے افکار بیان ہوتے ہیں۔ حضرت محمد بقا شہیدؒ (م، ۱۱۹۸ھ) سے یہ سلسلہ قائم ہوتا ہے اور موجودہ پگارا تک جاتا ہے۔ ہر بزرگ کے تذکرے کے ساتھ اِن کی دینی خدمات کی ضمنی سرخی الگ رکھی گئی ہے۔ اور اِن کی دینی خدمات کو واضح کرتے ہوئے اِس دور اور اُس خطے کی عوام پر اُس کے اثرات واضح کیے گئے ہیں جو مقالے کا بنیادی حوالہ ہے۔

تحقیقی نتائج:

پگارا خاندان کے بزرگ ''سید علی مکی لکیاریؒ'' تھے۔ اِن سے متعلق ''تحفۃ الکرام'' میں ہے کہ ''سب سے پہلے سید جو یہاں لکیاری آئے وہ سید علی بن سید عباس بن شاہ زید (امام موسیٰ کاظم تک) تھے۔ کہتے ہیں کہ سید مذکور کی آمد سے کچھ عرصے پہلے دلورائے کے ظلم کی وجہ سے اروڑ اور بہمن آباد (بھانبھرا) کے شہر ویران اور پامال ہو چکے تھے۔' اِس تصنیف میں کہا گیا ہے کہ دلورائے کے دور میں وہ یہاں اِس کی سرکوبی کے لیے آئے تھے۔

مرزا قلیچ بیگ نے ''قدیم سندھ'' میں سید علی مکی کی آمد محمد بن قاسم کے ہم راہ بتائی ہے جو ایک ۷۱۱ء میں آئے تھے۔

جی ایم سید کی تصنیف ''جب گذاریم جن سیں'' میں ہے ''لکیاری سادات کا سلسلۂ نسب سید علی مکی کے سندھ میں آنے

کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ جو کے سے ۵۲۰ھ یعنی ۱۱۲۷ء میں سندھ میں آئے تھے، اور لکی میں سکونت اختیار کی تھی۔

پیر سکندر شاہ مردان شاہ نے روزنامہ ''جسارت'' کراچی ۱۴، اکتوبر ۱۹۷۲ء کے انٹرویو میں کہا ''اس خاندان کے مورثِ اعلیٰ سید علی مکی تھے جو عباسی دورِ حکومت میں سندھ میں آئے تھے۔ ان کی بیسویں پشت میں سید محمد بقا نام کے ایک بزرگ پیدا ہوئے۔''

یہی بات ڈاکٹر اعجاز الحق قدوسی نے اپنی تصنیف میں بیان کی ہے۔ میں نے تجزیاتی طور پر ان بیانات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ آخری روایت قریب از قیاس اس لیے معلوم ہوتی ہے کہ یہ روایت اس خاندان کے ایک اہم فرد کی ہے۔ نیز اس سلسلے کے آپ اب تک کے آخری پیر بھی ہیں۔ انھوں نے اپنے بزرگوں کا ایک شجرہ بھی مرتب کرایا جس کے آغاز میں یہ روایت بھی ہے۔ شجرہ کا محفوظ ہونا بتاتا ہے کہ اس سے متعلق کوائف بھی یقیناً ان کے پاس محفوظ ہوں گے۔ ان دلائل کی روشنی میں آخری روایت کے مصدقہ ہونے کا تحقیقی نتیجہ نکالا گیا ہے۔

متعدد مقامات پر ایسے تحقیقی نتائج مقالے میں دیکھے جاسکتے ہیں۔ پیر گوہر علی شاہ محمد دھنی کے باب میں صفحہ ۲۱۴، پر میں نے واضح کیا ہے اور اعتراف کیا ہے کہ اس خاندان کے دیگر بزرگوں کے مقابلے میں ان کی دینی خدمات قابلِ ذکر نہیں ہیں۔ ان پر مکمل تحقیق کے بعد یہ چند نکات نتیجتاً نکالے گئے ہیں جس کی روشنی میں دینی خدمات نہ ہونے کی وجہ کسی قدر ضرور واضح ہوتی ہے۔ مثلاً:

۱۔ سید علی گوہر کو سجادگی کا بہت کم وقت ملا، یعنی صرف ۶، سال کیوں کہ ۱۳۰۸ھ مطابق ۱۸۹۰ء کو آپ کے والد پیر حزب اللہ کا وصال ہوا اور اس کے بعد پیر سید علی گوہر سجادہ نشیں ہوئے، لیکن ۱۳۱۴ھ مطابق ۱۸۹۶ء کو ان کا بھی وصال ہوا۔ اس طرح صرف ۶، سال سجادگی کے ملے۔

۲۔ آپ بچپن ہی سے علیل رہا کرتے تھے۔ اور ان ۶، سالوں میں بھی آپ مکمل صحت مند نہیں تھے۔ اس لیے آپ کے ہاتھوں کوئی بڑا دینی کام نہیں ہوا۔

۳۔ انگریزوں کی سازشوں کے تحت ان کے مرید بڑی تعداد میں شہید ہوگئے تھے۔ باقی لوگوں کی حفاظت کے لیے فکرمند رہے ہوں گے، جس کی وجہ سے کوئی بڑا دینی کام کرنے کا وقت نہیں ملا ہوگا۔

۴۔ لاولد ہونا بھی ایک صدمہ ہوتا ہے۔ جس سے یہ دوچار تھے۔ اس کی وجہ سے سجادگی میں زیادہ سنجیدگی یا دلچسپی نہیں رکھتے ہوں گے، اور یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بھائی کو سجادگی کے حکم نامے پر دستخط کر کے دیدیے تھے۔ لہٰذا لاولد ہونے کی وجہ سے ان میں یقیناً گوشہ نشینی کی کیفیت پیدا ہوئی ہوگی جو ایک فطری عمل ہے۔

ایسے تحقیقی وتنقیدی نکات مقالے میں شامل ہر باب میں رقم کرنے کی کوشش کی گئی ہے جو اب سے پہلے پردۂ خفاء میں تھے۔ یہاں صرف تعارف کے طور پر مختصراً اور اجمالاً عرض کیا جارہا ہے۔

مختلف بزرگوں کی قابلِ قدر دینی خدمات کو مختلف کتب اور شخصی روایات کے تحت قلم بند کرتے ہوئے یک جا کیا گیا ہے۔ یہ دینی خدمات اگر چہ منتشر تھیں مگر تحقیق سے مرتب کیا گیا ہے اور نکات کی صورت میں ان دینی خدمات کے اثرات اُس دور کے عوام پر دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

حضرت محمد راشد روضہ دھنی سے متعلق میں نے ایک روایت شاملِ مقالہ نہیں کی جو اِس طرح ہے کہ جب آپ پیدا ہوئے اور پہلا رمضان آیا تو آپ نے اپنی والدہ کا دودھ چھوڑ دیا "یوں آپ کو روضہ دھنی کہا گیا"۔ یہ روایت اس لیے شاملِ مقالہ نہیں کی کہ یہ روایت کے اصولوں کے خلاف ہے۔ پہلی بات تو معصوم بچے کا دودھ چھوڑنے کا عمل غیر فطری ہے اور دوسری دلیل یہ ہے کہ وہ روزہ "ز" سے لکھا جاتا ہے یعنی "روزہ" جب کہ انھیں "روضہ" کہا جاتا ہے۔ یہاں گمان غالب ہے کہ آپ کا جسدِ خاکی نئی درگاہ تعمیر ہونے کے بعد منتقل کیا گیا تھا۔ اور شان دار روضہ تعمیر کیا گیا تھا اس کی رعایت سے آپ کو "روضہ دھنی" کہا گیا ہوگا۔

یہ بات یہاں محض اس لیے بیان کی گئی ہے کہ میں نے مقالے میں ایسی بہت سی روایات سے صرفِ نظر کیا ہے جو تحقیق میں فنِ روایت کے اصولوں کے مطابق نہیں تھیں۔ لہٰذا میں نے تحقیق میں فنِ درایت اور فنِ روایت دونوں کو نظر میں رکھتے ہوئے مقالے کی تکمیل کی ہے۔ یہ بھی عرض کر دینا بے محل نہ ہوگا کہ پیر راشد روضہ دھنی کے قدیم تاریخوں کو سامنے رکھ کر راشد صاحبؒ کے دور کا تعین کر کے ان کے حالات کو پیش کیا ہے اور اس کی روشنی میں ان کے ملفوظات کا وہ انتخاب پیش کیا ہے جو اس عہد کے عوام کی سماجی اور اخلاقی تبدیلی کے لیے ناگزیر تھے۔ اس تبدیلی نے اِس خطے میں بڑا دینی رجحان پیدا کیا۔ اس نوعیت کی تحریر و تحقیق پیش کر کے اس سے قبل یک جا نہیں تھیں اس لیے میں نے حتی الامکاں درست مآخذ تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پیر صبغت اللہ شاہ ثانی کی تمام دینی خدمات کا احاطہ تفصیلاً کیا گیا ہے انھیں حیدر آباد جیل میں ۱۹۴۳ء میں پھانسی دی گئی تھی، ان سے متعلق ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی ایک غیر مطبوعہ تحریر بہ حسنِ توسط مسرور احمد زئی مجھے حاصل ہوئی۔ یہ مختصر تحریر ابھی تک کہیں شایع نہیں ہوئی جس کے مطابق ان کا کہنا ہے "اگر انھیں نامعلوم مقام پر دفن کیا جاتا تو ممکن تھا کہ اب تک کچھ نہ کچھ علم ہو جاتا۔ میرا خیال ہے کہ ان کی لاش سمندر میں بہادی گئی تھی"۔

مقالے کے صفحہ ۲۴۴، پر تفصیل سے پیر صبغت اللہ شاہ کی ایک بیاض کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اس بیاض کی بابت نسیم چودھری نے اپنی تصنیف میں ذکر کیا ہے میں نے اس بیاض کے چند غیر مطبوعہ صفحات کی نقول پیر جو گوٹھ کے کتب خانے میں دیکھے تھے۔ مذکورہ تصنیف سے اقتباسات اور متذکرہ بیاض سے ایک خیال کی اور تردید ہوتی ہے اکثر کتابوں اور تذکروں میں

درج ہے کہ ''راشدی'' نسبت کا اظہار یا استعمال اپنے نام کے ساتھ سب سے پہلے پیر علی محمد شاہ راشدی نے کیا۔ مگر یہ بات تحقیقی نقطہ نظر سے درست معلوم نہیں ہوتی۔ یہ نسبت بھی سب سے پہلے حضرت پیر سید صبغت اللہ شاہ ثانی نے اپنے نام کے ساتھ استعمال کی تھی، یہ بات ان کی بیاض ہی سے ظاہر ہوتی ہے، جس میں ایک نوٹ درج ہے، بیاض کے آخری صفحے ۱۲۲، کی بائیں جانب دیوانِ حافظ سے انتخاب ہے یہ انتخاب چند اشعار پر مشتمل ہے ساتھ ہی چند اردو اشعار بھی وہاں اس طرح فرمایا ہے ''سید پیر محمد صبغت اللہ شاہ ہاشمی جلالی، راشدی''۔ بیاض کا ایک مطالعہ مقالے کے صفحہ ۲۴۲، پر بھی ہے۔

اس طرح بہت سے تحقیقی نتائج مقالے میں جابجا دیکھے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے بعض پہلی مرتبہ ضبطِ تحریر میں لائے گئے ہیں۔ مزید یہ دینی خدمات میں بھی شخصیت کے رجحان کا مطالعہ پیش کرتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا گیا ہے جو دینی خدمات کی تصدیق اور ترتیب میں غلطی احتمال کم سے کم رہے۔

اشاریہ: قلمی مخطوطات مملوکہ پگارا خاندان

جامعہ راشدیہ پیر جو گوٹھ مقام درگاہ شریف خیر پور میرس کے کتب خانے میں نایاب و نادر مطبوعات کی کثیر تعداد ہے اسی طرح غیر معمولی اہمیت کے حامل تاریخی مخطوطات کی تعداد بھی کم نہیں۔ اس میں ایسے ایسے جید علماء کرام اور فضلاء کرام کی تصانیف اور رسائل ہیں جنھیں دیکھ کر آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ یہاں تمام مخطوطات کا اشارہ پیش کرنا طوالت کا باعث ہوگا۔ لہٰذا ہم یہاں صرف ان مخطوطات کا ایک اشاریہ پیش کرتے ہیں جو یا تو پیر پگارا بزرگوں کے اپنے مخطوطات ہیں۔ یا وہ جو اِن بزرگوں نے نقل کروائے، اُن کے آخر میں ترقیمے کے بعد اپنی مہر لگائی اور اپنے کتب خانے میں محفوظ کرائے ان مخطوطات کے موضوعات دیکھ کر ان بزرگوں کی علم پروری، ادب نوازی اور دینی رجحان کو دیکھنا بہت آسان ہو جائے گا کہ انھوں نے کس طرح یہ خطی و علمی نسخے تیار کروائے اور اپنی مہر کے ساتھ کتب خانے میں استفادۂ عوام اور تشنگانِ علم کی سیرابی کی خاطر رکھوائے:

(۱) مخطوطہ: تفہیم الصلیٰ — مصنف: ندارد
زبان: عربی — صفحات: ۲۳۹
سنہ کتابت: ۱۲۳۰ھ — کاتب: غلام محمد
تقطیع: ۹-۱/۲×۵-۱/۲ (۶×۳) — سطور فی صفحہ: ۱۳
خط: نسخ — مہر: سید علی گوہر شاہ ۱۲۵۵ھ (سید گوہر علی شاہ کا وصال ۱۲۶۳ھ)

(۲) مخطوطہ: عینی شرح بخاری — مصنف: ندارد
زبان: عربی (موضوع: حدیث) — صفحات: ۳۱۸

تقطیع: ۶×۱۴(۶×۱/۱۰-۶) سطر فی صفحہ: ۱۹
خط: نسخ مہر: سید صبغت اللہ شاہ ۱۲۰۰ھ

(۳) مخطوطہ: الاشباۃ والنظائر (جلد اوّل) مصنف: ندارد
زبان: عربی صفحات: ۵۰۸
کاتب: عبداللہ بن اسحاق قریشی سالِ اشاعت: ۱۳۰۹ھ
تقطیع: ۸×۵-۱/۲(۹×۳-۱/۲) سطر فی صفحہ: ۱۸
خط: نسخ مہر: سید صبغت اللہ شاہ ۱۲۱۰ھ

(۴) مخطوطہ: الاشباۃ والنظائر (جلد اوّل) مصنف: علامہ العینی
زبان: عربی (موضوع ادب) صفحات: ۸۱۶
تقطیع: ۸-۱/۲×۵-۱/۲ سطر فی صفحہ: ۲۷
خط: نسخ مہر: جامعہ راشدیہ، درگاہ پیر پاگارو صاحب پیر گوٹھ، ضلع خیر پور میرس، سندھ

(۵) مخطوطہ: جزو سادس مصنف: علامہ العینی
زبان: عربی صفحات: ۸۰۴
تقطیع: ۱۱×۸(۹×۵) سطر فی صفحہ: ۲۹
مہر: پیر سید راشد شاہ ۱۱۰۲ھ

(۶) مخطوطہ: مختصر الغد وریؒ (قلمی) مصنف: ندارد
زبان: عربی کل صفحات: ۲۳۲
سالِ اشاعت: ۱۲۸۸ھ تقطیع: ۹-۱/۲×۶-۱/۲(۸×۸)
سطر فی صفحہ: ۵۱ خط: نسخ
مہر: علی گوہر شاہ بن صبغت اللہ شاہ بن سید راشد شاہ ۱۲۲۴ھ

(۷) مخطوطہ: دیوان فارسی مصنف: مولانا فضلی بغدادی ترک
زبان: ترکی و فارسی کل صفحات: ۳۰۰
سالِ اشاعت: ۱۱۱۹ھ کاتب: اسمٰعیل ہمدانی

تقطیع: ۹-۱/۲×۵-۱/۲ (۷×۳-۱/۲) سطور فی صفحہ: ۱۵

خط: نسخ و نستعلیق مہر: سید حزب اللہ شاہؒ ۱۲۵۸ھ

(۸) مخطوطہ: دیوانِ مسکین مصنف: سید حزب اللہ شاہؒ

زبان: فارسی کتابت: ۱۲۷۳ھ

کاتب: مولوی عبدالرحیم سکندری تقطیع: ۸×۶-۱/۲

سطر فی صفحہ: ۱۸ خط: نستعلیق

(۹) مخطوطہ: دیوانِ اصغر مصنف: سید علی گوہر اصغر

زبان: فارسی تقطیع: ۸×۶-۱/۲

(۱۰) مخطوطہ: خزانۃ المعرفت ملفوظات: پیر صبغت اللہ شاہ اوّل

زبان: سندھی کاتب: مولانا قربان علی سکندری

(۱۱) مخطوطہ: مکتوبات شریف مکتوبات: پیر علی گوہر شاہ اوّل

زبان: فارسی کاتب: ندارد

(۱۲) مخطوطہ: خزانہ رموز الحقائق مصنف: خلیفہ محمود نظامی

زبان: فارسی کاتب: مولانا علی سکندری (فوٹو اسٹیٹ)

کتابیات

(۱)	ابواب متفرقہ	ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں	المصطفیٰ اکیڈمی حیدرآباد	۱۹۹۷ء
(۲)	اصغر سائیں جوکلام	تحقیق شیخ محمد فاضل	جمیعت علمائے سکندریہ	۱۹۹۹ء
(۳)	اسلامی کتب خانے	پیر حسام الدین راشدی	سندھ مسلم ادبی سوسائٹی	۱۹۳۹ء
(۴)	باتیں پگارا کی	الیاس شاکر، مختار عاقل	شبل پبلی کیشنز کراچی	۱۹۹۲ء
(۵)	پاکستان کی مشہور شخصیات	نورالصباح بیگم	شیخ غلام علی اینڈ سنز	ندارد
(۶)	پیر پگارا کی کہانی } کچھ ان کی اور کچھ میری زبانی	اظہر سہیل	فیروز سنز لاہور	۱۹۸۷ء
(۷)	پیکرِ حریت	خداداد خان برکی	-	۱۹۸۸ء
(۸)	تاریخ سندھ	اعجاز الحق قدوسی	اردو سائنس بورڈ لاہور	۱۹۸۴ء
(۹)	تحفۃ الکرام		سندھی ادبی بورڈ	ندارد

(۱۰) تذکرہ مشاهیر سنڌ(پاگو پهريون) مولانا دين محمد وفائي،سنڌي ادبي بورڊ حيدرآباد ١٩٨٥ء

(۱۱) تذکرہ مشاهير سنڌ(پاگو ٻيون) مولانا دين محمد وفائي،سنڌي ادبي بورڊ حيدرآباد ١٩٩٥ء

(۱۲) تذکرہ مشاهير سنڌ(جلد ٽيون) مولانا دين محمد وفائي،سنڌي ادبي بورڊ حيدرآباد ١٩٨٦ء

(۱۳)	تذکرہ پیرانِ پگارا	تبسم چودھری	انڈس پرنٹرس	۱۹۷۵ء
(۱۴)	تذکرہ صوفیائے سندھ	ڈاکٹر اعجاز الحق قدوسی	اردو اکیڈمی کراچی	۱۹۵۹ء
(۱۵)	خاندانِ نقشبندیہ کی علمی خدمات	ڈاکٹر آفتاب احمد خان	حیدرآباد	۱۹۸۸ء
(۱۶)	خزانۃ المعرفت (ملفوظات)	مرتب فقیر محمد رحیم	-	۱۳۱۱ھ
(۱۷)	خطبات	مولانا عبیداللہ سندھی	عبیدالاھی کتب خانہ نیوسعید آباد	۱۹۹۷ء

(۱۸) دیوانِ مسکین — پیر حزب اللہ شاہ راشدی — جمعیت علمائے سکندریہ — ۱۹۸۵ء

(۱۹) راشدی خاندان جو شجرو — سید فیض الدین راشدی — مقرب پرنٹنگ پریس — ندارد

(۲۰) سنڌ جا بر بحر ۽ پهاڙ — غلام رباني آگرو — — — ۲۰۰۰ء

(۲۱) سندھ کے نقش بندی اولیاء — ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں — غلام مصطفیٰ اکیڈمی — ۲۰۰۲ء

(۲۲) سندھی پیر اور برطانوی راج — سارا انصاری — فکشن ہاؤس لاہور — ۱۹۹۶ء

(۲۳) سندھ کے صوفیائے نقش بند — ڈاکٹر ابوالخیر محمد زبیر — رکن اسلام پبلی کیشنز حیدرآباد — ۱۹۹۷ء

(۲۴) قدیم سندھ — مرزا قلیج بیگ — سندھی ادبی بورڈ — ندارد

(۲۵) کلیاتِ ادیب — ادیب — حیدرآباد — ۱۹۷۳ء

(۲۶) کشف المحجوب (اردو ترجمہ) — حضرت داتا گنج بخش — لاہور ایڈیشن — ۱۹۹۴ء

(۲۷) لبِ تاریخ (۱۳۱۸ھ) — مقدمہ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ — سندھی ادبی بورڈ — ۱۹۸۹ء

(۲۸) مخزنِ فیضان (اردو ترجمہ) — پیر سائیں روضے دھنی — جمعیت علمائے سکندریہ — ۱۹۸۷ء

(۲۹) ملفوظات شریف — ایضاً — ایضاً — ۱۹۹۱ء

(۳۰) ملفوظات پیر سائیں بیعت دھنی ، پیر رشید الدین شاہ جھنڈے والے — نیو سعید آباد — ندارد

(۳۱) مقالاتِ راشدیہ — پیر حسام الدین راشدی — انسٹیٹیوٹ آف سینٹرل اینڈ ویسٹ ایشن اسٹڈیز کراچی — ۲۰۰۲ء

(۳۲) مقدمہ شعر و شاعری — الطاف حسین حالی — ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ — ایڈیشن ۱۹۹۵ء

(۳۳) مفاتح رشد اللہ کی تفسیر کلام اللہ — مولانا فتح محمد نظامانی — زیب ادبی مرکز حیدرآباد — ۱۹۹۱ء

(۳۴) مہران کی لہریں — پیر حسام الدین راشدی — پاکستان پبلی کیشنز — ۱۹۵۲ء

(۳۵) نفائسِ تاریخی — ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں — رائل بک ڈپو — ۲۰۰۲ء

(36) The Terrorist, H.T. Lambrick Landon Ernest Benn Limited 1972

اخبارات ورسائل

(۱) روزنامہ جنگ کراچی ۱۵،اپریل ۱۹۸۷ء

(۲) روزنامہ جنگ کراچی ۱۴،اپریل ۱۹۹۳ء

(۳) روزنامہ جنگ کراچی ۲۵،مئی ۱۹۹۰ء

(۴) مهراڻ قائد اعظم نمبر جلد ۲۵ ١٩٧٦ء

(۵) مهراڻ سوانح نمبر مقالو ڈاڪٽر نبي بخش بلوچ ١٩٥٧ء

(٦) مهراڻ پير حسام الدين راشدي نمبر ١٩٨٣ء

(۷) رسالہ صحیفہ،لاہور جنوری ۱۹۷۳ء

(۸) روزنامہ جسارت،کراچی مورخہ ۱۴،اکتوبر ۱۹۷۲ء

CRITICAL STUDY OF THE RELIGIOUS SERVICES OF PIR PAGARAH DYNASTY

ABSTRACT OF THESIS FOR Ph. D

Under the guidance of
Professor DR. GHULAM MUSTAFA KHAN
M.A (LLB) Ph.D D.Litt

Ex-Head of Department of Urdu
University of Sindh Jamshoro

By:
KHADIJA MEMON

2003

Department of Comparative religion & Islamic culture,
University of Sindh,
Jamshoro.

بسم الله الرحمٰن الرحيم

In The Name Of Allah The Kind And The Merciful
STRATEGY OF THIS RESEARCH

Sufis (Saints) played remarkable role in the propagation and preaching of Islam. Islam spread in various parts of the subcontinent through their efforts. PIR PAGARAH dynasty and specially all the ancestors of this family rendered valuable religious services in this part of Sindh. Among all such services the most important and enthusiastic approach was "JEHAD". Their enthusiasm left deep impact on the religious and political history of Sindh. The autobiographies of such Sufis and philosophers are needed in all times. Hence Dr.Ghulam Mustafa Khan directed me to undertake research on the contribution of all such noble personalities and pursue a thesis because the ancestors of Pagarah dynasty created intense love for Islam in the heart of Sindhi people even in hard times. The research was undertaken with the data material available on the advice of Dr.Ghulam Mustafa Khan so it was revealed during the study process that we have almost forgotten the religious services of all the elders of the Pagarah, which were no doubt unforgettable. They established religious schools (Madrasas) & got mosques constructed, gave sermons, preached, corrected their followers, defined the status of Sufis, did poetry, got Quran translated and contributed in Sindhi, Urdu and Persian literature. It was therefore necessary to study the achievements, of these noble Sufis, which were carried over centuries. As their achievement are greatly inter linked with their personalities so there auto biography was also necessary in this regard. This study is based on Islamic methodology of research on the pattern of Asma-ul-rijal (chronology) of the Pagarah

In the light of this thesis we can clearly observe, the enlightened life of Muslim. Scholars (ulmas) and their contribution. It is how the spreading and transformation of knowledge happens and this is also the best way to record the religious services of the noble and Sufis. By this planning and passion I undertook this thesis with my soul and heart so that their contribution be recorded with due research and references. The only reason to undertake this thesis is to record and store the past historic events and services and achievement of pioneers and historians in analytical way so that on one hand we can store and preserve their services and achievement and on the other hand we can educate ourself by their study.

We can find information about these elders and noble in Sindhi language as well and I am also concerned to this language. I would have written this thesis in Sindhi, but the far most reason of writing it in Urdu was

that my supervisor is Dr.Ghulam Mustafa Khan whose mother tongue being Urdu, therefore to be benefited from his scholarly guidance this work has been presented in Urdu. It is to be noted Sindhi people somehow are aware of the religious and social services of this family so it was thought that research should be compiled in Urdu so that the people of both languages could equally be benefited. The services of the noble personalities have been presented in this thesis chapter wise as under:

SUMMARY OF CHAPTERS

(CHAPTER ONE)

Two topics are brought under discussion in the first chapter. The first topic is "The short introduction of the land of Sindh" Pagarah family belongs to interior Sindh so in order to describe and discuss the conditions and achievements of the elders and nobles of this family, it is necessary to be aware of the social, religious and political situation along with the introduction of Geo-climatic conditions of the land. Where these noble and elders rendered their religious, scholaristic services. Our research would be baseless or incomplete until and unless we would have been well acquainted with the knowledge of the land where they lived. Sociologists believe that the geo-climatic conditions customs, traditions of a particular region directly and deeply influence the people's languages, accents, dialects, character and caliber of the people inhabited over there. Hence, along with the introduction I have mentioned about the parts which Pagarah family have developed and the traits of environment in which they promoted the values of religion.

In this chapter we pointed out our disagreement with the statement given by "Sarah Ansari" in her book "Sindhi Pir Aur bartanwi Raj"(Sindhi Saint And British Empire) on page 25 that " in the sub continent, historically Sindh occupied less importance". In condemnation of this view I have valued its importance from historic and social and religious point of view. In this context I have consulted many historical books including book written by Dr.Ghulam Mustafa Khan " Sindh Main Nakhshbandi Aulia " in which religious importance of this land has thoroughly been discussed and its last paragraph also includes the name of Syed Ali Makki (4^{th} century hijra) who was the first elder of Pir Pagarah family and had migrated from Saudi Arabia and settled in Sindh. In addition to him the other nobles and elders who belonged to Sindh were: Makhdoom Nooh Bhukhari (7^{th} century hijra), Lal Shahbaz Qalander (623 Hijra), Shaikh Pathoro (666 Hijra), Shaikh Murad (593 Hijra), Shaikh Essa (931 Hijra) Shaikh Khizar Sioastani (994 H), Ismail Soomro (998 H) Makhdoom Nooh Halai (998 H), Abdullah Hussaini (1093 H) Abdul Karim (1130 H) Inayatullah Jhookwala (1130 H), Abdul Karim Khora (1145 H), Shah Abdul Latif Bhittai (1165 H), etc were the most renowned elders of this land . Their contribution provided Sindh with immense religious blessings. A part of all these dignitaries are herein mentioned. I have referred to nine such Sufis and elders who have not only

rendered religious services but have also rendered humanitarian services. The book written by Pir Hassam ud-Din Rashidi " Takmeela Mukalaat-ul-Shora " is of great importance. This study provides answers to quarries of critics.

The second main topic brought under discussion in this chapter is the beginning period of the arrival of Muslims in the sub-continent. This is important because by this the background of the Pir Pagarah family and their services becomes prominent, moreover by knowing the beginning period of arrival of Muslims to the sub-continent we also become well aware of the religious trend and its intensity as well. For the completion of this discussion we need to refer to work like " Kadeem Sindh "(Ancient Sindh), " LAB-E-TAREEKH-E-SINDH " (the tongue of the history of the Sindh), and "SINDHI PIR "(Sindhi Saint). Furthermore Syed Salman Nadvi shows the spreading of Islam by the conquest of MUHAMMAD BIN QASIM. Then in the book " Nakhshbandi Aulia" we get the evidence of Muslims presence in the 727 AD. Also when the remains of Bhambhoor were dug, a Jamia Mosque was discovered and one of its grave plate carries the same year engraved. Approximately in the same year " Abu Tarab " came here and it is said that he conquered the castle of "Bakhar". There is a tomb near Thatta about 10 miles towards west taluka Mir Pur Sakhro at the place of " gujoo" which contains the year 788 AD engraved on it. Many other elders and scholars also came here who worked in various categories of religious studies. This is how they made remarkable achievements in order to withdraw ignorance and depravity without the guidance of the world. A concise study of some prominent scholars and Sufis has been made in this thesis.

On the page of 797 of " TAKEEMA MAKALAAT UL-SHOORAH " The conditions and events of the ancestors of Pagarah family have been discussed. After this stage by stage the performance of the Muslims in different periods have been discussed subsequently and there is also event of tenth century discussed when " Hilaaj came here and that time Sindh was famous for its learning in various disciplines all over the Muslim world. It was time when the west learnt Mathematics, Astronomy, Astrology from Sindh. By the 12th century Hijra Sindh had became a center of Sufism and trend of initiating the quotations of noble scholars (Sufis) and implementation of their sermons as footsteps, became very common. At that time Sufism became necessary and took place of an institution. Shaikh Baha-ud-Din Zakria who belonged to the order of "Seharwardi" made the

beginning in order to demolish the dominancy of Ismailis and for this purpose he made Multan as the center which is situated in the north of Sindh. By the fourteenth centaury AD there was an increasing impact of Sufis (noble religious personals) and in this regard Makhdoom Nooh got the highest place in Sindh. Hala (A small town near Hyderabad, Sindh) became the headquarter for this purpose. By the fifteenth century, Saharwardi order strengthened there roots here as well. In this regard it would not wrong to say that Bakhar, Nasar Pur, Badin and Thatta are the important places for the Seharwardi order. In the same century many " Nakhshbandi Aulia " (religious spiritual leaders) also came here and gained popularity. Among these "Aulias" Pir Murad (Late) 1487 AD and his brother Syed Mian Ali Sherazi are very important. But this succession came to its peak in the 17^{th} century AD when his Holiness Shaikh Ahmed Sarhandi Mujadid Alaf sani's services paved the way for a revolution.

By 18^{th} centaury the religious zeal and devotion had become very profound and popular. Religious institutions (Madrasas), Domes of Pir and functions and gatherings. conducted by the followers of Pirs resulted into making this run order of the day.

The pioneer ancestors of Pagarah family are Syed Ali Makki who settled near Dadu and married. Among his successor Shah Saddaruddin became very famous among Nakhshbandi ancestors. His maternal grand son was Syed Muhammad Shujah Nakhshbandi. Among the successor Syed Muhammad Shujah Nakhshbanadi was Syed Muhammad Baqa Bin Muhammad Imam Bin Fateh Muhammad who was born in Rasool Pur Distt: KhairPur. He also belong to Nakhshbandi order. He also gained fame in chishtia and Qadri Order. Among his successor was Syed Muhammad Rashid Rooz-e-Dhani who founded the Rashdi and Pagarah dynasty. This debate is compiled on the 12 pages of the thesis and has been critically analyzed.

(CHAPTER TWO)

The first part of the second chapter contains the short introduction of "Pir Jo goth"(village of the Pir). As the Pir Pagarah dynasty belongs to this village so the introduction of this village has also been dealt herein.
This village is situated at 10 miles to the west of the khairpur. This area was established and developed in the time of Pir Ali Ghohar Shah (Bangla Dhani) the first (1847 AD). This area was called as Badshahpur in the beginning. Later it was named as Kangri afterwards it gained popularity as " Pir Jo Goth ". Some people also call it "Pir Goth". Tabassum Chaudhary quotes in her book at page 99 that Pir Hisbullah Shah was settled at this place due to this place was named as "Pir Goth".

Before this the Pagarah family was settled in Rahim Din Kalhora, Faizpur which is known as " Purani Dargah"(Old Shrine). As this pieces of land normally used to endanger flood. So Pir Ali Gohar Shah the first founded " Nai Dargah" (New Shrine) Khan Khudad Khan writes "Ali Gohar Shah" the first founded his "New Dargh"(new shrine) in1250 where his grand father Pir Rooza Dhani was burried from whom rashdi dynasty is popular. Before he was burried in Rahim Dino Kalhora.

Third part of this chapter is regarding the causes of popularity of Pir Pagarah's, Pir Sabghatullah Shah who was the first Pir of this dynasty. He founded the party by the name "Hur" against the Sikhs and Britishers. The specific slogan of Hur Mujahideen was "Bhej Pagarah". In every temptation and hurdle they used to shout "Bhej Pagarah"(which meant Oh! God help me in name of Pagarah turban) due to which this title became famous. Other nobles and elders were also famous with other titles along with Pagarah. For instance, Pir Rashidia was known as Rooza Dhani, Syed Gohar Ali Shah was known as Bangla Dhani, Pir Hisabullah Shah was known as Takhat Dhani (means man with throne), Syed Ali Gohar Shah the second was called Mahfa Dhani (means one with the carriage). Fifth Pagarah Syed Mardan Shah the first was known as "Kot Dhani" (means one with castle), sixth Pir Pagarah Syed Sabghatullah Shah the Second Shaheed was Known as "Pagh Dhani" (means one with noble of prestige). The followers of these saints were know as "Hur". Therefore in the fourth part of this chapter "the services and the background of Hurs". have been mentioned which was benefited by "Lab-e-Tareekh-e-Sindh" and "Tareekh-e-Sindh" By Dr. Aijaz-ul-Haq Qadoosi, books of Sarah Ansari and Khan Khudad Khan. In these books the word Hur has been debated and in the end I have agreed to the fact

that the Hur organization would have been formed after the name of Hazrat Hur (RAH) who was in the army of Hazrat Imam Hussain and was martyred while fighting to the army of Yazeed in the battle field of Karbala. Then I have also tried my level best to describe the religious and political role of the people belonging to this organization, because they were those followers who not only brought fame to the Pagarah dynasty but also spread their doctrine. Many of them were even martyred in this task. So it would be definitely unfairness with the topic without referring to this organization. This discussion on "Hur" comprises of six pages of the thesis which include the historic reference along with certain theories and views of some writers.

The fifth part of this chapter is the "family or generation tree" of Pagarah dynasty. The first elder who came to Sindh was Shah Ali Makki Lakiari. He was from the thirteen generation of Hazarat Ali (RAH) and among the successor of Shah Abbas Shah. After Shah Ali Makki was Syed Muhammad Baqa Shaheed (Sixteenth generation) whose son was Syed rashid Rooz-e-Dhani and grand son was Syed Subghatullah Shah the first who was called the first pir Pagarah. I have prepared the family tree of this dynasty along with the dates of births and deaths.

(CHAPTER THREE)

Herein this I have tried to relate the Pagarah dynasty and its attachment to **TASAWUF**. In the light of which the religious services of this family become prominent and easy to understand but it was imperative to understand the concept of Sufism. As such the second part of this chapter was written in which inspiration was taken from the views of great personalities like Hazarat Junaid Baghdadi 298 A-D to Ibn-e-Attar (309 H) and Hazarat Maroof Karkhi (200 AD). In addition concept of Wahdat-ul-Shahood and Wahdat-ul-Wajood has also been brought under discussion precisely because without this back ground the concept of Sufism could not be understood. For this reason the "Khandaan-e-Nakhshbandi ki umli khidmat" (The practical services of nakhshbandi order) by Dr. Aftab Ahmed Khan and "Kashf-ul-Mahjoob" by Hazarat Data Ganj Baksh referred. At the end of this discussion the inter relation of Pagarah and Nakhshabndi dynasty has been mentioned to know the thought of these saints about the Sufism and by its detail we come to know that at 23rd stage they join with Hazarat Muhammad Mustafa (SAW). Hazarat Saeed Muhammad Rashid Rooza Dhani who was the father of Pir Subghatullah Shah the first (First Pagarah). In addition Pir Rashid hailed in to the doctorine of Qadria. It follows that son took "Bait" (Initiation) from one's father in Sufism.

(CHAPTER FOUR)

The first part contains "Coming of fore fathers of Pagarah dynasty in Sindh" for which I have consulted the books "Qadeem Sindh" and "Tauhfat-ul-Alkaram". According to these books very first syed came to Sindh was Syed Ali Makki who came from makkah. There are lot of stories related to his arrival and It is concluded by reading all stories that Syed Ali Makki came to this region in the Abbasi regime. Dr.Aijaz-ul-Haq Qadoosi arrives at the same conclusion in his book. Anyhow this issue has been dealt at length in the thesis and his date of death has been mentioned.

The discussion of the introduction completes till page 20 of the thesis. From here on the biography of the saints starts along with their thoughts and concepts. This succession starts from Hazarat Muhammad Baqa Shah Shaheed (1198 H). He hailed the nakhshabandi doctorine on the hand of Hazarat Muhammad Makhdoom Ismail (1147 Hijra). There are lots of contradiction with respect his religious services. By travelling he spread the teachings of Islam to far off places. He used to record the saying of Pir Sahib and his forefathers and conveyed the same to the people. In this way , wherever he went he took with him lot of books. A man killed him during his journey. It so happened that man thought that the bundle of the books was something precious and so he killed him. Details about him have been discovered. In a book " Tazkara-e-Mashahir-e-Sindh" by Din Muhammad Watai. We have consulted the same and referred it in this thesis. The exemplary teachings in admirable manners are reflected in personality of his son, Pir Syed rashid Rooz-e-Dhani who was very famous in Sindh and is the crown of Pagarah Dynasty.

Pir Muhammad Rashid (1233 Hijra) was the prominent saintly person who was put up the qualities of nobility and religious devotion since his child hood. He spent his life in religious services in such a way that many people accepted Islam, because of his enlightened attitude. He wrote many books which have been translated in many languages so far. There were no publication facilitation in those days and the only way to convey the massage to the people was calligraphy. Many copies of his work were calligraphed and sent to many far off places. His writings included "Sharah Isma-ul-Hasna" "Jamia Al-Hawamay" and "Muktib-o-malfuzaat". These written contributions of his, have also been discussed in this thesis. His work was compiled by Muhammad Hussain Mahsar and became popular by the

name "Malfoozat-e-Sageer". Another book "Makhzan-e-Faizan"is also the compilation of his contribution and was written by his caliph Faqeer Mahmood Nizamani which is more popular and important. I have given the selection of his writings, in the light of which his teachings and religious services become prominent and focused.

Syed Pir Sabghatullah Shah the first (The First Pagarah) (1246 H) was the son of Pir Rashid Rooz-e-Dhani and was also the crown prince.

At that time this family splited into two groups due to matter of crown princeship between Syed Saghatullah Shah and his elder brother Pir Syed Muhammad Yaseen Shah and the dispute was carried to the court of justice and the decision was given in favour of Pir Sabghatullah. As a result of which Yaseen Shah got separated by taking a flag of his father as a token of remembrance and went to district larkana and the generation which succeeded from him is famous by name " Jhanday Walay" (flagmen) who were latterly called "Rashidi" as well. So the people of Pagarah dynasty is also known as "Rashidi".

Pir Sabghatullah Shah founded a party by the name "Hur" and employed "Jehad"(The Holy War) against Sikhs and britishes. Syed Ahmed Shaheed Stayed with him and sent many Hur Mujahideens (Soldiers) to BalaKot. The highest service to Islam he rendered through "Jehad" Surah Al Bakra verse 154 quotes "Surah Al Bakra verse 154:- **"And do not speak those who are slain in the way of Allah as dead. Nay, they are but alive, only thou can not percive it. (2:154)"**. His life deserves to be studied particularly the way he brought up his followers and created among them the religious zeal. With reference to "Khazeena-e-Marfat" the topics discussed are: (1) Significance of the mention of La-Ila Allah (2) Practice of valuable deeds (3) seeking of knowledge (4) commandments of God (5) Obedience of the commandments of God (6) prayer (7) fasting etc, which are remarkable. I have tried to elaborate his theories and passion for Jehad in the light of holy Quran. Pir Gohar Shah (the First) was second Pagarah who got constructed the new shrine of his grand father and also got madrasas (a Religious School) constructed. He was also a revolutionary poet and wrote meditationary poetry in Sindhi, Persian and Saraiki. His poetic name was "Asghar". He flourished the teaching of his forefathers and published. His teachings (1) Love toward Islam. (2) Obedience to the commandment of the God and condemning to accept the non Islamic rule and teaching of Quran in mosque and madrasas(Religious Schools) are remarkable. His quotations

were compiled by professor Shaikh Muhammad Fazil. Hence, this thesis contains his popular teachings and inspired thoughts as well.

Pir Hisbullilah Shah (1308 H) was the third Pir Pagarah and Akhund Mian Muhammad bux has a lot to do with his spiritual education and brought up. Mr Akhund belonged to Larkana. He also founded "Hur" party but he had a very compromising attitude. Yet he was a great scholar. He wrote poetry and "Maskeen" was his poetic name. He delivered many sermons in the mosques and also gave illuminating lectures on the significance of Islam. He played an important role in the moral education of his followers. He used to set responsibilities over his intellectual followers to teach the Islamic teaching and Quran. His book has been published by the name "Dewan-e-Maskeen". A detailed review is presented of his Persian poetry and Islamic services in this thesis. In addition a selection from his work has been given at the end along with description of the translation of Holy Quran which he got published.

Syed Ali Gohar Shah Sani (The Second) (1314 Hijra) was very much sick since his childhood so he used to be carried to far off places on a special carriage. That's why he is also known as "Mahfa Dhani" which meant carriage man. He was enthroned in 1890 and in his reign "Hurs" fought a very disciplined war against the britishes, but because of his continues illness, his services seemed very limited. Syed Ali Gohar Shah the Second had no child so he made his third brother as his successor. At that time his elder brother Pir Ali Muzaffar Shah Claimed the enthronment and the matter was carried to the court of justice. I have described this event with all the references in the thesis along with two points at the end which makes his services remarkable.

Syed Mardan Shah the first (1340 Hijra) was the fifth Pagarah and hailed Syed Muhammad Gilani to his thoughts and teachings and Mr.Gilani (late) played a vital role in his spritual brought up. His services include the celebration of Miraj-ul-Nabi on Rajab 27th in benefiting manner and this tradition continues till date. He enlarged the madrsas joined up with mosques and took special interests in the religious teaching in these madrasas for which he invited many religious scholars and started the series of their sermons in these madrasas.

Even for the Quranic teaching he used to invite many great religious scholars and arranged feasts for the poor which is mirror showing clear picture of his nobility and generosity.

Pir Sabghatullah Shah the second was the sixth Pagarah (1943 A-D) and spent a very courageous and brave life. Britishers caught him in there conspiracy. He got arrested for the first time in 1930 and his case was procecuted by Quaid-e-Azam Mohammad Ali Jinnah. He read the books of Syed Muhammad Rashid Rooz-e-Dhani in Ratnagiri Jail, due to which a great and unique change occurred in his life. After being released from the Jail he reconsolidated the "Hur" party and became a big power. At once stage some friends suggested him to develop such an attitude with Britishers so that they may become soft hearted. But he said " According to our religion bribery is prohibited. In his reign even Hurs were badly victimized to cruelty. When he was caught by second time. So that biritishers kept a condition for his releasing this time that he should apologize for conducting Jehad (The holy war) against them but he said "Shahdat is our crown and donning it is matter of great privilege for us" he was full of the courage of Jehad. The holy Quran in surah Tauba says "fight against those who do not accept Allah and the day of Judgment, things which are forbidden and do not abide the true religion of Allah and his prophet (SAW)." The life of Pir sahab is a true picture of all such commandments of Holy Quran. He was hanged in 1943 at Hyderabad Jail and the enthronement was held banned. His religious teachings include (1) Jehad (The formost). (2) storage of old books. (3) setting his followers to lead a contended life according to the teachings of religion. (4) bringing about changes in the people of his area with his attitude. (5) appointment of specific people for the teaching of religious studies and Holy Quran with the explanation. His revolutionary theories have been discussed briefly. After this the life and services Pir Sikander Ali Shah (present Pir Pagarah) have also been discussed.

At the end of the thesis we have attempted an appendix for various aspects of Pagarah dynasty as well as it's branch which is known as "Rashdia" and mentioned names of many literal and enlightened people who had passed away through the dynasty. For instance, Pir Mazhar-ud-Din Rahdi, Pir Shahab-ud-Din Rashdi, Haji Imam-ud-Din Rashdi, Pir Muhammad Ali Rashidi and Pir Hassam-ud-Din Rashidi etc. I have mentioned on research data famous elderly nobles without which this thesis would have definitely be incomplete.

RESEARCH METHODOLOGY

(1) At the time I registered for this topic as Ph.D candidate, Professor Dr. Abdul Fatah Saghiruddin Siddiqui was my supervisor who taught me the techniques of research and was very helpful in my intial work but unfortunately he passed away in 1996 due to which my work stopped and I was disheartend to proceed further with this topic. But immediately my benefactor Professor Dr. Ghulam Mustafa Khan came to my rescue and directed me to carry on the research on this topic for which he also kindly agreed to be my supervisor. Hence, in his supervision the research was restarted and he all most got all the work completed very carefully exactly on most scientific methodology of research. All the discussion bear the valid references which are compiled methodically at the end of each topic.

(2) For the collecting of data material regarding Pir Pagarah dynasty and history I have been to new Saeedabad along with my husband many times. Once we stayed there for the whole week. I noted all the necessary requisite information from the libraries there. Some of the books were even issued to me "Jamia Sikanderia" pir Jo Goth was very helpful in this regard I also sketched the shrines for all the elders but, those pictures are not included in the thesis.

(3) I have been to the libraries of Hyderabad and intetrior Sindh for more then once.

(4) In order to conclude the results as per Dr. Mustafa khan all the verdicts were quoted which were related to the topic.

(5) At certain places we have benefited from external material and data and the thesis enriched when ever it was possible, we were enriched from maniscripts and rare data. For instance, collection of poetry of Pir Subghatullah Shah the Second.

(6) Religious services are focused in points at various places, we have compiled of reign of each one in detail, without leaving any thing important. This methodology of research could be ranked on the pattern of Hafiz Muhammad Shahani, Syed Salman Nadvi and Dr. Ghulam Mustafa Khan. Hence, it is named as "**MINHAJ-E-TAHKEEQ**" (Apex of research).